عشقِ آوارہ مزاج



سعدیہ امل کاشف

پیش لفظ

کہانیاں لکھنے کا آغاز تب ہوا جب کہانیاں بننی شروع ہوئیں۔ اور سب سے بڑا کہانی کار تو رب العالمین ہے...... جس نے اپنے ماہر قلم سے ہماری کہانیاں تحریر کیں...... کچھ آنسو، کچھ خوشیاں اور کچھ محبتیں ہماری تقدیر میں لکھیں...... اور اسی طرح معاشرے کے اور ہر دور کے حساس افراد نے اپنے اردگرد بکھری کہانیوں کو قلم کی گرفت میں لینے کا آغاز کیا۔

مجھے سکول میں کوئی مضمون لکھنے کو دیا جاتا تو میں دو اوراق کی جگہ دس لکھتی۔ کیونکہ کسی بھی موضوع کو دو اوراق میں بیان کرنا میرے لئے بے حد مشکل ہوتا۔ اور چلتے چلتے وہ عمر آ پہنچی کہ جب میں نے کہانیاں پڑھنی شروع کیں۔ کالج کے کاریڈور میں، لائبریری میں، کلاس روم میں، گھر میں کبھی چھپا کے، کبھی سر عام کہانیاں پڑھیں لیکن بہت کم کسی سے متاثر ہوئی۔ کیونکہ مجھے تمام کہانیاں یکسانیت کا شکار نظر آتی تھیں۔ بے وجہ کے ایشوز، کزنز کی نزدیکی، زندگی کی خوشنمائی، چہروں کی خوبصورتی وغیرہ وغیرہ......!

میرے ذہن میں کئی سوالات اُبھرتے...... زندگی جب صرف خوبصورتیوں سے مزین نہیں ہے تو رائٹرز کیوں ایسا لکھتی ہیں؟...... کوئی کیوں نہیں جرأت کرتا بدصورتی کو، اذیت کو، تکلیف کو لکھنے کی؟...... طنز، طعنے، اپنوں کے منفی رویے، حسد، بغض، تہمتیں اور روحانی صعوبتیں......!

کوئی کیوں نہیں لکھتا اس لڑکی کی کہانی جو بے بسی کی انتہا پر ہوتی ہے۔ الزاموں، تہمتوں کے طوفانوں میں گھری، اور تمام رشتے اس سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ چچا، ماموں، ماں، باپ کس طرح روحانی اذیت دیتے ہیں اور دنیا کے طوفانوں کے آگے تنہا چھوڑ دیتے ہیں......!

کوئی کیوں نہیں لکھتا اس تنہا لڑکی کی کہانی جو ہنستی بھی تنہا ہے، روتی بھی تنہا ہے...... جس کی کامیابی پہ تالیاں بجانے والے لاکھوں ہاتھ ہوتے ہیں لیکن اس کے آنسو پونچھنے والی ایک انگلی بھی نہیں ہوتی......!

میری ابتدائی کہانیوں نے قارئین کے ایک گروہ کے دل کو چھوا اور ایک گروہ نے مجھے تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ سعدیہ رونے دھونے والی، خودکشیاں کرنے والی اور بدصورت لڑکیوں کی محرومیوں کی داستانیں لکھتی ہے...... آج میں یہ سوال کرتی ہوں کہ کیا بدصورت لوگوں کی کہانیاں نہیں ہوتیں؟...... کیا محرومیوں میں گھرے، ہارے ہوئے، لٹے پٹے انسانوں پہ لکھنا جرم ہے؟...... اور کیا فقط انتہائی معصوم چہرے والی، بے حد، بے انتہا خوبصورت لڑکی کی کہانی لکھنا ہی درست ہے؟...... میں نے سچ لکھا تو کیا غلط کیا؟

میں نے ایک لڑکی کے اغواء کی کہانی اور بعد کے اپنوں کے رویے لکھے تو کہاں غلط لکھا؟

میں نے معاشرے کی سفاکیوں پر سے پردہ اُٹھایا تو کیا غلط کیا؟

زندگی فقط محبت اور اچھائیوں سے مزین Sugar coated bunty نہیں۔ زندگی کے سفاک پہلو ابھی بھی ہمارے منتظر ہیں۔

میں اندر سے بہت کنزرویٹو، بہت بوڑھی، قدامت پرست اور Orthodox قسم کی لڑکی ہوں...... میرے لئے بدصورت، چھوٹی اور کمتر چیز میں بھی کشش ہوتی ہے۔ میں بلا کی اذیت پسند ہوں۔ عزتِ نفس اور سچائی کی خاطر قریبی سے قریبی انسان سے بھی دُوری برت سکتی ہوں۔ میں نے تحریری سفر میں بہت کٹھنائیاں دیکھی ہیں...... ہر راہ سے کانٹے چنے ہیں...... ہر آنکھ میں شکوہ دیکھا ہے...... لیکن پھر بھی اپنے ہاتھوں میں، اپنی اُنگلیوں میں، اپنی رُوح میں اور اپنی سوچ میں، میں نے ایک اَن دیکھی مضبوط طاقت کو ہمیشہ پایا ہے۔ میرے لفظوں میں میری روح رچی بسی ہوتی ہے اور میرا آوارہ مزاج عشق میرے اوپر حاوی ہوتا ہے...... میں نے اپنے کام سے عشق کیا ہے...... اور یہ واحد عشق ہے، جس نے میرے ساتھ وفا کی ہے......!

''عشق آوارہ مزاج'' میری اب تک لکھی تمام کہانیوں میں زیادہ چہیتی، زیادہ پسندیدہ کہانی ہے۔ اس ناول سے مجھے بے انتہا محبت ہے...... اس کے کردار میرے لئے زندہ کردار ہیں اور اس کا نام میری تمام کہانیوں میں مجھے محبوب ہے۔

اس ناول کے علاوہ کچھ اور کہانیاں آپ کے ہاتھوں میں ہیں.......مجموعی طور پر یہ میری چوتھی اور ناول کی تیسری کتاب ہے۔ یہ تمام کہانیاں آپ نے پڑھیں، سراہیں اور مجھے ہمت دی کہ میں ان کو کتابی شکل دے سکوں۔

''آنچل'' کے مشتاق احمد قریشی، مدیرہ فرحت آراء، محمد علی قریشی سمیت میں ان تمام لوگوں اور قارئین کی مشکور ہوں جنہوں نے توجہ اور عزت سے نوازا۔

سفر جاری ہے.......سفر جاری رہے گا.......اس سفر کی کوئی منزل نہیں!.......کہانی سانس لیتی رہے گی.......کہانی قلم سے اُترتی رہے گی.......اور جب تک سانس ہے، کہانی اسی روانی اور روایت سے جنم پاتی رہے گی۔ بقول شاعر

کہانی سانس لیتی ہے.......
کہانی قطرہ قطرہ زندگی سے آس لیتی ہے
کبھی یادوں کی چنریا میں ستارے ٹانک دیتی ہے
کبھی لمحوں میں صدیوں کی دیواریں پھاند لیتی ہے
کہانی سانس لیتی ہے.......!
کہانی سانس لیتی ہے.......!

سعدیہ امل

ملتان

فہرست

عشق آوارہ مزاج ———— 11

تم میری آخری محبت ہو ———— 81

دھوپ کا رنگ گلابی ———— 138

ہجر کی راکھ اور وصال کے پھول ———— 188

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں سمانے لگے ———— 286

خنک سی شام اس ویران سے گھر کے کواڑوں میں آہستہ آہستہ اُتر رہی تھی۔ آسمان کئی رنگوں میں اپنا آپ ڈھالے بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ کبھی ملگجا تو کبھی کاسنی اور کبھی سرمئی رنگ اوڑھتا آکاش کتنا گہرا، کتنا وسیع تھا۔ اس اداس سے کمرے کی دل چیر دینے والی تنہائی کے بیچ مغنیہ کی آواز اُبھری۔

کبھی ہم خوب صورت تھے
کتابوں میں بسی خوشبو کی مانند سانس ساکن تھی
بہت سے ان کہے لفظوں سے تصویریں بناتے تھے
پرندوں کے پروں پر نظم لکھ کر
دور کی جھیلوں میں بسنے والے لوگوں کو سناتے تھے
جو ہم سے دور تھے لیکن ہمارے پاس رہتے تھے

مشال نے اپنی پشت راکنگ چیئر سے نکالی اور نم آنکھوں کو پل بھر کے لئے بند کرلیا۔

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو کہ ہم کو تتلیوں کے، جگنوؤں کے دیس جانا ہے
ہمیں رنگوں کے جگنو، روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
نئے دن کی مسافت، رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ
کھڑکی سے بلاتی ہے
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو......
کہ ہم کو تتلیوں کے، جگنوؤں کے دیس جانا ہے

اس نے اپنی آنکھیں کھولیں، اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ یقیناً وہ یادوں کے کسی

جھرمٹ سے بھاگی تھی۔ موندی ہوئی آنکھوں سے اس کا لاشعور مغنیہ کی آواز کے ساتھ ماضی کے کتنے ہی کھنڈر چھان آیا تھا۔ اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو شعور نے اسے وہی منظر دکھایا، جس کی وہ نفی کرنا چاہتی تھی۔ وہی کمرہ، وہی ویرانی اور وہی خاموش، بے جان تصویریں۔ اس کا دل اس سب سے دور بھاگ جانے کو چاہا۔ ہر چیز سے چھپ جانے کو چاہا۔ وہ اُٹھی، اس نے ٹیپ آف کیا، اپنی بیساکھیاں اُٹھائیں، گرم شال لپیٹی اور کمرے سے باہر آ گئی۔

"کہاں جا رہی ہو مشال بیٹی؟" عقب سے اسے فرزانہ بوا نے آواز دی۔

"بوریت ہو رہی تھی بوا! ذرا گھر کے باہر تھوڑی دیر ہو آتی ہوں۔" اس نے بنا پلٹے ہی جواب دیا۔

"لیکن ابھی تو رات ہونے والی ہے۔ اکیلی کہاں جاؤ گی؟ اچھا چلو، میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" بوا شاید اس کی طرف بڑھنے لگی تھیں۔

"نہیں بوا! میں زیادہ دور نہیں جاؤں گی۔ تھوڑی دیر تک آ جاتی ہوں۔" وہ یہ کہہ کے آگے بڑھنے لگی۔

"اچھا، جلدی واپس آ جانا۔ کھانے سے پہلے آ جانا...... ایک تو اس لڑکی کو کسی چیز سے خوف بھی نہیں آتا۔ پہاڑی علاقے میں مغرب سے پہلے لوگ گھروں میں دبک کے بیٹھ جاتے ہیں، اندھیروں سے، سردی سے گھبراتے ہیں اور یہ محترمہ کسی بھی وقت، کچھ بھی کر لیتی ہے۔" وہ سیڑھیاں آہستہ آہستہ اُتر رہی تھی اور عقب سے فرزانہ بوا کی خفگی سے بھری آواز بھی اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ لیکن وہ اس کی پروا کئے بغیر گھر سے چلی آئی اور آہستہ آہستہ اپنی بیساکھیوں کی مدد سے آگے ہی آگے جانے لگی۔

ان کا وہ چھوٹا سا گھر مال روڈ کے بالکل نزدیک تھا۔ مری وہ تقریباً چار برس پہلے ہی آئی تھی، لیکن اسے لگتا تھا کہ اسے اس طرح یہاں رہتے ہوئے دو سو سال بیت گئے ہوں۔ تنہا، اُداس، ویران۔ وہ ایسی تو نہ تھی۔ لیکن زندگی میں ہونے والے اس ایک حادثے یا چند حادثات نے اسے بہت ویران، بہت تنہا، بہت اُداس کر دیا تھا۔ وہ، جو ہر وقت، ہر جگہ قہقہوں کی پھوار میں بھیگتی رہتی تھی، خوابوں کے پیرہن، چاہتوں کے جگنو، سپنوں کی تتلیاں اس کے ہمراہ ہوتی تھیں، وہی مشال احمد کتنی تنہا، کتنی اکیلی ہو گئی تھی۔ کیا لوگوں کے ساتھ ساتھ وہ جگنو، وہ خواب، وہ تتلیاں بھی دور کی جھیلوں میں اُڑ گئے تھے؟ لیکن کیا اس کے پاس کوئی ایسا پرندہ نہ تھا کہ جس کے پروں پر سندیسے لکھ کر وہ ان دور بسنے والے لوگوں

کو آواز دے سکے، انہیں اپنے پاس بلا سکے۔

وہ چلتے چلتے مال روڈ پر پہنچ چکی تھی، جہاں جگہ جگہ بنی دُکانیں اور ٹک شاپ، ہوٹل اور ریسٹورنٹ اس خاموش سی وادی میں جگمگاہٹ کا باعث بنے ہوئے تھے۔ گرمیوں میں تو مال روڈ کی یہ سڑکیں ٹورسٹس اور دُور دُور سے اُڑ کے آنے والے پنچھیوں سے بھری رہتی تھیں لیکن سردیوں میں یا تو یہاں کے مقامی لوگ ہوتے تھے یا کوئی اِکا دُکا ٹورسٹ اور ہنی مون کے لئے آئے ہوئے کپل ہوتے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی اس پیراڈائز ونڈ نامی ریسٹورنٹ کی بالکنی میں آ بیٹھی۔ وہ اکثر یہاں آتی تھی، اس لئے وہ یہاں کے لوگوں کے لئے انجان نہ تھی۔ کافی کا آرڈر دے کر اس نے کرسی کے پیچھے بالکنی کے سہارے اپنی بیساکھیاں رکھیں اور سامنے خنک فضا اور پرستان سے اُتری ہوئی دُھند میں لپٹے پہاڑوں کو دیکھنے لگی جو رات کی سیاہی میں کالی چادر اوڑھے ہوئے تھے اور انہی پہاڑوں پر بنے گھروں کی بتیاں اس کالی چادر میں ہیرے موتیوں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

کافی کے گرما گرم چسکے لیتے ہوئے، کافی کے مگ سے اُڑتا ہوا دھواں اسے ماضی کے دھندلکوں میں ساتھ لئے جا رہا تھا کہ جب وہ بہت سے ان کہے لفظوں سے تصویریں بناتی تھی۔ کہ جب، وہ خوب صورت تھی!



اس با اعتماد، پُر جوش اور خوب صورت لڑکی نے جب مقامی کالج سے اے لیول کر لیا اور کراچی یونیورسٹی کی فریش نیو کمر کے طور پر یونیورسٹی میں داخل ہوئی تو سب کچھ کتنا اچھا تھا۔ کتنا رنگین، کتنا چنچل، کتنا خواب ناک، ہر طرف جواں، پُر جوش آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں کے دریچوں میں سجے کتنے ہی قد آور خواب تھے۔ ہر کوئی زندگی کی اُلجھنوں سے کوسوں دُور اپنی زندگی کو انجوائے کرنے میں مگن تھا۔ ہر کوئی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے لڑکپن کو انجوائے کرنے میں مشغول تھا۔ یونیورسٹی کے ہر ڈیپارٹمنٹ کے، ہر کونے کے باہر اسٹوڈنٹس کے گروپ فرش پر، سیڑھیوں پر آلتی پالتی مارے خوش گپیوں میں مگن تھے۔ ان کے ہونٹوں سے چھلکتی مسکراہٹوں اور آنکھوں میں سے چھلکتی بے پروائیوں سے یوں لگتا تھا کہ جیسے ان کو اپنے مستقبل کی کوئی فکر ہی نہ ہو، کوئی پروا ہی نہ ہو۔

وہ اعتماد کی چال چلتی ہوئی آگے ہی آگے بڑھ رہی تھی۔ اسے یقیناً علم نہ تھا کہ ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ کس طرف ہوگا اور اس لئے اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کسی اسٹوڈنٹ سے

پوچھے گی۔ وہ ہر طرف نگاہ دوڑا رہی تھی کہ کس سے پوچھے۔ آخر کار ایک کونے میں کاریڈور کے باہر بیٹھے چند لڑکے لڑکیوں کے ایک گروپ پر اس کی نظر پڑی۔ وہ اسی اعتماد سے چلتی ان کے پاس آئی، جو آپس میں کسی بات پر لڑ رہے تھے۔

''شاہ زیب! پلیز یار! انہی سے رقم پوری کر لیتا ناں۔'' ایک لڑکے نے کہا۔

''ایسے کیسے پوری کر لوں؟ اٹھنی، چونی کم ہوتی تو پوری کر لیتا۔ پورے پچاس روپے کم ہیں۔ چلو، لڑکیوں کی جیب ہی ڈھیلی کرو۔'' شاہ زیب اپنے ہاتھوں میں تھامے نوٹ لہرانے لگا۔

''یہ جو پہلے پیسے اکٹھے کئے ہیں، یہ کس کی جیب سے نکلے ہیں؟ کنجوسو!'' ایک لڑکی نے نقطہ اعتراض اُٹھایا۔

''کیا یار! صرف پچاس روپے کے لئے تم لوگ اتنی اچھی ٹریٹ مس کر دینا چاہتی ہو؟ عورت کا دل تو بڑا فراخ ہوتا ہے۔'' ایک اور لڑکے نے کہا۔

''اور لڑکوں کے ہاتھ۔'' لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

مشال ان کی باتوں سے لطف اندوز ہو کر مسکرا رہی تھی کہ جب شاہ زیب کی نظر اس پر پڑی۔

''یس، ہُو آر یُو؟'' یکایک سبھی اس انجان چہرے کی جانب متوجہ ہوئے۔

''سوری! میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ اصل میں مجھے ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں پوچھنا تھا۔'' مشال مسکرا کے بولی۔

''ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ..... کیا آپ فریش اسٹوڈنٹ ہیں؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔

''جی ہاں۔'' وہ مسکرا دی۔

''آج آپ کا پہلا دن ہے؟'' ایک اور سوال اُٹھا۔

''بی ایس سی آنرز کریں گی؟''

وہ مسلسل گردن اثبات میں ہلائے گئی۔

''آپ جانتی ہیں فریش اسٹوڈنٹ کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟'' اس سوال پر وہ خاموش ہو گئی تھی۔

''نہیں۔ یار سعد! انہیں ذرا بتانا کہ کیا ہوتا ہے؟'' اب شاید سعد نامی لڑکا اُٹھا اور مشال سے مخاطب ہوا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

''مشال احمد خان۔'' وہ بولی۔

''ہاں تو مس مشال احمد خان! یہ اس یونیورسٹی کا رُول ہے کہ فریش اسٹوڈنٹ کے ساتھ فولنگ ہوتی ہے۔ یُو نو، فولنگ جس کو ریگنگ اور بلنگ بھی کہتے ہیں، جانتی ہیں آپ؟'' سعد بہت طنز سے بولا۔

''چھوڑو سعد! سہم گئی ہے بے چاری۔'' ایک خوب صورت سی لڑکی نے مسکرا کے کہا۔

''گھبرائیں مت، ہم آپ کو کوئی سزا نہیں دیں گے۔ نہ ہی کوئی اُلٹا سیدھا راستہ بتائیں گے۔ بس ہمارے اسٹاک میں پچاس روپے کی کمی ہے، وہی پوری کرنی ہے اور وہ جو سامنے کینٹین ہے نا، وہیں پہ جا کے یہ چیزیں لے آئیں جو اس لسٹ میں لکھی ہیں۔ پھر آپ آئیں گی تو ہم آپ کو ضرور بتائیں گے کہ ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ کہاں ہے۔'' شاہ زیب نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ وہ یقیناً سہم گئی تھی اور خاموش بھی تھی۔

''دیکھیں، صرف کسی ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں بتانے کے لئے آپ نے میرے لئے سزا تجویز کر دی۔'' وہ اپنے حواس سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

''سزا۔'' شاہ زیب اور سعد کے ہمراہ سبھی مسکرا دیئے۔

کرن! ندا! کجل! ذرا ان کو بتانا کہ سزا کیا ہوتی ہے۔ مس مشال احمد خان! ہم نے آپ کو ابھی سزا دی ہی کہاں ہے۔ ہم تو آپ سے صرف مدد مانگ رہے ہیں۔ یو نو، مالی مدد۔ ہم سارے کے سارے غریب عوام ہیں۔ آپ اگر تھوڑا سا فنڈ دے دیں گی تو آپ کا کیا جائے گا۔ ویسے بھی ہم جیسے معصوم سینئرز آپ کو کہیں نہیں ملیں گے۔ چلیں میرے ساتھ۔'' اسے مجبوراً ہی شاہ زیب کے ہمراہ آنا پڑا اور اس نے کینٹین سے لسٹ میں لکھی تمام چیزیں خریدیں اور پیسے شاہ زیب سے لے کر اس میں پچاس روپے مزید ملا کے کینٹین والے کو دیئے اور وہ چیزیں شاہ زیب کو اُٹھوا کے وہ واپس آئی، جہاں پر سبھی بیٹھے تھے۔

شاہ زیب ہر کسی کو، کوکا کولا دے رہا تھا اور باقی چیزیں سرو کر رہا تھا اور وہ بدھو بنی ہر کسی کو دیکھ رہی تھی۔

''تھینک یو مس مشال احمد! اب آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آپ اس وقت جہاں کھڑی ہیں، وہ ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ ہی ہے۔'' شاہ زیب منہ میں برگر ٹھونستے ہوئے بولا۔ اس بات پر اسے سخت قسم کا تاؤ آیا کہ ان ساروں نے اسے کس طرح پریشان کیا۔ وہ مڑی اور جانے لگی۔

''ہائے سنیں۔'' اسے عقب سے کسی نے آواز دی۔ وہ مجبوراً پلٹی۔

کوئی لڑکا کھڑا اس کی جانب مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی براؤن آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش تھی۔

"اب جب کہ آپ ہمارے ڈیپارٹمنٹ اور ہماری کلاس میں آ ہی چکی ہیں تو آپ ہمارے ساتھ بیٹھ کر لنچ ہی کر لیں۔" اس لڑکے کی اس پیشکش پر اسے غصہ آیا۔

"یعنی آپ لوگ میرے سینئر نہیں ہیں۔" وہ بولی۔

"صرف ایک مہینہ ہی سینئر ہیں۔ آپ کا ایڈمیشن غالباً لیٹ ہوا ہے۔ ہمارا بھی بی ایس سی آنرز کا فرسٹ ایئر ہی ہے۔ آیئے، آیئے! ہمیں جوائن کیجئے۔" اس لڑکے کے ہونٹوں پر منجمد مسکراہٹ سے اسے مزید شرمندگی ہوئی۔ وہ جانے کے لئے پلٹی اور قدم بڑھائے۔ تبھی تو لڑکیاں اُنہی میں سے اُٹھیں اور اس کی جانب آئیں۔

"سنو مثال! میرا نام ندا خاور ہے، اور میں کویتا بنرجی ہوں۔ تم ہمارے گروپ کو جوائن کر لو ناں۔"

ندا اور کویتا اسے زبردستی اپنے گروپ کے پاس لے آئیں۔

"چلو میں سب کا تعارف کراتی ہوں۔ یہ ہیں سعد حسن، انٹیریئر سندھ میں بگڑ بگڑ کے اب کراچی کو بگاڑنے آئے ہیں۔" ندا نے شروعات کی۔

"مابدولت شاہ زیب علوی کہلاتے ہیں۔ اس گروپ کے سب ضروری کام ہم ہی کرتے ہیں۔ جیسے کہ چندہ اکٹھا کرنا، کھلانا پلانا اور ہاں، فریشرز کی فولنگ کرنا۔" شاہ زیب بولا۔

"میں تجل ندیم ہوں۔ میں ایگریکلچرل کی نہیں، اکنامکس کی اسٹوڈنٹ ہوں اور میں واقعی تم سب کی سینئر ہوں۔ ماسٹرز کر رہی ہوں۔" دراز زلفوں اور حسین مسکراہٹ والی تجل اپنے مخصوص انداز میں مسکرائی۔

"یہ ہیں سیدہ کرن شاہ اور یہ ہیں سیّد سمعان شاہ۔ یہ دونوں آپس میں چچازاد کزن ہیں اور دونوں یونیورسٹی ہاسٹل میں رہائش پذیر ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کرن لڑکیوں کے ہاسٹل میں ہوتی ہیں اور سمعان لڑکوں کے۔" کویتا نے نیچے بیٹھی کرن اور سمعان کا تعارف کرایا۔ سمعان وہی تھا، جس نے اسے اپنا گروپ جوائن کرنے کی آفر پہلے کی تھی اور کرن شاہ بلیک کلر کے اسکارف اور عبا میں لپٹی قدرے مغرور آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کا دودھیا چہرہ اور شفاف رنگت اسکارف کے اندر سے روشنی چھوڑتے محسوس ہو رہے تھے۔

اس نے سب کے بے حد اصرار پر گروپ میں شامل ہونے کی ہامی بھر لی اور وہیں ان کے ساتھ بیٹھ کر اپنا تعارف کروانے لگی۔

"میں مثال ہوں۔ اسلام آباد میں میری اسکولنگ ہوئی۔ اے لیول کر لینے کے بعد میں نے مزید کچھ کرنا چاہا۔ کافی یونیورسٹیز میں اپلائی کیا مگر میرا دل کراچی آنے کو چاہا۔ سو میں آ گئی۔ ہاسٹل میں ہی شفٹ ہوئی ہوں میں۔"

"شاہ زیب! ندا! کویتا! یاد رکھو، مثال ہمارے گروپ میں شامل ہونے والی آخری لڑکی ہو گی۔" رُوٹھی رُوٹھی سی کرن شاہ بولی اور سبھی نے رضامندی ظاہر کی۔

وارڈن نے اسے کمرہ نمبر 148 میں پہنچا دیا اور پیچھے کوئی ملازمہ اس کا سامان بھی اسی کے ساتھ اٹھا کے آنے لگی۔ وہ ابھی کمرے کے اندر اپنا سامان رکھ ہی رہی تھی کہ سامنے سے کرن شاہ کو اندر آتے ہوئے دیکھا۔

"ہیلو کرن!" وہ مسکرا کے اس کی جانب آئی۔ جتنی اپنائیت بھری اس کی مسکراہٹ تھی، اتنا ہی رُوکھا پھیکا سا منہ کرن نے بنایا۔

"تو تم میری روم میٹ ہو۔ ویلکم۔" کرن قدرے بے رُخی سے بولی۔

"کتنا عجیب اتفاق ہے ناں۔ ویسے مجھے تو یہ حسین اتفاق لگا۔ اور کون کون ہیں ہاسٹل میں؟" مثال اپنا سامان رکھتے ہوئے بولی۔ وہ سنگل بیڈ کے اوپر بنے درازوں میں اپنی چیزیں رکھتی جا رہی تھی۔

"بہت ساری لڑکیاں ہیں۔ پہچان جاؤ گی آہستہ آہستہ۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟"

کرن نے اپنا اسکارف اور عبا اُتاری اور اپنے جاذب جسم کو آزاد کیا۔ پشت تک لہراتی اس کی سیاہ چوٹی، نازک سی کمر اور خوب صورت ڈیل ڈول۔ یقیناً اس کا وجود ایسا تھا کہ، جسے چھپا کے رکھا جا سکے۔

"تم بہت خوب صورت ہو کرن!" مثال آخر اپنے اندر کی بات زبان تک لے ہی آئی۔ کرن کے چہرے پر کوئی خاص رنگ نہ آیا۔ جیسے کہ یہ جملہ اس کے لئے معمولی ہی ہو۔ یا پھر جیسے کہ وہ بھی سننے کی توقع کئے بیٹھی ہو۔ وہ دھیمے سے مسکرا کے باتھ روم میں گھس گئی اور مثال اُس کی اس ادا پر حیران سی ہوئی۔

تبھی کمرے میں ندا نے انٹری دی اور دھڑام سے کرن کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ صبح ندا نے گلابی رنگ کا کُرتا اور بلیک ٹراؤزر پہنا تھا اور اب وہ ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور جینز میں ملبوس تھی۔

"مجھے جیسے ہی پتہ چلا کہ ہاسٹل میں کوئی نئی لڑکی آئی ہے، میں سمجھ گئی کہ وہ تم ہی ہو گی۔" ندا کھلکھلا کے بولی۔

"اچھا، یعنی میں یہ خوش فہمی پال لوں کہ تم لوگوں کو میرے یہاں آنے سے خوشی ہوئی ہے۔" مشال نے کہا۔

"آف کورس۔ مجھے تو بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں تو صبح ہی تم سے اتنی امپریس ہوئی تھی۔ ویسے تم سے کس نے کہا کہ ہمیں خوشی نہیں؟" ندا کے خوب صورت خال وخد کا زاویہ بدلا۔

"پتہ نہیں کیوں، مجھے کرن کے بی ہیوئر سے ایسا محسوس ہوا۔ ہوسکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو لیکن........" اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

"ارے یار! تم دل پہ نہ لینا۔ یہ جو اپنی کرن ہے نا، اس کے ساتھ ذرا سا مسئلہ ہے۔ وہ کیا ہے، اہلِ سادات میں پلی بڑھی ہے نا۔ سخت مزاج لے کے پیدا ہوئی ہے۔ جہاں مسکراہٹ سے کام چل جائے وہاں لفظ ضائع نہیں کرتی اور جہاں لفظ سے کام چل جائے وہاں جملہ نہیں ضائع کرتی بلکہ دل کی بہت اچھی ہے۔ اب اگر میری طرح منہ پھٹ ہوتی تو شاید اقرار کر لیتی کہ تم بہت اسپیشل لڑکی ہو۔ تمہاری ڈریسنگ، تمہاری پرسنیلٹی۔ سچ! مجھے تم سے تھوڑی سی جیلسی بھی ہوئی تھی صبح۔" ندا کی لمبی گفتگو پہ مشال دل کھول کے مسکرائی تھی۔

"تمہارے پیرنٹس کہاں ہوتے ہیں ندا؟"

"یہیں کراچی میں ہوتے ہیں۔" وہ بولی۔

"تو پھر تم یہاں ہاسٹل میں؟" مشال کو حیرت ہی تو ہوئی تھی۔

"پلیز، ہاں مشال! پیرنٹس کا ذکر کر کے بور مت کرو۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں بہت آزاد قسم کی لڑکی ہوں۔ پابندیوں سے بہت گھبراتی ہوں۔ اسی لئے ہاسٹل میں رہتی ہوں۔ عمر کو بھی میں نے کہا ہوا ہے کہ تم مجھ پر کبھی پابندیاں مت لگانا۔" ندا تیز رفتاری سے بولے گئی۔

"یہ عمر کون ہے؟" مشال کے ٹوکنے پر وہ کچھ خجل سی ہوئی۔

"عمر........ پہلے وعدہ کرو، کسی کو بتاؤ گی نہیں۔"

"دوست پہ اتنا بھی اعتبار نہیں۔" مشال نے اسے یقین دلایا۔

"عمر دوست ہے میرا یا پھر محبت........ نیٹ پہ ملاقات ہوئی تھی ہماری، چار سال پہلے۔ بہت اچھا ہے وہ۔" ندا یکلخت شرمائی، لجائی سی بننے لگی۔ مشال اس لڑکی کے مزاج کے ہر رنگ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ کبھی بہت بولڈ تو کبھی سراسر مشرقیت سموئے شرمیلی آنکھیں اور شرمایا لہجہ۔ وہ لڑکی اپنے آپ میں ایک پوری دنیا تھی۔

"ملی ہو اس سے؟ اپنے عمر سے؟" مشال نے چھیڑا۔

"لاہور میں ہوتا ہے وہ۔ کبھی کبھی آ جاتا ہے ملنے۔ زیادہ تر فون پر ہی ملتا ہے۔" وہی شرمایا، لجایا پن۔

تبھی کرن باتھ روم سے کپڑے چینج کر کے واپس آئی اور ان دونوں کو یوں آپس میں چپکے چپکے بات کرتے دیکھ کر حیران ہوئی۔ وہ دونوں اب معمول کی باتوں میں مصروف ہو چکی تھیں۔

کتنی جلدی وہ اس گروپ کی جان بن گئی تھی۔ ہر کوئی اسے سراہتا، ہر کسی سے اس کی اچھی ہائے ہیلو ہو گئی تھی۔ اور وہ تو تھی ہی ایسی۔ ہمیشہ سے پرفیکٹ۔ ہمیشہ سے اسپیشل۔ ان کا گروپ مشال کے بنا ادھورا ہی لگتا تھا۔ آج بھی کلاس میں کوئی نیا لڑکا آیا تھا اور سمعان ٹیچر بنا اس کی فولنگ میں مصروف تھا، جب کہ مشال سمیت کلاس کے سبھی لوگ اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"ہاں تو مسٹر چوہدری! آپ ملتان سے ہیں۔" سمعان اپنی آنکھوں پہ کسی دوسرے کلاس میٹ کا چشمہ چڑھائے زبردستی سنجیدہ ہونے کی اداکاری کر رہا تھا۔

"جی سر! ڈسٹرکٹ ملتان سے ہوں۔" وہ مؤدبانہ بولا۔

"پھر تو آپ سرائیکی بھی بول لیتے ہوں گے۔ اور چونکہ ملتان اور اس کے گرد و نواح میں زراعت اور کھیتی باڑی عام ہے تو آپ وہاں کی زمینوں اور کھیتوں میں موجود سنڈیوں اور کیڑوں کے بارے میں بھی کافی معلومات رکھتے ہوں گے۔" سمعان چشمہ درست کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں تو چوہدری صاحب! آپ سرائیکی میں صرف دس سنڈیوں کے نام گنگنا کے سنائیں۔" سمعان کی اس فرمائش پر سبھی کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

"شٹ اپ کلاس! آپ ایگریکلچر کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ آپ کو مختلف علاقوں کی سنڈیوں کے بارے معلومات ہونی چاہئیں۔" سمعان چلایا۔ سبھی کی ہنسی دبنے لگی۔

"بول ناں چوہدری سنڈا فاسٹ۔" کسی دل جلے نے پیچھے سے نعرہ لگایا۔

"سر! گنگنا کے بتانا ضروری ہے؟ میرا مطلب، میری آواز اچھی نہیں ہے سر!" وہ منمنایا۔

"تو اچھی ہو جائے گی بیٹا! یہاں پہ جو آتے ہیں، ان کی آواز رکشے کے بھونپو کی طرح ہوتی ہے لیکن ہم اسے کار کے ہارن میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ یقین نہیں آتا؟ شاہ زیب!

آپ کچھ گا کے سناؤ۔'' سمعان نے جیسے ہی شاہ زیب کو آرڈر کیا، شاہ زیب اپنی سیٹ پر کھڑا ہو گیا۔ نوٹس اٹھائے، ان کا رول بنا کے مائیک کی طرح سامنے رکھا اور گانے لگا۔

''امریکہ کے ناں جاپان کے
ہم تو ہیں دیوانے ملتان کے
پیارے پیارے ہونٹ سرائیکی بولیں
اور کرتے ہیں دل گھائل
سانولی سلونی سی محبوبہ
تیری چوڑیاں شوٹنگ کر کے''

وہ ہاتھ لہرانے لگا اور سبھی لوگ تالیاں بجانے لگے۔ کلاس کا ماحول یکسر بدل سا گیا۔

تبھی کلاس میں پروفیسر ملک نے انٹری دی۔ سمعان تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو کے اپنی سیٹ پر پہنچ چکا تھا اور اس کا چشمہ اپنے مالک تک۔ چوہدری بے چارہ بدھو بنا سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اسے سعد نے پکارا۔

''اوئے سنڈا فاسٹ! یہاں آ کے بیٹھ جا۔ کلاس شروع ہو گئی ہے۔'' اور ہکا بکا سا چوہدری، سعد کے برابر میں جا کے بیٹھ گیا۔

''بہت اچھی آواز ہے آپ کی شاہ زیب! اور سمعان شاہ! آپ کی اداکاری بھی۔'' پروفیسر ملک کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''کس کی شامت آئی تھی آج؟'' پروفیسر نے مزید استفسار کیا۔

''چوہدری سنڈا فاسٹ کی، جو ملتان ریٹرن ہیں۔'' کسی لڑکی نے وضاحت کی اور سبھی مسکرا دیئے۔ پھر چوہدری کا تفصیلی تعارف ہوا اور اسے سمجھایا گیا کہ یہ سب کیا تھا۔

کلاس ختم ہونے کے بعد اوول کی سیڑھیاں تھیں اور وہ سب تھے۔ ان کی شرارتیں اور مستیاں تھیں اور ان کی الہڑ عمریں تھیں۔

''یارو! میں ایک گرما گرم نیوز لے کر آیا ہوں۔'' شاہ زیب دور سے ہاتھ میں کوئی کاغذ لہراتا آیا۔

''کیوں، تیرا کیمسٹری کی نادرہ حسین سے افیئر ایکسپوز ہو گیا کیا؟'' سمعان نے اسے چھیڑا۔

''یا پھر وہ اپنا وائس چانسلر مر ور گیا ہے؟'' سعد نے بھی ٹکڑا لگایا۔

''دفع دُور۔ کبھی کوئی کری ایٹو کام نہ سوچنا۔ اگلے ماہ اپنی یونیورسٹی اسٹیج ڈرامہ کر رہی

ہے۔ جو مقابلہ جیتے گا، اس ٹیم کو پچاس ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔'' شاہ زیب نے خبر سنائی۔

''کیا، پچاس ہزار روپے؟'' سبھی ایک ساتھ بولے۔

''ہاں۔ ایک گروپ تو ایک پلے کے لئے سلیکٹ ہو گیا ہے، باقی دور رہتے ہیں۔ چلو ہم اپنے گروپ کا نام لکھوا کے آتے ہیں۔'' سمعان نے کاغذ لے لیا اور شاہ زیب بولا۔

''لیکن ہم میں سے ایکٹنگ کرے گا کون؟'' کرن نے نقطہ اعتراض اٹھایا۔

''اپنے تو سبھی اداکار ہیں۔ یہ سمعان، سعد، ندا، کویتا اور مشال۔'' سجل بولی۔

''نہ بابا! مجھے یہ اداکاری نہیں آتی۔'' مشال نے صاف انکار کیا۔

''اور مجھے تو اجازت ہی نہیں ملنی۔'' کرن بھی مکر گئی۔

''باقی لوگ میں کہیں سے پکڑ لوں گا۔ تم لوگ تو ہاں کرو۔'' شاہ زیب بولا۔

''میں تم لوگوں کے ڈائیلاگز لکھوں گی۔ مجھے کالج میں بیسٹ رائٹر کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔'' مشال نے مسکرا کے کہا۔

''پرفیکٹ۔ میں، شاہ زیب، سعد، کویتا، ندا، ہم اسٹیج پر ہوں گے اور آپ کرسیوں پر بیٹھ کے مزے سے دیکھیں گی۔ نہ یار! بے شک، مشال ڈائیلاگ لکھے لیکن وہ اسٹیج پہ بھی ہو گی۔'' سمعان نے ضد کی۔

''اور میں کیا کروں گی؟'' کرن نے منہ بسورا۔

''تم ہمارے ڈرامے کی فوٹو گرافی کرنا۔'' سمعان نے فوراً کہا۔ جس پہ کرن مزید بگڑ گئی اور اپنی کتابیں اور عبا سنبھالتی وہاں سے اُٹھ گئی اور سجل اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

پیچھے تمام لوگ اپنی پلاننگ کرتے رہے اور اس طرح سبھی نام لکھوانے پر رضامند ہو گئے۔

''یہ سیّد سمعان شاہ پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے؟ ہمیشہ مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور وہ بھی اس مشال احمد کے سامنے۔'' کرن انتہائی غصے میں سجل سے بولی۔

''ہو سکتا ہے کرن! یہ تمہاری سوچ ہو۔ یکطرفہ سوچ۔ سمعان ایسا لڑکا نہیں ہے۔'' سجل نے اسے سمجھانا چاہا۔

''سمعان کیسا لڑکا ہے، یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ لالہ سکندر شاہ کا اکلوتا بیٹا ہے وہ۔ آسائشوں میں، محبتوں میں پلا بڑھا ہے۔ اپنی حویلی کے ہر فرد کی طرح اس کا دل اپنے خاندان کی عورتوں سے متنفر ہے۔ ان حویلی کے سیّدزادوں کے لئے عورت کا وجود ایک گالی جیسا ہوتا ہے اور یہ لوگ کبھی کسی عورت کو آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ بس انہیں یہ اپنی

عزت اور انا کا سرٹیفکیٹ بنا کے اپنے گھر کی تجوریوں میں بند کر کے رکھنا چاہتے ہیں۔
سمعان شاہ کو ہمیشہ سے یہ اعتراض رہا ہے کہ میں کیوں شہر آئی اور اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ آزادی کیوں چاہی۔ وہ جانتا ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں لیکن وہ جان بوجھ کر مشال میں دلچسپی لے رہا ہے، مجھے نیچا دکھانے کے لئے۔'' کرن کا لب ولہجہ مشتعل تھا۔

''جہاں تک میں سمعان کو جانتی ہوں کرن! تو وہ ایک مثبت ذہن رکھنے والا پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ اس کی ذہنیت فیوڈل جاگیرداروں کی جیسی بالکل نہیں۔'' سجل انتہائی نرمی سے بولی۔

''سمعان کو تم نے صرف یونیورسٹی کے احاطے میں دیکھا ہے۔ شرارتیں کرتے ہوئے، گنگناتے ہوئے۔ کبھی تم اسے ہماری حویلی میں آ کر دیکھو، اس کا امیج یکسر ہی تبدیل ہو جائے گا، تمہاری آنکھوں میں۔ افسوس مجھے یہ نہیں ہے کہ سمعان نے مجھ پر دھیان نہیں دیا لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اسے اسکرپٹ رائٹنگ کے لئے مشال احمد نظر آئی۔ میں نہیں۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ میں لٹریچر میں کتنی دلچسپی رکھتی ہوں۔'' کرن بولی۔

''لیکن ڈرامہ لکھنے کی بات پہلے تو خود مشال نے کی تھی۔'' سجل نے تصحیح کی۔

''پر سمعان میرا نام تو لے سکتا تھا، مجھے پوائنٹ آؤٹ تو کر سکتا تھا۔ اس نے نہ صرف میرے ٹیلنٹ کی نفی کی بلکہ میری ذات کو بھی نظر انداز کیا۔ صرف اس لئے کہ میں اس کی حویلی میں پلی بڑھی اور ان سیّد زادوں کے لئے اپنے گھروں کی عورتیں کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔'' کرن ابھی تک اسی انتشار میں اُلجھی ہوئی تھی۔

''کرن! زندگی کی ہر چیز کو پازیٹو لو۔ دیکھنا، تم زندگی کو بدلا ہوا پاؤ گی۔ یقین کرو میرا۔ زندگی اس قدر سفاک نہیں ہے۔ کتنے ہی خوب صورت احساس سے سجی بنی ہے یہ زندگی۔ اس کو اتنی ہی خوب صورتی سے دیکھو۔'' سجل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھانا چاہا۔

''وہ بہت ہی الگ قسم کی لڑکی ہے۔ پہلے دن سے جب سے اس پر پہلی نظر پڑی ہے، میں نے اس کے لئے اپنے اندر بہت الگ قسم کی فیلنگز محسوس کی ہیں۔ ایسی فیلنگز کہ جس کا احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ہاں...... ہاں، اب میں سمجھنے لگ گیا ہوں کہ مجھے...... مجھے اس سے محبت ہے۔ ہاں سعد! مجھے اس سے محبت ہے۔'' سمعان اپنے روم میٹ اور ہمراز سعد کے ساتھ باتیں شیئر کرتے ہوئے بولا۔

''اور پھر وہ ہے ہی ایسی کہ آپ ہی آپ دل کرتا ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ وہ

اس کا دلکش سراپا، اُس کی وہ گہرائی لئے سیاہ آنکھیں اور اس کی سفید کشادہ پیشانی پر لہراتی اس کی پریشان زلفوں کی وہ لٹیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے نانگا پربت کی سفید مغرور چوٹی کے اوپر سرمئی گھٹائیں منڈلا رہی ہوں۔ اُس کی باتیں، ایک کشادہ روشن ذہن رکھنے والی سوچ، ایک بہت ہی اچھی اپروچ، جو کہ پریکٹیکل نہ ہوتے ہوئے بھی بے حد بھلی لگتی ہے۔ اس کا وہ تصوراتی ذہن ہر وقت کسی نہ کسی تصور کی تصویر بنانے میں جُتا رہتا ہے اور اس کے ذہن کی آئینہ دار اس کی آنکھیں بہت روشن، بہت خوب صورت، بالکل اس کے نام کی طرح۔ مشال...... مشعل...... روشنی سے مزین...... کرنوں سے آراستہ۔'' سمعان کے الفاظ اس کی آنکھوں سے بھی چھلک رہے تھے اور سعد اس کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''میاں مجنوں! اس عشق کی بھنک لیلیٰ کو بھی پڑی ہے کہ...... '' یکطرفہ تیرے پیار کی گلیوں میں رُلے دل۔'' سعد نے اسے چھیڑا۔

''ابھی تک تو اسے اقرار کی لذت سے آشنا نہیں کروایا۔ لیکن یار! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کہ دل کے بھید تاعمر دل ہی دل میں سمیٹ کے رکھیں اور محبوب کے فراق میں تاعمر تڑپتے رہیں۔ ایک دن ضرور...... ضرور اسے میں اپنی زبان سے بتاؤں گا۔ اس کے آگے گھٹنے ٹکا کے یہ اقرار کروں گا کہ مجھے اس سے محبت ہے۔''

سمعان شاہ کی آنکھوں میں یقین کی ان گنت پرچھائیاں تھیں۔ وفا کے کتنے ہی پُراعتماد جگنو تھے۔ خواہشوں کی ہزاروں رنگ برنگی تتلیاں تھیں۔

''تو پھر دیر کا ہے کی ہے۔ روز تو ملتے ہو اس سے۔ اقرار کرنے میں کس موقعے کی تلاش ہے تم کو؟ کل ہی اسے کینٹین لے جا۔ اچھی سی کافی پلا۔ خوب صورت سی نظم سنا کے اپنے دل کا حال بیان کر دے۔''

''نہیں، ایسے نہیں۔ کسی خاص انداز میں کہوں گا، اسے دل کے سب حال۔ کچھ اس طرح کہ وہ انکار ہی نہ کر پائے اور اپنا سب کچھ مجھ سے وابستہ کر لے۔ اپنی آنکھوں میں، خوابوں میں اور دل میں مجھے ہی بسا لے۔'' سمعان اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کے ڈرامائی انداز میں بولا۔

''میاں مجنوں! ہو تم صحیح فیوڈل۔ ملکیت سمجھ کر چاہتے ہو ہر چیز کو اور اس کے حصول کو مقصد بنا لیتے ہو اپنی زندگی کا۔'' سعد نے نیا سگریٹ نکال کے سلگایا اور مسکرا کے کہنے لگا۔



''یار ندا! تم مصروف تو نہیں ہو؟ مجھے کچھ پوچھنا تھا تم سے۔'' مشال اپنی فائل اور قلم

اٹھائے اس کی جانب آئی اور وہ جو بستر پر لیٹی کانوں میں واک مین لگائے ابرارالحق کو سننے میں مشغول تھی، مسکرا کے بولی۔

''یوں تو اس فضول کام کو بھی مصروفیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن تم بتاؤ، کیا پوچھنا ہے؟'' ندا نے ایئرفون کو نکال کے دراز میں رکھا۔

''یہاں تمہاری روم میٹس ڈسٹرب ہوں گی۔ چلو کاریڈور میں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔'' مشال کے بلانے پر وہ اپنے مخصوص انداز میں جمپ لگا کے بیڈ سے اُتری اور مشال کے ہمراہ کاریڈور میں آ گئی۔ وہیں کچھ چھاؤں اور تنہائی ڈھونڈ کر وہ دونوں بیٹھ گئیں۔

''اب بتاؤ، کیا بات ہے؟'' ندا آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔

''کچھ خاص نہیں۔ ڈائیلاگز لکھ رہی تھی نا۔ جہاں پہ ہیروئن کی ماں کو ڈائیلاگ کہنے تھے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح کے ڈائیلاگ لکھوں۔ سچویشن یہ ہے کہ لڑکی کو ایک فیوڈل لارڈ لڑکے سے محبت ہو جاتی ہے، جس کے ماں باپ اس کی شادی لڑکی سے کروانے کے لئے کئی شرطیں رکھتے ہیں جو کہ لڑکی کی ماں کو منظور نہیں۔ جب کہ لڑکی کچھ بھی کرنے کو تیار ہوتی ہے، لڑکے کے لئے۔ تو ماں کس طرح کے ڈائیلاگز بولے، میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' مشال اسے سچویشن سمجھاتے ہوئے بولی۔

''تو اس میں کیا پرابلم ہے؟ ہر ماں شادی کے نقطہ اعتراض کے طور پر ایک ہی طرح کے ڈائیلاگ بولتی ہے۔ یہ شادی کبھی کسی صورت نہیں ہو سکتی۔ میں زہر کھا کے مر جاؤں گی مگر تیری شادی اس گھر میں کبھی نہیں کروں گی، وغیرہ وغیرہ۔ زیادہ آسانی کے لئے اپنی مدر کو فون کر کے پوچھ لے تا کہ وہ اس سچویشن پر کیسے ری ایکٹ کریں گی۔'' ندا نے حل بتایا۔

''میری مدر کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ میرے پاپا نے دوسری شادی کر لی ہے اور ان کے تین بچے بھی ہیں۔'' مشال کے لہجے میں افسردگی در آئی۔

''اوہ...... مجھے علم نہ تھا۔ تو ٹھیک ہے، میں اپنی مما سے پوچھ کے بتا دوں گی تمہیں۔ ویسے وہ ڈاکٹر ہیں۔ انہیں یہی کہنا ہے کہ شادی کرو تو کسی ڈاکٹر سے۔ بھاڑ میں جائیں یہ فیوڈل لارڈز۔'' ندا نے ماحول کو ہلکا پھلکا کرنا چاہا۔

''تم سمعان یا کرن سے کیوں نہیں مدد لیتی ہو؟ ان کا تو تجربہ ہے جاگیرداروں کے بیچ پلنے بڑھنے کا۔''

''نہ یار! کرن سے تو مجھے ڈر لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہر وقت مجھ سے خفا ہو۔ ہر بات کا جواب کرختگی سے دیتی ہے۔ ہاں، البتہ سمعان سے پوچھا جا سکتا ہے۔ کل ہی مجھے یہ

فائنل کر کے دے دینا ہے اور کل سے ریہرسل بھی شروع کرنی ہے۔'' ابھی وہ باتوں میں ہی مصروف تھیں کہ چپراسی ایک لفافہ اٹھائے مشال تک آیا۔

''مشال بی بی! آپ کے لئے یہ ڈاک آئی ہے۔''

مشال نے وہ لفافہ اس سے لے لیا، جس کے اوپر اسی کا نام اور کمرہ نمبر ہاسٹل کے پتے کے ساتھ لکھا تھا۔ جب کہ بھیجنے والے کا کوئی نام نہ تھا۔

''کس کا ہے؟'' ندا نے پوچھا۔ اُس نے کندھے اچکا کر لفافے کو کھولنا شروع کیا۔ اندر ایک خوب صورت گلاب کی تصویر سے سجا کارڈ تھا، جس کے اندر انجانی تحریر میں نظم لکھی تھی۔

تُو میرا نام نہ پوچھا کر
میں تیری ذات کا حصہ ہوں
میں تیری سوچ میں شامل ہوں
میں تیری نیند کا قصہ ہوں
میں تیرے خواب کا حاصل ہوں
میں تیری یاد کا محور ہوں
میں تیری سانس کا جھونکا ہوں
تُو منظر، میں پس منظر ہوں
میں لمحہ ہوں، میں جذبہ ہوں
جذبے کا کوئی نام نہیں
تُو میرا نام نہ پوچھا کر

نظم کے علاوہ اور کچھ بھی لکھا نہ تھا۔ نہ کسی کا نام، نہ پتہ۔ مشال حیران ہی تو ہوئی تھی۔

''کون ہو سکتا ہے یہ بے نام۔ ویسے ہے بڑا رومینٹک۔ میرا عمر تو اس طرح کا کام کر ہی نہیں سکتا۔ بونگا ہے بالکل وہ تو۔'' ندا کارڈ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

''لیکن یار! یہ تو پریشان کر دینے والی بات ہوئی ناں۔ کس کی حرکت ہو سکتی ہے یہ؟'' مشال نے پریشانی سے کہا۔

''مشال! تم جیسی بولڈ لڑکی اگر اتنی معمولی سی بات پر پریشان ہو جائے تو ہمارا کیا ہو گا؟ کم آن یار! ٹیک اٹ ایزی۔ ہوگا کوئی اپنی ہی یونیورسٹی کا، یا پھر اپنی ہی کلاس کا۔ اور ویسے بھی تم پہ تو لڑکیاں عاشق ہو جائیں۔ چہرہ ہی ایسا ہے تمہارا۔ لڑکوں کا کوئی قصور تو

نہیں۔" ندا کے یہ کہنے پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ در آئی۔



اسٹیج پر سمعان شاہ اور اس کے گروپ کے لوگوں کا نام پکارا گیا۔ اسٹیج کا پردہ آہستہ آہستہ سرکنے لگا۔ وہ لوگ اسٹیج پر پہلے ہی سے تیار کھڑے تھے۔ باری باری، جس جس کے سین آنے تھے، اس نے اداکاری کرنی تھی۔

پہلا سین شاہ زیب اور سعد کا تھا، جو کہ فیوڈل لارڈز کا کردار ادا کر رہے تھے، جن میں سے ایک ہیرو کا باپ اور دوسرا اس کا چچا۔ اور ان دونوں کو اپنے بیٹے اور بھتیجے کی شہری محبت پر اعتراض تھا۔ پہلا ڈائیلاگ سعد کا تھا، جو کہ لڑکے کا والد تھا۔

"عشق لڑایا اور وہ بھی شہری مینا سے۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا، لیکن اب اس کو پانے کی ضد۔ اس لڑکے کی رگوں میں ہمارا خون ہے، ہماری ہی طرح معاشقے کرنا، بلبلیں پھنسانا۔ لیکن کسی بھی بلبل کو اپنی حویلی کے پنجروں میں جکڑنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا۔"

"ادا سائیں! اگر آپ اجازت دیں تو اس لڑکی کو اغواء کروا کے قتل کروا دوں۔ جس کی وجہ سے ہمارا خون اپنی منگ لینے سے انکار کر رہا ہے۔" شاہ زیب نے ڈائیلاگ ادا کئے۔

"نہیں دلاور خان! نہیں۔ ہو گا تو وہی، جو ہم چاہیں گے۔ بس ہم اپنے وارث کے دل کو ٹھیس پہنچانا بھی نہیں چاہتے۔ اپنے ارادوں کی ناکامی ہم نے کبھی سوچی ہی نہیں اور نہ ہی ہم ناکام ہونا جانتے ہیں۔" سعد کسی فیوڈل لارڈ کی طرح دہاڑا۔ اُس کی اس کمال ایکٹنگ پہ سبھی دیکھنے والے سراہ رہے تھے۔

"تو ادا سائیں! آپ نے کیا کرنے کا ارادہ کیا ہے؟"

"ارادہ......... ارادہ تو ہمارا بہت کچھ کرنے کا ہے اور ہم وہ سب کریں گے، جو ہمارے ارادے ہیں۔ بس ہمیں صحیح وقت کا انتظار ہے، دلاور خان!" سعد چیخا اور تبھی ندا نے انٹری دی، جو کہ ہیرو کی ماں یعنی فردوس خان کی بیوی کا رول ادا کر رہی تھی۔

"تم نے سنا ہو گا اپنے فرزند کی فرمائش کے بارے میں۔" اب سعد ندا سے مخاطب تھا اور شاہ زیب بیک اسٹیج جا چکا تھا۔

"جی سائیں! سنا بھی اور اسے سمجھایا بھی....... لیکن وہ ہے کہ ایک ہی ضد پر اڑا ہے کہ شادی کروں گا تو اسی لڑکی سے۔ اور وہ لڑکی ٹی وی پر کام کرتی ہے۔ طلاق یافتہ ماں کی بیٹی ہے لیکن منصور خان کے دل میں نہ جانے کہاں سے آ بسی ہے۔" ندا نے بڑی روانی اور مہارت سے ڈائیلاگ ادا کئے۔

"وہ نہیں سمجھے گا اور نہ باز آئے گا۔ اگر لڑکی ہوتی تو بندوق کی ایک گولی اس کے جسم میں جاتی اور ہمیں اس کی موت پر افسوس تک نہ ہوتا۔ لیکن ہم کتنے مجبور ہو گئے ہیں اپنی اکلوتی اولاد کے پیچھے۔ لیکن کوئی بات نہیں، ہم تم سے جو کہیں گے وہ تم اس لڑکی سے جا کے کہو گی۔ اور پھر منصور خان کی شادی اسی لڑکی سے کرواؤ گی اور بعد میں کیا کرنا ہے، وہ خود سوچیں گے۔" اپنا آخری فیصلہ سناتا ہوا لڑکے کا والد تیز قدموں سے بیک اسٹیج چلا گیا۔

اسٹیج کا پردہ گرایا گیا اور پورا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ ہر طرف داد و تحسین تھی۔

پردہ ایک بار پھر اُٹھا۔ اس بار منظر میں سمعان منصور خان اور مشال لیلیٰ بنی کھڑی تھی۔ تماشائیوں میں ڈرامہ دیکھتی کرن کے خون کی شریانوں میں پل بھر کو اشتعال اُٹھا۔

"میری اماں تم سے ملنا چاہتی ہیں لیلیٰ! اور مجھے امید ہے کہ اس ملاقات کے بعد ہماری شادی کی رضامندی ہو جائے گی۔" سمعان انتہائی اعتماد سے بولا۔

"اور اگر تمہاری اماں نے انکار کر دیا تو؟" مشال بولی۔ "اگر تمہارا رُتبہ، تمہاری شان، تمہاری جاگیردارانہ اونچائی ہماری محبت کی راہ میں رکاوٹ بن گئی تو....... اگر ہماری معصوم محبت کو اونچی دیواروں نے روند دیا تو؟"

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا لیلیٰ! اور اگر ایسا ہوا....... تو اُکھاڑ کے پھینک دوں گا میں ان دیواروں کو....... کہ جن کے درمیان ہماری محبت سانس نہ لے سکے۔ پاؤں سے روند دوں گا میں، اس اونچائی کو کہ جو ہماری جیت کی راہ میں آئے۔ مجھے اس رتبے، اس شان، اس بڑائی کا گلا گھونٹنے میں کوئی دیر نہیں لگے گی کہ جو مجھے تم سے جدا کرے۔" سمعان نے کہا۔

"لیکن اگر کسی شرط، کسی رُکاوٹ نے تمہاری محبت کو بدل دیا تو؟" لڑکی کے دل کا خدشہ بول اٹھا۔

"کیوں کر....... کیوں کر لیلیٰ! بدل پائے گی کوئی شرط میری محبت کو؟ تم سے میری محبت لمحوں یا پلوں پر نہیں، صدیوں پر محیط ہے۔ میں اپنی جائیداد، مان، رُتبے ہر چیز کو ٹھکرانے کو تیار ہوں۔ ہر چیز کو چھوڑنے پر رضامند ہوں۔ بس ایک تمہارے پیار کی طلب اور تمہارے ساتھ کی تمنا ہے مجھے۔ اور کچھ نہیں۔" سمعان کی آنکھوں سے چھلکتی شدت اور اس کے چہرے پر بکھرے عکس پل بھر کو مشال کو یہ محسوس ہوا کہ جیسے وہ اسٹیج پر کھڑا کوئی کردار نہیں ادا کر رہا بلکہ واقعی میں مشال کا ہاتھ تھامے اسے اپنی سچائیاں سونپ رہا ہے۔ اس کے اندر اپنی محبت تحلیل کر رہا ہے۔ اس کا دل پل بھر کے لئے ایک الگ زاویے سے دھڑکا۔ وہ چونکی۔ اسے لگا کہ وہ اپنے سارے ڈائیلاگ فراموش کر دے گی۔ اس لڑکے کی

آنکھوں کی سچائیوں کا سامنا کر پانا اس کے لئے آسان نہ تھا۔

تماشائیوں میں بیٹھی کرن شاہ کی آنکھیں پل بھر میں نم ہو گئیں۔ اسے یوں لگا کہ جیسے سمعان شاہ اداکاری نہیں کر رہا، وہ اپنے دل کی چاہت، اپنے محبوب کے دل تک منتقل کر رہا ہے، اسے سونپ رہا ہے۔ اور کرن کے اندر موجود سمعان کی محبت نے اِک درد بھری ٹیس سے کروٹ لی۔ فضا میں پھر سمعان کی محبت کی پکار اُٹھی۔

"فراموش کر دیا ہے میں نے دنیا کو تمہاری چاہت میں....... بھول گیا ہوں میں سب کچھ تمہاری آس پر....... اپنا سب کچھ تمہیں سونپ دیا ہے میں نے....... اب اگر تم نے بھی میری وفا کو تسلیم نہ کیا تو کہاں جاؤں گا میں؟ کس کو یقین دلاؤں گا اپنی شدتوں کا، اپنی چاہتوں کا؟ زمانے بھر سے زیادہ محبت کی ہے میں نے تم سے۔ نہیں جی پاؤں گا میں تمہارے بنا۔ نہیں تصور کر پاؤں گا زندگی تمہارے بنا۔"

پل بھر میں مشال کے ساتھ ساتھ بیک اسٹیج پر کھڑی سحل بھی چونک اُٹھی تھی، جس کے ہاتھ میں ڈرامے کے اسکرپٹ کی فائل تھی۔ سمعان جو کچھ بھی بول رہا تھا، وہ اسکرپٹ کا حصہ نہ تھا۔ وہ لفظ، وہ جملے، منصور خان کے کردار کا حصہ نہ تھے۔ وہ تو سیّد سمعان شاہ کے اندر کے الفاظ تھے۔ وہ جذبے سمعان شاہ کے دل کی محبت پر مبنی تھے۔ وہ استعارے، سمعان کی محبت کے استعارے تھے۔

مشال کے سامنے ایک شدت پسند لڑکا کھڑا تھا۔ جس کی آنکھیں وفا کی لو سے جگمگا رہی تھیں اور جس کے ہونٹ اقرار کی کپکپاہٹ سے جنبش میں تھے اور یہ کپکپاہٹ، یہ جنبش مشال کو منتشر کئے جا رہی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی سعی کی۔

"منصور! کہیں تمہاری مضبوط حصاروں والی حویلی میں ہماری وفائیں قید تو نہیں کر دی جائیں گی؟ کہیں تمہارے سخت قسم کے رواجوں کے آگے ہماری صداقتیں بے موت تو نہ ماری جائیں گی؟"

مشال نے خود کو زبردستی لیلٰی کے کردار میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ سمعان نے ایک بار پھر اپنے بھاری ہاتھ میں اس کا نازک سا ہاتھ تھاما اور اسے یقین دلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"اگر میری چاہتوں کی شدت پہ تمہیں یقین نہ ہو تو جو سزا دینا چاہو، مجھے منظور ہے۔ میری منتظر سانسیں تمہارے قدموں میں ہیں۔" وہ گھٹنوں پر بیٹھا اس سے اظہار محبت کر رہا تھا اور اس کے ہاتھ کا لمس مشال کو اس کی شدتوں کا یقین دلا رہا تھا۔ وہ دونوں پل بھر کو خاموش ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایک بار پھر مشال کا دل دھڑکا۔ یہ سراسر وہ الفاظ نہ

تھے جو منصور خان کو کہنے تھے۔ یہ الفاظ تو سمعان کے ذہن کی پیداوار تھے، اس کے دل کی پکار۔

پورا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ اسٹیج کا پردہ گرایا جا چکا تھا۔ پوری دنیا کی باتوں کے سامنے سمعان نے اپنے دل کا بھید مشال کو سونپ دیا تھا۔ وہ دونوں ابھی تک ایک دوسرے کے چہرے پر نظریں ٹکائے اسی طرح کھڑے تھے۔

اور کرن شاہ اس پورے منظر کو دیکھ کر اپنا پورا وجود اشتعال میں محسوس کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ اب آنسوؤں سے تربتر تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں بیٹھی ڈرامے میں نہیں، حقیقی زندگی کی کہانی میں ہے اور سمعان اس کے دل کی دھڑکن، کسی اور سے اپنی وفا کا اظہار کر رہا ہے۔

اور پھر یہ احساس ہی کتنا بھیانک ہوتا ہے کہ جسے آپ نے چاہا ہو، وہ اپنی چاہتیں کسی اور کی جھولی میں ڈال دے۔ جسے آپ نے مانگا ہو، وہ اپنے لئے کسی اور کو مانگے۔ جو آپ کے دل میں دھڑکے اسے کسی اور کے دل کی دھڑکنیں اپنے اندر محسوس ہو رہی ہوں۔"

"سمعان! سین چینج ہونا ہے۔ پلیز میرا ہاتھ چھوڑیں۔" مشال نے التجا کی۔

"آئی لو یو مشال!" وہ اس کے قدرے نزدیک آ کے سرگوشی میں بولا۔

"سمعان!" وہ بولی۔

"میں تیری ذات کا حصہ ہوں....... میں تیری سوچ میں شامل ہوں۔" سمعان مسکرا کے بولا مگر اس کی آنکھیں سنجیدہ تھیں۔

"تو وہ آپ نے....... بھیجا؟" مشال کے الفاظ توڑ پھوڑ کا شکار تھے اور ذہن بھی۔

"میں تیرے خواب کا حاصل ہوں
میں تیری یاد کا محور ہوں"

وہ پھر اسی روانی اور اسی شدت سے بولا۔ اب کے مشال مسکرا دی اور زبردستی اپنا ہاتھ چھڑا کے بیک اسٹیج کی طرف دوڑی۔

آخری کلائمکس سین شروع ہو چکا تھا۔ پورا ہال خاموش تھا کہ اتنے دلچسپ ڈرامے کا اینڈ آخر کس طرح ہوگا۔ ڈرامے کی ہیروئن یعنی مشال منصور خان کی دُلہن کے روپ میں کھڑی تھی اور اس کا سسر یعنی فردوس خان، منصور کو سامنے کھڑا کئے چیخ رہا تھا۔

"دیکھ لیا تم نے منصور خان کو....... اپنی پسند کو؟ ملا دی نا تمہاری اور تمہارے خاندان کی عزت مٹی میں؟....... کر دیا نا تماشا ہماری عزتوں کا، ہماری اونچی پگڑیوں کا؟"

"نہیں بابا سائیں!......نہیں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا......نہیں منصور! میں بے قصور ہوں۔" لیلیٰ کی آواز میں بے گناہی کی پکار تھی۔

"خاموش لڑکی! ہم نے خود تمہیں دیکھا ہے، حویلی کے ملازم کے ساتھ اور ہمیں یقین ہے کہ منصور خان اپنے بابا سائیں کی زبان پہ اعتبار کرے گا۔"

گردن جھکائے کھڑا منصور خان ایک عجب اضطراب میں تھا۔

"کاری ہے یہ......! اس کا وجود .... اس نے ہماری حویلی میں ہی رہ کر ہمارے خاندان پر کاری کا داغ لگایا ہے منصور خان! اور جس طرح ہر کاری کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس کا بھی وہی ہوگا۔ بے عزتی کی موت۔ ذلت سے مار ڈالو اس کو منصور خان!" فردوس خان چیخا۔

"لیکن بابا سائیں!...... بنا ثبوت کے تو ہمارا دین بھی......" منصور کی زبان کپکپا رہی تھی۔

"منصور خان! اپنے بابا سائیں کی بات کو جھٹلا کر تم ہمیں دین کی بات سکھا رہے ہو۔ ہم نے جو کہا ہے، وہ کرو۔ ورنہ اس کلنک کو ہم خود اپنے ہاتھوں سے سزائے موت دیں گے۔"

"بابا سائیں! اگر آپ لوگ مجھے موت دینا چاہتے ہیں تو بے شک دے دیں لیکن یہ الزام سراسر جھوٹ ہے۔ میں نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا۔" لیلیٰ کی آنکھیں اور لہجہ دونوں پُرنم تھے۔

"یہ لو منصور خان! اور فیصلہ کر دو اس کا۔" فردوس خان نے اپنے بیٹے کو بندوق تھمائی۔

"بابا سائیں! کوئی اور حل بھی تو ہو سکتا ہے اس مسئلے کا۔" وہ دبی دبی آواز میں بولا۔

"تم چاہتے ہو کہ اسے سنگساری کی موت ملے...... فردوس خان جب دوسروں کی بیٹیوں کو کاری کی سزا میں مروا دیتا ہے تو اپنی بہو بیٹیوں کو معاف کر دے...... کیونکر؟" وہ دہاڑا۔ "مجھے دو یہ بندوق۔"

فردوس خان نے بندوق اس سے چھین کے فوراً ہی اس کا ٹرائیگر دبا دیا اور گولی سیدھی لیلیٰ کے جسم کے اندر چلی گئی۔ ایک گولی...... پھر دوسری گولی......

"بابا سائیں......!" اور تیسری گولی منصور خان نے آگے ہو کے اپنے سینے پہ لے لی۔

"منصور خان......!" فردوس خان نے چیخ ماری اور بندوق پھینک دی۔

"محبت کبھی کاری نہیں ہوتی بابا سائیں!...... محبت کبھی کاری نہیں ہو سکتی۔" زمین پر

گرتا ہوا منصور خان خون میں لت پت تھا اور لیلیٰ تو پہلی ہی سانسوں کو سمیٹ چکی تھی۔

اپنے کیئے کا پھل فردوس خان کو مل چکا تھا۔ ایک فیوڈل لارڈ کے سر کا تاج، اس کا اکلوتا وارث محبت پہ قربان ہو چکا تھا۔

اسٹیج کا پردہ گرا۔ ہال میں ایک شور اُٹھا۔ ہر طرف ان کی اس بہترین اداکاری اور تحریر کو سراہا جا رہا تھا۔ تالیوں، سیٹیوں کا ایک شور تھا...... اِک گونج تھی۔

فیصلہ ہوا اور ان کے ڈرامے کو بہترین پلے کا ایوارڈ ملا اور پچاس ہزار روپے کیش بھی۔



سمعان کی محبت اس کے چاروں جانب اپنی جھانجھریں بجائے ہوئے تھی۔ اس کی محبت نے مشال کے دل کے دروازے پر دو انگلیوں سے ہلکی سی دستک کیا دی تھی، اس نے تو دل کی نگری کے تمام دروازے اس پر کھول دیئے تھے، جہاں وہ پورے اختیار سے آ بیٹھا تھا۔ کچھ اس طرح کہ جیسے یہ دل مشال کا نہ ہو، اس کا اپنا ہو۔ اس کی ملکیت، اس کی جائیداد کا ایک حصہ۔ تنہائیوں میں بھی جب مشال کو اس کی آنکھوں سے چھلکتی شدت اور ہونٹوں سے لرزتے اقرار کا خیال آتا تو وہ خوشی سے مسکرا دیتی۔ اتنی محبت کرتا تھا سمعان شاہ اس سے۔ اتنی چاہت چھپا رکھی تھی، اس شدت پسند لڑکے نے اپنے اندر۔ کیا وہ اتنی خاص تھی؟ اتنی اسپیشل کہ جس کو اس طرح چاہا جائے، جس کے خوابوں کو اس طرح آنکھوں کی گود میں سلایا جائے، جس کے تصور کو ستاروں کی طرح دل کے آنچل میں ٹانکا جائے۔ سچ یہ محبت انسان کو کتنا الگ، کتنا مختلف بنا دیتی ہے۔ کتنے میٹھے تصور وابستہ کر دیتی ہے، انسان کے دل سے۔

رات بھر وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے ماحول کی خنکی میں سمعان کے لئے اپنی محبت کو محسوس کرتی رہی۔ صبح یونیورسٹی گئی تو سب سے پہلے اس کا سامنا بھی اسی ظالم سے ہوا کہ جس نے چڑیا سے دل کو اپنی دسترس سمجھ کر اسے قید کر لیا تھا۔

آنکھوں کے ایک موہوم سے تبادلے کے بعد وہ اس کے ہمراہ چلتی چلتی لائبریری کے پاس بنے پارک میں آ گئی۔ پارک میں پھولوں کی کیاریوں کو شاید نیا نیا ہی اُگایا گیا تھا۔ سوندھی سوندھی خوشبو گیلی مٹی سے اُٹھ رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے کچھ آوارہ ٹکڑے اُڑ رہے تھے اور دھوپ کی تمازت میں کمی کا باعث بن رہے تھے۔ وہ دونوں کونے میں لگی بنچ پر بیٹھ گئے۔ وہ تو خاموش تھی ہی، لیکن سمعان کو بھی الفاظ ڈھونڈے سے نہیں مل رہے تھے۔ وہ جو لفظوں کا جادوگر اور نظموں کا سوداگر کہلاتا تھا۔ آج اس طرح چپ تھا۔

"جانتی ہو مشال! تم بہت ہی اسپیشل لڑکی ہو۔ بہت خاص، بہت الگ........تمہیں دیکھا تو پتہ ہی نہ چلا کہ کب تم مجھے پسند آئیں اور کب اس پسند نے یہ احساس دلایا کہ میں محبت ہوں........مجھے دیکھو، مجھے جانو، مجھے سمجھو۔" کئی لمحوں بعد سمعان نے آخر حرف جوڑ ہی لئے۔

"کئی دنوں تک میں سوچتا رہا۔ خود سے اُلجھتا رہا کہ نہیں سمعان! ایک بار پھر سوچ لو۔ اپنے دل کو پرکھ لو۔ اپنے ارادوں کو بھانپ لو۔ لیکن ہر بار میرے دل نے وہی جواب دیا۔ مشال ہے تو سب ہے، مشال نہیں تو کچھ نہیں۔ میرا ساتھ دو گی مشال؟ میری وفاؤں پہ یقین کرو گی؟ میری بنو گی؟" وہ اس کے اقرار کا منتظر تھا اور وہ اپنے ہونٹوں پر چپ کے قفل چڑھائے، اپنے دوپٹے کو اُنگلی میں اڑسے جا رہی تھی۔

"کہو ناں مشال! یقین کرتی ہو مجھ پر؟ ہے اعتبار میری صداقتوں پہ؟ بولو ناں۔" وہ بے قرار سا اس کی جانب دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل کا شکار تھیں۔

"مجھے اعتبار سا ہو گیا ہے تم پر سمعان! میں یقین کرنے لگ گئی ہوں تمہاری صداقتوں پہ۔" وہ گھاس پر نظریں ٹکائے بولی اور سمعان کے لبوں پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

تبھی وہاں ان کے گروپ کے باقی لوگ آ گئے۔ کرن کے سینے میں ان دونوں کو ایک ساتھ بیٹھے دیکھ کر چنگاریاں سلگ اُٹھیں۔

"یہ لو........ یہ ہیرو، ہیروئن یہاں بیٹھے ہیں اور ہم آدھی یونیورسٹی چھان آئے۔" سعد نے دور سے ہی دہائی دی۔

"کیوں، ہمیں کیوں ڈھونڈ رہے تھے تم لوگ؟" سمعان مسکرایا۔ جس کو جہاں جگہ ملی، وہیں بیٹھ گیا۔

"بھئی جوڑی آف دی ایئر ہو۔ انعام جیتا ہے تم لوگوں نے۔ مشال نے اتنا اچھا ڈرامہ لکھا اور تم دونوں نے اس قدر زبردست ایکٹنگ کی۔ کوئی ٹریٹ شریٹ تو ہونی چاہئے۔" کویتا نے کہا۔

"صرف ٹریٹ سے نہیں کام چلنا........کوئی ٹرپ ہونی چاہئے۔" شاہ زیب نے اعتراض کیا۔

"تو ٹھیک ہے........کسی دن ہاکس بے چلتے ہیں۔" سمعان نے کہا۔

"ہاکس بے نہیں، کہیں باہر لے چلیں۔ اتنے سارے پیسوں کا ہم کیا کریں گے؟ گھوم

پھر ہی آئیں۔" سعد نے کہا۔

"چلو، کسی ہل اسٹیشن چلتے ہیں۔" ندا نے آئیڈیا دیا۔

"مری میں میرے پاپا کا ایک گھر ہے جو اکثر بند رہتا ہے۔ اگر وہاں چلو تو میں انتظام کروا دوں گی۔ کم از کم رہائش کا خرچہ نہیں ہوگا۔" مشال نے کہا۔

"یار! اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ بناؤ پروگرام مری جانے کا۔" ندا کھلکھلا اُٹھی۔

"کون کون چلے گا؟" شاہ زیب ہمیشہ کی طرح ارینج منٹ کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

"سبھی چلیں گے۔ کویتا، میں، تجل، مشال، سعد اور کرن بھی۔" سمعان بولا۔

"نہیں........مجھے نہیں جانا۔" کرن نے منہ بسورا۔

"ارے کیسے نہیں جانا۔ تمہارے کزن صاحب تو ساتھ ہی ہوں گے۔ تمہارے گھر والوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔" اسے تجل نے گھرکا۔

"او کے، فائنل۔ ہم اس جمعہ کو نکل چلیں گے اور تین چار دن خوب انجوائے کریں گے۔" شاہ زیب بولا۔

"اگر تم لوگوں کو برا نہ لگے تو میں اپنے کزن عمر کو بھی وہاں بلا لوں۔" ندا نے اپنے دل کی بات کھول ہی دی۔ مشال مسکرا دی۔

"بلا لینا۔ لیکن اسے کہنا اپنا خرچہ اپنے ساتھ ہی لائے۔" سعد کی بات پر سبھی کھلکھلا کے ہنس دیئے۔ اس طرح سبھی ٹرپ پہ جانے کی تیاری کرنے لگے۔



آگہی کو جب ان کہی کا بھید مل جائے تو زندگی کی سمت یکسر بدل جاتی ہے۔ گپ چپ سے راز کو جب اقرار کی لذت نصیب ہو جائے تو فضائیں ایک نئی نئی سی خوشبو حیات میں گھولتی ہیں اور یکطرفہ محبت، جب اپنے وجود کی دبیز چادر دونوں سمتوں میں پھیلا دے تو دل پڑنے والی ناآشنا سے احساسات کی اوس کتنی بھلی لگتی ہے۔

سمعان کی محبت کی آگہی اور اس کی ان کہی کا بھید مشال نے قبول کر لیا تھا اور وہ نوں فضاؤں میں محبت کی ایک نئی نئی خوشبو کو گھلتے ہوئے، پھیلتے ہوئے محسوس کر رہے تھے۔

ان کا گروپ کوہ مری کی خنک وادیوں میں اپنی پوری شرارتوں اور شوخیوں کے ہمراہ جود تھا۔ مشال نے اپنے پاپا سے کہلوا کر وہ گھر کھلوا دیا تھا، جو کہ اس کے نام پاپا نے کیا اور اسی گھر میں تو اس کی ماما کی یادیں بسی تھیں۔ یہیں سے تو ان کی روح نے پرواز کا

سفر شروع کیا تھا۔ جب ان کا مرض لاعلاج ہو گیا تو انہوں نے دنیا سے دور کسی پُرسکون جگہ جانے کی خواہش ظاہر کی تھی اور تب ننھی سی مشال کو لے کر وہ لوگ یہاں آ گئے تھے۔ صرف چند ماہ ہی قدرت کے ان خوب صورت نظاروں میں گزارنے کے بعد اس کی ماما ان سے بچھڑ گئیں اور اس گھر کے در و دیوار میں اپنی دلفریب مہک چھوڑ گئیں۔

اور پھر اسی خوب صورت شہر کی فضاؤں میں مشال کی محبت سانس لینے لگی۔ وہ اور سمعان ایک دوسرے کو جاننے لگے، پہچاننے لگے۔ دلوں کے زاویے پیچ ہونے لگے اور یہ دُھند بھری مہکی فضائیں کتنے ہی دعدوں سے مہکنے لگیں، کتنے ہی سپنوں سے بوجھل ہونے لگیں۔ شفاف دھوپ کی پہنائیوں میں کتنی ہی یادیں ترتیب پانے لگیں اور ایسے میں یہ محبت بھرے پُر رونق لمحے کرن شاہ کے دل پر ان دیکھا بوجھ ڈالنے لگ گئے۔ اس کے اندر سمعان شاہ کی محبت اور اس سے منسوب ہونے کی خواہش کلبلانے لگی۔ رائیگاں جانا وہ چاہتی نہ تھی اور اپنی ہی آنکھوں کے سامنے اپنی چاہت کو یوں چھنتا ہوا دیکھ نہ پاتی تھی۔ ان دونوں کو اکیلے میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہنستے دیکھ کر اس کا بدترین خدشہ سچائی کا روپ دھارنے لگتا۔ محبت کی بازی شروع ہونے سے پہلے ہی وہ ہار گئی تھی۔ وہ کسی عدالت کا در کھٹکھٹانا چاہتی تھی، کسی کو آواز دینا چاہتی تھی، جو اس کی محبت کو تند لہروں میں ڈوب جانے سے بچا سکے۔ وادیوں کی نرم و نازک دھوپ اس کے وجود کو جلائے جا رہی تھی۔ وہ اتنے سارے دوستوں کے بیچ بھی تنہا تھی۔ سبھی لوگ ہنستے، کھلکھلاتے، تصویریں اتارتے، مشال اور سمعان آنکھوں کے اشاروں سے کئی باتیں کرتے اور وہ ہر کسی کا چہرہ تکتی رہ جاتی........ یا ان سب کے چہروں پر شناسائی کے سائے تلاش کرتی۔

مشال اور سمعان کی بے آواز اٹھکیلیوں کے درمیان کرن کا وجود معلق تھا۔ ایک زندہ محبت کی ماورائی کے بیچ ایک مُردہ محبت کا بے کل وجود۔ وہ دل ہی دل میں فیصلہ کرتی کہ وہ سمعان پر اپنی محبت اپنے تئیں ظاہر تو کر دے۔ لیکن پھر احساسِ تذلیل بیچ میں سینہ تانے کھڑا ہو جاتا۔

اظہار وہاں پہ آمنا صدقنا کا درجہ پاتے ہیں جہاں محبتوں کی کونپل موجود ہو....... جب مٹی میں بیج ہی نہ ہو تو آس یا امید کا شجر کیونکر کھڑا کیا جائے۔

کتنی اذیت سے اس نے یہ چار دن گزارے۔ پانچویں دن ان کی واپسی تھی لیکن ندا نے شور مچایا۔

''کیا یار! کتنا مزہ آ رہا ہے، کم از کم ایک ہفتہ تو پورا کر لو۔'' ندا تو اپنے محبوب عمر کے ہمراہ ہزاروں نئے خواب بن رہی تھی۔ مرضی تو شاید سمعان کی بھی یہی ہوتی لیکن کرن بول پڑی۔

''کیا یار! اس طرح سب چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جانا۔ کتنی کلاسز مس کر چکے ہیں ہم۔ اور پھر سمسٹر ایگزام بھی سر پر ہیں۔''

''کیا کرو گی اتنی محنت کر کے کرن! ابھی تو دو ماہ ہیں ایگزام میں۔ انجوائے کر لو۔'' سعد مسکرایا۔

''سمعان! کیا تمہیں یاد نہیں کہ نزہت آپی کی شادی کی تاریخ رکھنے بھی ہم نے اسی ماہ کے آخر میں جانا ہے۔'' وہ سیدھا سمعان سے مخاطب تھی۔

''یاد ہے بابا! سب یاد ہے....... نزہت میری بہن ہے کرن! مجھے یاد نہ ہوگا تو پھر کسے ہوگا؟ لیکن ابھی اس پل کو تو انجوائے کرو۔ کل کی کل سوچیں گے۔'' سمعان اسی اطمینان سے بولا۔

''او کے یار! یعنی میں کل کی ٹکٹیں بک نہ کرواؤں۔'' شاہ زیب آخر میں ہی بولا تھا۔ سبھی نے ہامی بھر لی اور ہمیشہ کی طرح کرن خاموش ہو گئی۔

''ویسے یار! تمہاری فیملی کا یہ سسٹم ہے بڑا آسان۔ خاندان ہی کے دولہے، خاندان ہی کی دُلہن۔ جانتی ہو مشال! نزہت کی شادی کرن کے بڑے بھائی فراز شاہ کے ساتھ ہو رہی ہے۔'' کویتا نے انفارمیشن دی۔

''اور اسی طرح کرن کی سمعان کے ساتھ متوقع ہے۔'' شاہ زیب نے مذاق کیا۔ سبھی ہنس دیئے ماسوائے سمعان اور مشال کے اور کرن کی آنکھیں سمعان کے چہرے پر بھٹک گئیں، جسے یہ مذاق پسند نہ آیا تھا۔

''کوئی ضروری تو نہیں۔'' وہ فوراً بولا۔ سبھی نے اس بات کو بھی مذاق ہی سمجھا لیکن کرن کے دل میں ایک عجیب سے احساس نے سر اٹھایا۔ ٹھکرانے کے احساس نے۔

اور پھر اگلی ہی صبح سیڑھیوں پر ایک آواز ہوئی۔ سبھی دوڑتے گئے تو پتا چلا کہ کرن سیڑھیوں سے پھسل کر گر چکی ہے اور اس کی ٹانگ میں شدید چوٹ آئی ہے۔ ڈاکٹر کو بلا کے اس کے زخم کی پٹی کروائی گئی۔

شام کو سبھی کا بھوربن جانے کا پروگرام تھا۔ لیکن کرن کا جانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے اس کی دیکھ بھال کے لئے سمعان گھر پر ہی رک گیا اور مشال باقی سب کے ساتھ چلی گئی۔

اگلے دن مجبوری جان کر سبھی کو واپسی کا سفر اختیار کرنا پڑا اور اس طرح ان کے اس ٹرپ کا اختتام ہوا۔



"جانتے ہو شاہ زیب! مشال تمہیں پسند کرتی ہے۔" کرن کے بلاسٹ کیے اس بم پر شاہ زیب کے منہ تک گئی چائے کی پیالی وہیں کی وہیں تھم گئی۔ وہ چونک گیا۔

"پاگل تو نہیں ہوگئی ہو کرن! کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"نہیں ہوئی ہوں میں پاگل۔ روم میٹ ہے وہ میری۔ اس نے مجھے خود بتایا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔" کرن نے اعتماد سے جھوٹ کو ثابت کرنا چاہا۔

"مجھے تو اس کی کسی بات سے کبھی محسوس نہیں ہوا۔" وہ حیران ہی تو تھا۔

"اسے بھی یہی شکایت ہے تم سے کہ تم نے کبھی اسے سمجھنے کی، محسوس کرنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔ شاہ زیب! لڑکیاں بہت گہری، بہت ڈیپ ہوتی ہیں اور محبتیں تو وہ کسی صورت کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ محبت انہیں خود پہچان لے، خود ان کے آنچل تھام لے اور محبوب خود چل کر ان سے کہے کہ تم میری چاہت، میری محبت ہو۔"

کرن اسے آمادہ کر رہی تھی اور وہ بدستور خاموش تھا۔ کیسے اور کب جیسے سوالیہ دائروں کے گرد سفر کر رہا تھا۔

"کیا تم اسے پسند نہیں کرتے زیب؟ اس جیسی اسپیشل لڑکی کی چاہتوں کی قدر نہیں ہے تمہیں۔"

"نہیں کرن! ایسی بات نہیں ہے۔ بس مجھے پتا نہیں کیوں بے یقینی سی ہے۔ کافی عرصے سے ہم سب دوست ہیں۔ مگر نہ اس کی باتوں اور نہ اس کی آنکھوں ہی سے پتہ چلا اس کی فیلنگز کا پھر......" شاہ زیب بولا۔

"پھر یہ کہ تم اس کے دل میں اپنی پسند کا احساس جگاؤ۔ اس کے اندر اپنی محبت کے بیج بوؤ اور ہاں اسے یہ مت بتانا کہ میں نے اس کے دل کا یہ بھید تم پر کھول دیا ہے۔ بے حد ناراض ہوگی وہ۔" کرن نے مسکرا کر اسے یقین دلایا اور شاہ زیب مسکرا دیا۔

اس کے دل میں اس احساس نے جنم لے لیا کہ مشال جیسی پری پیکر لڑکی اسے چاہتی ہے اور وہ اس سے بے خبر ہے۔ چاہے جانے کا احساس یوں بھی ماورائی ہوتا ہے اور پھر وہ چاہت اگر مشال جیسی اپسرا سے منسوب ہو جائے تو پھر کائنات کو مٹھی میں بھر لینے کا سا احساس ہوتا ہے اور کچھ اسی طرح کا احساس شاہ زیب کے دل میں بھی تھا۔

کرن اپنے ایک جھوٹ سے شاہ زیب کے دل میں ایک احساس پیدا کر پائی تھی۔ اب باری تھی سمعان کے دل کی۔ جس سے مشال کے محبت کے احساس کو جڑ سے اکھاڑنا تھا۔ اس کے بعد سمعان کا حصول کوئی اتنا مشکل بھی نہ تھا۔ گھر کا لڑکا تھا۔ دیکھا بھالا۔ بس بی جان کے کانوں تک یہ بات پہنچانی تھی کہ وہ سمعان کو چاہتی ہے اور پھر بی جان اپنے بیٹے سکندر شاہ کو راضی کر لیتیں اور سکندر شاہ کا کہا سمعان نہ ٹال سکتا۔

باقی سب کچھ تو بہت آسان تھا، بس سمعان کے اندر مسکراتی مشال کی محبت سے اسے خوف آتا تھا کہ کہیں وہ محبت اپنی صداقتوں کو تھامے چوڑا سینہ کیے اس کے جھوٹ کے آڑے نہ آ جائے، کہیں وہ طاقت ور شے اس کے ہر احساس کی نفی نہ کر لے۔

اور پھر اگلے ہی دن ان کے گروپ کے ہر فرد کی زبان پر ایک دبی دبی کہانی تھی کہ شاہ زیب مشال سے محبت کرتا ہے اور یہ کہانی بھی کرن ہی کی زبان سے نکلی تھی۔ تجل کے علاوہ تقریباً ہر کوئی یقین کر بیٹھا تھا اور شاید تجل بھی کر لیتی لیکن ڈرامے والی شام اس آنکھوں دیکھے اقرار کی گواہ تنہا وہی تو تھی۔

سمعان اور مشال دونوں ہی تقریباً اس بھید سے بے خبر اپنی نئی نویلی محبت کی نوک پلک سنوارنے میں مگن تھے۔ دونوں ہی اپنی زندگی کی سب سے خوب صورت فیلنگز کے گرد و نواح میں رقصاں تھے۔ لائبریری میں، کینٹین میں، لان میں کئی لمحے ایک دوسرے کی قربت میں گزارنا جیسے ان کا مشغلہ بن گیا۔ کھٹے بیٹھے خواب بُنتا، زندگی سے اچھی اچھی اُمیدیں وابستہ کرنا، ان دونوں کے لئے کتنا رنگین، کتنا جاذب تھا۔ یہ تمام باتیں گو کہ کرن سے پوشیدہ نہ تھیں لیکن وہ خاموش تھی۔ مصلحت کوشی کی چادر لپیٹے وہ چپ تھی۔

اور پھر انہی دنوں مشال اور سمعان کی محبت کی زندگی میں پہلی جدائی آئی کہ جب چند دنوں ہی کے لئے سہی، سمعان کو کرن کو ساتھ لے کر سادات حویلی پہنچنا تھا اپنی بہن نزہت کی شادی کی تاریخ رکھنے۔

اس مختصر سی جدائی نے بھی مشال کے اندر دھڑکتے ننھے سے دل میں خدشوں کے ہزار ہا دھڑکے پیدا کر دیئے اور اس نے نم آنکھوں سے سمعان کو وداع کیا۔

"کیوں روتی ہو؟ صرف چند دنوں کی تو بات ہے۔ نزہت آپی کی شادی ہو جائے تو بی جان سے ضرور تمہاری بات کروں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات ٹالیں گی نہیں۔" سمعان نے اس کے قدرے قریب جا کے ایک بات کہی اور اس کے کان میں پڑا بندہ بھی شرم سے دوہرا ہو گیا۔

"جلدی آنا سمعان! میں منتظر رہوں گی۔ اور ہاں! اپنا موبائل کبھی آف مت کرنا۔" مشال نے تاکید کی۔

"اور حکم میڈم جی!" سمعان نے چھیڑا۔

"اور کھانا وقت پر کھا لینا، وقت پر سونا اور مجھے خوب یاد کرنا۔" مشال کے لہجے کی شوخی سمعان کے دل میں کلیاں کھلا گئیں۔

اور اس طرح سمعان اسے کراچی چھوڑ کر کرن کے ہمراہ اپنے آبائی گاؤں آ گیا۔ جہاں پہ وہ ایک شوخ، چنچل اور رومینٹک سمعان سے پرے اک معتبر، رُتبے اور قدر والا، اہلِ سادات کے بگ وار فیوڈل کا وارث، سیّد سمعان شاہ تھا۔ جس کی حویلی کے اندر پوری برادری اور گاؤں کے تمام فیصلے تشکیل پاتے تھے جہاں پر مرید اپنی منتیں پوری کروانے آتے تھے۔ سمعان کے دادا پیر برکت علی شاہ کے بنے مزار پر لوگ چادریں چڑھاتے اور عقیدت کے پھول نچھاور کرتے تھے اور منتیں پوری ہو جانے کے بعد وہیں آ کے چڑھاوے اور دیگیں بانٹتے اور بکریاں ذبح کرتے۔

خاندان کی عورتوں کا پردہ اس قدر سخت تھا کہ ان کے گھر کی کسی بھی عورت کو بے پردہ باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ گھر میں ٹی وی پر پابندی تھی۔ شادی سے قبل بناؤ سنگھار کو برا مانا جاتا تھا اور اگر خواتین باہر جاتیں تو گاڑیوں میں پردے لگائے جاتے۔

اس طرح کے گھٹن زدہ ماحول میں عورتوں کی تعلیم گویا خواب ہی تھی، جسے سکندر شاہ کی چھوٹی بیٹی نزہت اور آذر شاہ کی اکلوتی کرن نے تعبیر کا روپ دیا۔ نزہت نے پرائیویٹ ایم اے کیا اور کرن نے انتہائی ضد کر کے سمعان کے ہمراہ کراچی میں جا کر پڑھنے کی ضد کی۔ جسے بی جان نے بڑی مشکلوں سے اپنے بیٹوں سے منوایا۔

خاندان کی زیادہ تر شادیاں بھی خاندان ہی میں طے پاتیں۔ سمعان کی دونوں بڑی بہنیں اپنی پھوپھی کی بہوئیں تھیں اور نزہت کی شادی اب کرن کے بھائی فراز شاہ سے طے ہونے جا رہی تھی۔ ابھی شادی کی تاریخ طے کرنے کے لئے حویلی میں جمع تھے۔ ہر کوئی منتظر تھا سکندر شاہ کا کہ وہ کون سی تاریخ مقرر کرتے ہیں۔

"ہاں سکندر شاہ! بولو کیا تاریخ سوچی ہے بچی کی تاریخ کی؟" یہ ان کی والدہ بی جان تھیں۔

"اماں سائیں! فیصلہ تو وہی ہوگا جو آپ چاہیں۔ لیکن ہم نے اور آذر شاہ نے مل کر پانچ ربیع الاول کی تاریخ سوچی ہے۔ چار پانچ ماہ بھی رہتے ہیں۔ شادی کی تیاری بھی ہو

جائے گی۔" سکندر شاہ نہایت ادب سے بولا۔

"لیکن سکندر شاہ! گھر ہی کی تو بات ہے۔ لڑکا بھی گھر کا اور لڑکی بھی۔ پھر اتنی دیر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میرا تو خیال ہے کہ ذی الحج کا چاند ہوتے ہوتے رخصتی کی جائے اور اس فرض سے بھی سبکدوشی حاصل ہو جائے۔" بی جان نے مشورے کے طور پر ہی اپنا فیصلہ سنایا۔

"تو پھر ٹھیک ہے بی جان!...... ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا؟ کیوں آذر شاہ!" سکندر شاہ نے کہا۔

"بے شک ادا سائیں! ہم تیار ہیں۔" آذر شاہ مسکرا دیا اور اس طرح چار ماہ بعد ہونے والی شادی اب دو ہی ماہ بعد طے پائی۔



"کتنے روکھے پھیکے بال ہو گئے ہیں تیرے کرن! تیل ویل کیا شہر میں نہیں ملتا؟" بی جان کرن کی لمبی سیاہ زلفیں بکھیرے اس سے مخاطب تھیں۔

"تیل تو ملتا ہے لیکن وہاں پر میری پیاری بی جان کے نرم نازک ہاتھ نہیں ملتے ناں۔" کرن نے بی جان کے جھریوں سے بھرے ہاتھ آگے کر کے چوم لئے۔

"چل، چل رہنے دے۔ اتنا ہی پیار ہوتا تجھے اپنی بی جان سے تو شہر سے جلدی ملنے نہ آ جاتیں؟ کیوں اتنا انتظار کرواتیں؟" بی جان انتہائی مہارت سے اپنی انگلیاں چلاتے ہوئے بولیں۔

"اتنی ٹف پڑھائی ہے بی جان! اور پھر شہر کوئی پڑوس میں تھوڑی ہے۔ سمعان کو تو بالکل یاد ہی نہیں رہتا یہاں آنا۔ وہ تو میں ہی اسے گھسیٹ کے لاتی ہوں۔"

"یہ سمعان بھی ناں...... ابھی تک بڑا نہیں ہوا۔ اس کے لئے بھی کسی رسّی کھینچنے والی کا انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ تب عقل آئے گی اس کو۔" بی جان نے کہا۔ کرن کو بھی موقع اپنے دل کی بات کہنے کے لئے موزوں محسوس ہوا۔

"ایک بات کہوں بی جان! آپ برا تو نہیں مانیں گی؟"

"کہو بیٹا! اگر بات صحیح ہوگی تو میں برا کیوں مناؤں گی؟"

"بی جان! میں...... میں سمعان...... سمعان کو پسند کرتی ہوں۔" وہ اٹک اٹک کر بولی۔ بے شک بی جان سے اس کی محبت دوستی نما تھی لیکن جھجک بہرحال تھی۔ بی جان کے ہاتھ اس کے بالوں میں چلتے چلتے رک گئے۔ وہ کچھ سوچنے لگ گئیں۔

"کیا ہوا بی جان! میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟" کرن نے مڑ کے بی جان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"نہیں، تم نے کچھ غلط نہیں کہا۔ لیکن یہی بات جو سالوں سے ہمارے دل میں تھی، ہم کو کہنی چاہئے تھی۔ تمہارے منہ سے یہ سن کے پتہ نہیں کیوں، اچھا نہیں لگا۔" بی جان سنجیدگی سے بولیں۔ "یہ ہم نے بہت پہلے ہی سوچ رکھا تھا اور تمہارے یونیورسٹی چلے جانے کے بعد تو دل جیسے مچلنے لگ گیا کہ ہم کو جلد از جلد کوئی فیصلہ کر لینا چاہئے۔ تم شہر اتنی دور اگر اپنے محرم کے ساتھ رہو تو شاید ہماری ساری فکریں دور ہو جائیں گی۔ ہم کل ہی سکندر شاہ سے بات کریں گے اور فراز شاہ کے ہمراہ تمہارا نکاح بھی پڑھوا دیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔" بی جان کا لہجہ ٹھوس تھا۔ کرن نے مشال کے بارے میں بی جان کو بتانا مناسب نہ سمجھا اور اپنا سر چپکے سے ان کی گود میں ٹکا لیا۔

وہ لان میں کھڑی پودوں میں پانی لگا رہی تھی کہ جب سمعان سفید کرتے شلوار میں ملبوس اس طرف سے گزرا۔ وہ یونیورسٹی والے سمعان سے کتنا مختلف لگتا تھا۔ حویلی آ کر اس کی چھب کتنی بدل جاتی تھی۔

"سمعان!" اس نے تیز رفتاری سے جاتے دیکھ کر آواز دی اور اس کے آواز دینے پر سمعان کے قدم رک گئے۔ وہ مڑا۔ اس نے کرن پر نظر ڈالی اور اس کی طرف آ گیا۔

"ہاں بولو، کیا بات ہے؟ کیوں بلایا ہے؟"

"حویلی آ کے تو تم پہچاننا بھول جاتے ہو۔ پوچھنا یہ تھا کہ واپسی کا کیا پروگرام ہے؟" وہ مسکرائی۔

"بابا سائیں کے ساتھ ابھی مجھے زمینیں دیکھنے جانا ہے۔ سوچ رہا ہوں آج شام ہی نکل جاؤں۔ تم چاہو تو رہ سکتی ہو۔ بعد میں فراز شاہ کے ساتھ آ جانا۔" سمعان نے عجلت میں کہا۔

"تمہیں کیا جلدی ہے سمعان؟ اگر تم بھی رک جاتے تو پڑھائی کا کوئی اتنا حرج تو نہیں ہو جاتا۔" کرن نے ذو معنی لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ لیکن جس مقصد کے لئے میں یہاں آیا تھا، وہ تو پورا ہو ہی گیا۔" سمعان کے چہرے پر دھوپ کی کرنیں چمک کر گلابی رنگ دوڑا جاتیں۔

"یہ کہو ناں سمعان! کہ مشال کی یاد آ رہی ہے۔" کرن کے یہ کہنے پر سمعان بے تاثر چہرہ لئے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ نہ ڈر کا اور نہ پکڑے

جانے کے احساس کا۔

"ویسے جانتے ہو آج کل ہمارے گروپ میں کون سی بریکنگ نیوز چل پھر رہی ہے؟" کرن نے پانی کے پائپ کے ساتھ ساتھ بات کا بھی رخ موڑا۔

"کون سی؟" وہ اسی سوبرٹی سے بولا۔

"شاہ زیب اور مشال کی محبت کی۔" کرن محبت پر زور دے کر بولی۔

"کیا؟" اب کے سمعان کے چہرے پر ایک تاثر اُبھرا۔

"ہاں۔ چاہو تو پوچھ لینا کسی سے۔ ہر کسی میں یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ شاہ زیب مشال میں انٹرسٹڈ ہے۔ مجھے خود بتایا تھا شاہ زیب نے۔" کرن تیقن آمیز لہجے میں بولی۔

"کرن! میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔ اور اگر ایسا کچھ ہوگا بھی تو مشال کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ وہ ایسی فضول لڑکی نہیں ہے۔" سمعان ٹھوس انداز میں بولا۔

"تو میں نے کب کہا کہ وہ کوئی فضول لڑکی ہے۔ میں نے تو صرف اس کے شاہ زیب سے افیئر کی........"

"شٹ اپ کرن! اپنی زبان سنبھالو۔" سمعان اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"تمہیں میری بات پر خود بہ خود یقین آ جائے گا سمعان! میں تمہیں یقین کرنے پر مجبور نہیں کر رہی۔ وقت خود تمہیں ثبوت دے دے گا۔" کرن نے پائپ پھینک دیا اور تیز رفتاری سے حویلی کے صدر دروازے سے اندر چلی گئی۔ اپنے پیچھے مضطرب سے سمعان کو تنہا چھوڑ کر۔ جسے اپنی محبت پر اعتبار تو تھا مگر پھر بھی وہ مرد تھا، اپنی محبت، اس کے تقدس کے متعلق بہت ہی روایتی........ پر جڈس........

اس نے اپنے کُرتے کی سائیڈ والی جیب سے اپنا موبائل نکالا اور ہاسٹل کے نمبرز پش کیے۔ کچھ ہی لمحوں میں وہاں سے فون اٹھایا جا چکا تھا۔

"روم نمبر 142 سے مشال احمد کو بلا لیجئے ذرا۔" سمعان بولا۔ کچھ دیر فون ہولڈ پر رکھا گیا اور یہ کچھ دیر سمعان پر کچھ برسوں کی طرح سخت گزری۔ سردیوں کی کومل دھوپ اسے اپنا آپ جلاتی محسوس ہوئی۔

"مشال احمد اپنے روم میں موجود نہیں۔ آپ بعد میں فون کیجئے گا۔" دوسری طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔

سمعان نے بے ارادہ ہی شاہ زیب کے سیل نمبرز پش کیے اور دوسری ہی بیل کے بعد شاہ زیب کی پُر جوش آواز گونجی۔

"ہیلو سمعان! کیسے ہو یار؟ ہم لوگ تجھے بڑا یاد کر رہے ہیں۔ کب آ رہے ہو واپس؟"

"اور کون کون یاد کر رہا ہے مجھے؟" سمعان نے یونہی کہا۔

"ہم سب ہی...... میں، مشا، کجل، کویتا، ندا اور سب۔ ویسے اس وقت مشال میرے ساتھ ہے۔ بات کرو گے اس سے؟" شاہ زیب نے کھلکھلا کے کہا اور سمعان کے دل میں اُگی شک کی کونپل ذرا سی جنبش میں آئی اور اگلے ہی پل ایئر پیس میں مشال کی آواز گونجی۔

"کیسے ہو سمعان؟"

"تم شاہ زیب کے ساتھ کیا کر رہی ہو؟" بے اختیار ہی پوچھا گیا۔

"ہاسٹل میں یونیورسٹی میں اکیلے رہ رہ کے بور ہو رہی تھی ناں۔ تمہاری بھی بہت یاد آ رہی تھی۔ تو شاہ زیب نے کہا کہ چلو لنچ کر کے آتے ہیں۔ تو میں آ گئی۔ ویسے تمہاری غیر موجودگی میں شاہ زیب نے بہت سہارا دیا ہے۔" مشال کھلکھلا کے بولی۔ سمعان کے دل پر ایک اور ضرب لگی۔

"تم کب سے سہارے ڈھونڈنے لگی ہو مشال؟" ایک مضطرب سا، اُلجھا سا سوال۔

"کیا مطلب سمعان؟ تم کچھ ڈسٹرب لگ رہے ہو۔" مشال کی محبت نے مزاج آشنائی کا روپ دھار لیا۔ سمعان نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ غلط خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی سعی کی۔

"میرا مطلب ہے تم جیسی اسٹرانگ لڑکی کو کب سے سہاروں کی ضرورت پڑ گئی؟"

"سمعان! تم ہی تو کہتے ہو کہ میں باہر سے جتنی بھی بہادر بننے کی کوشش کروں، اندر سے میرا دل ایک چڑیا کی طرح ہے۔ اور جانتے ہو یہ چڑیا تمہارے پنجرے میں قید ہو چکی ہے۔" مشال نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ سمعان کا دل قدرے ہلکا ہو گیا۔

"اگر چڑیا میری قید میں ہے تو میری جان بھی تو اسی چڑیا میں ہے۔ اور اگر کسی نے یہ چڑیا چھین لی تو میری سانسیں اسی وقت ختم ہو جائیں گی۔" سمعان کے دل کی کیفیت اب بھی گومگو تھی۔

"کوئی تو پرابلم ہے سمعان! اس قدر اُلجھی بکھری باتیں کیوں کر رہے ہو؟ اور اب کتنے دن رہنا ہے وہاں؟ جلدی آ جاؤ ناں۔" مزاج آشنا دل پھر دھڑکا۔ "میں کتنی تنہا ہوں یہاں پر۔ کتنی اکیلی۔ پلیز سمی! کم بیک سُون۔" محبت التجائی تھی۔ سمعان کے ہونٹ مسکرا اُٹھے۔ پل بھر میں اُسے تمام خدشے، تمام باتیں غلط لگنے لگ گئیں۔

"آج رات تک پہنچ جاؤں گا۔ کل صبح یونیورسٹی میں ملاقات ہو گی۔" فون بند ہو چکا

تھا۔ سمعان کی آواز ختم ہو چکی تھی لیکن اس کا وجود اب مشال کو اپنے اردگرد محسوس ہونے لگا۔ وہ شاہ زیب کے ہمراہ ہوتے ہوئے بھی نہ تھی۔ سمعان کے وجود کے ہیولے، اس کے تصور کے ہمراہ تھے۔ اس کی محبت کی قید میں چڑیا کی طرح تھی۔ لیکن پھر بھی خوش تھی، پھر بھی مطمئن تھی۔



وہ یونیورسٹی پہنچا تو ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر ہی اپنے گروپ کو کھلکھلاتے ہنستے دیکھ لیا اور تیزی سے قدم بڑھاتا ان تک آیا۔ وہ بھی سمعان کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ سعد تو فوراً سے بھی پہلے اُٹھ کر بغل گیر ہو چکا تھا۔

"کیا یار! اتنے دن لگا دیئے۔ کتنا مس کیا ہم نے تم دونوں کو۔ یہ کرن کہاں ہے؟" سعد نے کہا۔

"میں تو کل رات ہی واپس آ گیا تھا۔ البتہ کرن کی مرضی ہے، جب آ جائے۔ جانتے تو ہو گے ان لڑکیوں کو تم سعد! دادیوں، نانیوں، پھوپھیوں، ماسیوں، خالہ زاد، تایا زاد، چچا زاد اور بقایا دور پار کے رشتوں کے لئے کتنی پاگل ہوتی ہیں۔ ایک بار مل جائیں تو چھوڑتی نہیں۔" سمعان کے کہنے پر لڑکیاں بول اُٹھیں۔

"ہاں، تو ہم آپ لڑکوں کی طرح سخت و جامد دل لے کر پیدا نہیں ہوتیں۔ ہماری فیلنگز بہت اچھی، بہت نرم ہوتی ہیں۔" ندا نے احتجاج کیا۔

"اوئے صدقے جاواں۔" سعد نے چیخ ماری۔

"یہ مشال اور شاہ زیب نہیں دکھائی دے رہے۔" سمعان کی نظروں کو اب تک وہ گوہر دکھائی نہیں دیا تھا۔

"یار سمعان! تُو واقعی کا پیر ہے۔ وہ دیکھو، شاہ زیب اور مشال اسی طرف آ رہے ہیں۔" سعد کے کہنے پر سبھی ہنس دیئے اور سمعان نے مڑ کر دیکھا۔ پرنٹڈ پنک کلر کے شیفون کے سوٹ میں بالوں کی اُڑتی لٹ کو کانوں میں اڑستی، مسکراتی مشال اور کتابوں کو تھامے فخر سے چلتا آ رہا شاہ زیب۔ سمعان کے دل کی دھڑکنوں کی رفتار نہ چاہتے ہوئے بھی بڑھ گئی۔ سانسوں میں انتشار سا بپا ہونے لگا۔

"ارے سمعان! کیسے ہو یار؟" شاہ زیب نے اسے دیکھتے ہی اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور مشال کا تازگی سے بھرا چہرہ ایک رونق لئے جگمگا اٹھا۔ اتنے دنوں سے جس کا انتظار تھا، وہ آخر نظر آ ہی گئی تھی۔

''میں تو ٹھیک ہوں۔تم دونوں سناؤ۔آج ایک ساتھ کیسے آگئے؟'' اس نے اپنے اند
کے اشتعال کو دبوچنے کی کوشش کی۔

''یونیورسٹی گیٹ تک آیا تو پتہ چلا کہ محترمہ مشال احمد کے نازک سے پاؤں میں جو
ہونے کے باوجود کانٹا چبھ گیا ہے اور پاؤں میں موچ بھی آگئی ہے اور ایسے میں ان کو اکیلا
چھوڑ آنا، اصولِ دوستی کے خلاف تھا۔سو ان کا کانٹا نکالا، جوتا صاف کیا اور انہی کے ساتھ
ست رفتاری سے آتا رہا۔'' شاہ زیب کی داستان گوئی سے سبھی کو لطف آتا تھا۔پل بھر کو سبھی
مشال کے پاؤں کی طرف متوجہ ہوئے جہاں پنک پتلی سی پٹی والے جوتے کے ساتھ ساتھ
کانٹا چبھنے کا نشان بھی تھا۔قدرے سرخی مائل دھبہ۔

''درد تو نہیں ہو رہا مشال؟'' سمعان نے فکرمندی سے پوچھا۔مشال نے اس کی
طرف دیکھتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔

''اب سارے درد مٹ گئے ہیں۔'' دل سے ایک آواز اُٹھی۔

''یار! تم لوگ اپنی اپنی باتوں سے فارغ ہو جاؤ۔پھر میں ایک بمباسٹک نیوز سناتی
ہوں۔'' ندا نے ان سب کو متوجہ کیا۔

''تم نے شاہ زیب کا کام کب سے سنبھال لیا۔نیوز ریڈر کا؟'' سعد نے ٹکڑا لگایا۔ندا
نے اسے نظرانداز کر کے بات کی۔

''فرینڈز! آپ سب کو میں اس سنڈے اپنی منگنی پارٹی پر انوائٹ کرنا چاہتی ہوں۔''
ندا نے بڑی ادا سے کہا۔سبھی حیران ہوئے۔آوازیں، سوال، اشارے۔سبھی کو اس واقعے
کے دھماکے پر حیرت تھی۔

''انگیج منٹ......مگر کس سے؟'' کویتا نے کہا۔

''عمر سے......اور کس سے؟'' ندا بے پروائی سے بولی۔

''وہی عمر جو ہمارے ساتھ ٹور پر چلا تھا؟'' شاہ زیب کے سوال پر ندا نے حامی بھری۔

''مگر کیسے، کب طے ہوئی؟'' سعد نے سوال کیا۔

''دوستو! میں نے تم لوگوں سے جھوٹ کہا تھا۔عمر میرا کزن نہیں، میرا بلوڈ تھا۔چار
سال پہلے ہم دوست بنے تھے۔میں نے بڑی مشکل سے پاپا کو منایا۔مما تو میرے ساتھ
تھیں۔خیر ہماری منگنی طے ہوگئی ہے اس سنڈے کو۔کوئی فارمل فنکشن نہیں، بس رسم ہے۔''
ندا نے تفصیل بتائی۔سبھی خوش ہوئے۔

''یار! ایہہ گڈی وی ہتھوں گئی......لگتا ہے ساری عمر کنوارا ہی رہنا پڑے گا، یا پھر اپنی

اکنامکس پروفیسر مس شہلا سے شادی کرنی پڑے گی۔وہ بھی بے چاری میری طرح کنواری
ہے۔'' سعد نے دُکھ سے دہائی دی۔

''باز آجاؤ سعد!'' ندا نے اسے گھورا۔سبھی مسکرا دیئے۔



''کس طرح منا لیا تم نے اپنے پاپا کو ندا؟ تمہیں تو بہت ڈر تھا ناں ان کا۔'' مشال
کے کہنے پر ندا کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ اُبھرا۔

''پتہ نہیں یار! کس طرح منا لیا......بس یہ ہے کہ ہمت نہیں ہاری۔اور پھر اگر حوصلہ
ہو تو وہ یہ نہیں پوچھتا کہ پتھر کی دیوار کتنی بڑی ہے۔'' ندا کی آنکھوں سے اس کا حوصلہ چھلک
رہا تھا۔

''کتنی خوش ہو رہی ہو گی ناں تم، اپنی محبت کی تکمیل پر۔ایک نئے رشتے کی ابتداء اپنے
من چاہے ہم سفر کے ساتھ کرنے پر۔ایک آدھے ادھورے رشتے سے نجات پانے پر۔''
مشال کے لہجے کی اُداسی کو ندا نے پہچان لیا۔

''آدھا ادھورا رشتہ؟......میں سمجھی نہیں۔''

''ہاں ندا! محبت دنیا کا سب سے خوب صورت رشتہ ہونے کے باوجود بھی ایک آدھا،
ادھورا رشتہ ہی ہوتا ہے۔یہ بندھن، یہ ناتا ایک بے نام سا ناتا ہے۔سمعان، کرن کے
ساتھ بے خوف ہو کے چل سکتا ہے لیکن میرے ساتھ نہیں۔چند لوگوں کی بھیڑ میں مجھ سے
یہ بات کرتے ہوئے کتراتا ہے۔مصلحت کوشی کے پردے کے پیچھے چھپ کے۔یہ مصلحت
کوشی کیا ہے؟ یہی محبت کا آدھا ادھورا پن ہے۔کوئی رشتہ بے نام نہیں ہونا چاہئے ندا!
رشتوں کے لئے نام کی بیساکھی ہونا بے حد ضروری ہے ورنہ وہ لولے لنگڑے ہی رہتے
ہیں۔'' مشال کے کہنے پر ندا خاموش ہوگئی۔

''تو پھر بنا لو سمعان کو اپنا منگیتر یا کچھ بھی۔اور ختم کرو اس آدھے ادھورے پن کو۔''
ندا نے فوراً کہا۔

''کیسے کر دوں ختم ندا! آج کل پتہ نہیں سمعان کو کیا ہو گیا ہے...... جب سے اپنے
گھر سے لوٹا ہے، بہت اُلجھا اُلجھا سا لگتا ہے۔خفا خفا سا۔پتہ نہیں کیا مسئلہ ہے۔پوچھوں تو
بتاتا نہیں۔مجھے بھی پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔منتشر سی باتیں کرتا ہے۔ملنے سے کتراتا
ہے۔پتہ نہیں بات کیا ہے۔'' مشال کی ذہنی کیفیت اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

''تم اس سے ملنا یا بات کرنا ختم مت کرو۔اس کے زیادہ نزدیک ہونے کی کوشش

کرو۔ اس کی پرابلم بانٹو۔ ہوسکتا ہے وہ کسی اُلجھن کا شکار ہو۔ اُسے یوں اکیلا تو نہ چھوڑو تم۔" ندا نے اسے سمجھایا اور مثال نے قدرے ریلیکس ہو کر گردن اثبات میں ہلا دی۔



ندا کی منگنی کے لئے سبھی نکلنے والے تھے۔ سمعان نے مثال کو ہاسٹل فون کیا۔

"کس کے ساتھ جا رہی ہو تم مثال؟"

"سمعان! میں اور کرن ساتھ نکلیں گے۔ شاید رکشہ ہی پکڑ لیں۔" مثال نے کہا۔

"رکشہ پکڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں اپنی گاڑی لے کر آتا ہوں۔" سمعان نے کہا۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں سمعان! لیکن کرن بازار گئی ہے۔ پتہ نہیں کب آتی ہے۔ اور اسے اکیلا چھوڑ کے جاؤں گی تو وہ ناراض ہو جائے گی۔ اسے ندا کے لئے گفٹ لینا تھا۔ ایسا کرو تم چلے جاؤ۔ ہم آ جائیں گے۔ وہیں پر ملاقات ہوگی۔" مثال نے اپنی بات مکمل کی۔

"چلو او کے۔ وہیں پر ملتے ہیں۔" سمعان نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

اور پھر مثال کو انتظار کرتے کرتے ایک گھنٹہ گزر گیا مگر کرن کی واپسی نہ ہوئی۔ منگنی کا وقت ہونے والا تھا مگر کرن کا کوئی پتہ نہ تھا۔ کرن خود تو نہ آئی مگر اس کا فون آ گیا۔

"مثال! میں ندا کے گھر سے بول رہی ہوں۔ اصل میں شاپنگ کرتے کرتے اتنی لیٹ ہو گئی ناں کہ سوچا اب سیدھا ادھر ہی آ جاؤں۔ میں نے سوچا تم بھی نکل گئی ہو گی۔" کرن نے بہانہ گھڑ لیا تھا۔

"لیکن کرن! میں تو تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ سمعان نے گاڑی لانے کا کہا تھا لیکن میں نے منع کر دیا۔ اب میں کیسے آؤں؟" مثال کا غصہ یقینی تھا۔

"آئی ایم سو سوری یار! ایسا کرو شاہ زیب کے سیل پر فون کرو۔ باقی سب تو پہنچ چکے ہیں، وہی نہیں آیا۔ اس کے ساتھ آ جاؤ یا پھر کوئی رکشہ وغیرہ پکڑ لو۔"

کرن کی تجویز سن کر اس نے فون بند کر دیا اور پھر اگلے ہی لمحے وہ شاہ زیب کے موبائل نمبرز پش کر چکی تھی۔

تقریباً پندرہ ہی منٹ میں شاہ زیب اپنی موٹر بائیک کے ہمراہ موجود تھا۔ وہ فوراً بیٹھی اور دونوں ندا کے گھر کی جانب چل دیئے۔



"ارے کرن! مثال کہاں ہے؟ اسے تمہارے ساتھ آنا تھا ناں؟" سمعان نے کرن کو پارٹی میں چلتے پھرتے دیکھا تو پوچھ بیٹھا۔

"ہاں، آنا تو تھا۔ پر پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ مثال بولی کہ تم چلی جاؤ، میں شاہ زیب کے ساتھ آ جاؤں گی۔ آتی ہی ہو گی ابھی۔" کرن یہ کہہ کے آگے بڑھ گئی اور سمعان کا دل سراپا سوال بن گیا۔ اس کے ذہن میں مثال کے الفاظ گونجنے لگے۔

"میں کرن کو اکیلا چھوڑ کے کیسے آؤں؟ ایسا کرو، تم چلے جاؤ۔" اور یہ بازگشت اسے بے چین کر رہی تھی۔ وہ دوبارہ سے اسی اشتعال و انتشار میں گھر رہا تھا۔ یہ سارے ثبوت محبت کے خلاف تھے مگر محبت پھر بھی منکر تھی۔ اگر شاہ زیب کی موٹر بائیک اسے متوجہ نہ کرتی، اس نے دیکھا تو شاہ زیب مثال کو اپنے پیچھے بٹھائے موٹر بائیک پر آ رہا تھا۔ کونے میں بائیک کھڑی کر کے دونوں ہم قدم چلتے ہوئے جا رہے تھے اور سمعان کو شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔ احساسِ توہین اس قدر تھا کہ سانس لینا اسے دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ جس چڑیا میں اس کی جان تھی، وہ چڑیا اسے دور اُڑتی ہوئی، کھوئی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے محفل کی روشنیوں میں اپنی فیلنگز چھپانا کس قدر کٹھن لگ رہا تھا۔ بے وفائی کے وسوسے اس کے دل میں جاگ رہے تھے۔

وہ چراغِ جاں کبھی جس کی لو نہ کسی ہوا سے نگوں ہوئی
تیری بے وفائی کے وسوسے اسے چپکے چپکے بجھا گئے

محفل میں باقی وقت یوں تو مثال اسی کے ہمراہ رہی۔ ہنستی بولتی ہوئی۔ لیکن وہ اس کے ہمراہ نہ تھا۔ وہ تو احساسِ گمشدگی کے بوجھ تلے اپنی سانسیں اور دل کی دھڑکنیں سمیٹ رہا تھا۔

"یار! یہ گڑ گھو بھی اتنی پیاری گڑیا سی لڑکی لے اُڑا۔" سعد نے کہا۔

"یہ گڑ گھو اسی گڑیا کی پسند ہے۔ غور فرمانا۔" شاہ زیب نے اسٹیج پر فخر سے بیٹھے عمر اور ندا کی طرف دیکھ کے کہا۔

"ہاں یار! ایک اپنی ہی قسمت خراب ہے۔" سعد کی ٹھنڈی آہ پر شاہ زیب نے اسے پیٹھ پر دھپ ماری۔

ساری محفل جاندار تھی۔ بس اِک سمعان ہی گویا بے جان تھا۔

اور پھر اِک خوش قسمت سے لمحے میں ندا کی انگلی میں عمر نے ایک پیارا سا فرشتہ اور اس نام والا رشتہ ڈال دیا۔



"تمہیں کیا ہو گیا ہے سمعان! تم کیوں مجھ سے اتنے خفا رہنے لگے ہو؟" دو دن

سمعان کی خفگی برداشت کرنے کے بعد آخر مشال نے پوچھ ہی لیا اور سمعان کی خاموشی اسے مزید ڈسٹرب کرنے لگی۔

"کم آن سمعان! کیوں اتنا بدل گئے ہو تم؟"

"میں بدل گیا ہوں؟........ میں بدل گیا ہوں مشال؟........ میرا تو خیال ہے کہ تم بدل گئی ہو۔ مجھے وقت نہ دینا، اگنور کرنا، میری ہر بات کا گول مول سا جواب دینا، مجھے لگتا ہے کہ میں تمہاری زندگی کا ایک غیر ضروری حصہ ہوں۔" مشال کی زندگی کے سب سے ضروری حصے نے انتہائی کرختگی سے کہا اور وہ گنگ سی اسے دیکھے گئی۔

"یاد رکھو مشال! میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن جھوٹ اور دھوکا بازی نہیں۔ سانسوں میں آگ لگ جاتی ہے جب تم مجھ سے جھوٹ بولتی ہو۔" وہ مشتعل سا بولا۔

"کیا جھوٹ بولا ہے میں نے تم سے سمعان! یہی کہ میں اس دن کرن کا انتظار کر رہی تھی........ یا یہ کہ کرن مجھے چھوڑ کے بازار گئی تھی اور مجھے اپنا انتظار کرنے کا کہہ گئی تھی۔ تمہارے فون آنے کے گھنٹے بعد مجھے کرن نے ندا کے گھر سے فون کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ میں رکشہ پکڑ کے آجاؤں۔" اس نے اپنے تئیں صفائی دینے کی کوشش کی۔

"تو رکشہ پکڑ کے آجانا تھا۔" سمعان قدرے اونچی آواز میں چلایا اور مشال کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس کے سینے میں دھڑکتا ننھا سا دل زور سے سہا۔ اس کے سامنے وہی شخص تھا، جو اس سے محبت کا، اعتبار کا دعویٰ کرتا تھا اور وہی شخص اس وقت کتنے اجنبی پن سے مخاطب تھا۔

"تمہیں اس بات پر اعتراض ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں گئی یا اس بات پر ہے کہ میں شاہ زیب کے ساتھ کیوں آئی؟" مشال دھیمے انداز میں ہی سہی، اس کے دل کا بھید جان چکی تھی۔

"ایک ہی بات ہے مشال!" وہ تڑپا۔

"بات ایک ہی نہیں ہے سمعان! کیا تمہارے دل میں شاہ زیب کو دیکھ کر ان سکیورٹی ہے؟ ہاں بولو، بے اعتباری ہو گئی ہے مجھ پر ایک ٹپیکل فیوڈل لارڈ کی طرح؟ بولو سمعان!" وہ اسے جھنجوڑ رہی تھی۔ اب وہ خاموش تھا۔

"اپنی عزت اور انا کا سرٹیفکیٹ بنا کے مجھے تجوری میں بند کر کے رکھنا چاہتے ہو۔ بڑا دعویٰ تھا ناں تمہیں اعتماد کا۔ یہ حد تھی تمہارے اعتبار کی؟ یہ سرحد تھی تمہارے یقین کی؟" اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ آسمان پر ٹھہرے بادل ایک دوسرے سے ٹکرائے، اک

گونج اٹھی گرج کی۔

"تم سے یہ اُمید نہ تھی مجھے سمعان شاہ! بے اعتباری بھی کی تو مجھ پر۔" وہ نم آنکھیں لئے کتنی دیر اس کے چہرے کو دیکھتی رہی، پھر مڑ گئی اور تیز تیز قدم اٹھا کے جانے لگی۔

"رُکو مشال! میری بات سنو۔" وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ لیکن وہ اس کی ہر بات کو نظر انداز کرتی یونیورسٹی گیٹ پھلانگ چکی تھی۔



"پرسوں جانے کا پروگرام تھا لیکن حویلی سے بی جان اور بابا سائیں کے اتنے فون آئے کہ آج ہی جا رہی ہوں۔" کرن اپنا سامان پیک کر رہی تھی اور مشال اپنے بیڈ پر نیم دراز ہاتھ میں کتاب تھامے گم صم سی تھی۔

"سمعان تو پرسوں ہی آئے گا۔ شادی میں تو ابھی ایک ہفتہ ہے۔ بس بی جان چاہتی تھیں کہ میں اپنے پیارے بھائی کی شادی کی تیاری میں حصہ لوں۔ تم آؤ گی ناں مشال؟" وہ کپڑے ڈالتے ڈالتے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اسی طرح غیر مرئی نقطے پر آنکھیں لگائے کچھ سوچے گئی جیسے کہ وہاں نہ ہو۔

"مشال! کچھ پوچھا ہے تم سے۔" کرن نے چٹکی بجا کے اسے متوجہ کیا۔

"ہوں........ ہاں........ بولو۔" وہ چونکی۔

"میں پوچھ رہی ہوں، آؤ گی ناں ادا فراز کی شادی پر؟ کارڈ سمعان دے دے گا۔"

"کوشش کروں گی۔" ٹالنے کی ایک کوشش تھی۔

"کوئی کوشش ووشش نہیں۔ آنا پڑے گا تمہیں۔ ندا، کویتا، تجل، سعد، شاہ زیب سبھی آئیں گے۔ تم کیسے نہیں آؤ گی؟ آ کے ہماری حویلی کی شادی کی رونق تو دیکھنا۔" کرن نے آنکھوں میں اس رونق کا تصور لا کر کہا۔ مشال اس کی جانب خالی خالی نگاہوں سے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔

اور اگلے ہی دن یونیورسٹی میں سمعان سبھی کو کارڈ دینے لگا اور آنے کی تاکید کرنے لگا۔ مشال قدرے دور بیٹھی اپنے نوٹس بنانے میں مصروف تھی کہ جب وہ اس کے پاس آیا۔ اس ان کی تلخ کلامی کے بعد یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔

"مشال! بات نہیں کرو گی مجھ سے؟" غصے کی گرد ڈھل جانے کے بعد سمعان کو اپنا آپ ہی گناہ گار محسوس ہوا تھا۔ مشال نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

"میں نے مانا، میں نے بہت غلط کیا تمہارے ساتھ۔ لیکن تمہاری اس قدر ناراضگی میری جان لے کے چھوڑے گی۔ میں نہیں زندہ رہ سکتا تمہارے بغیر۔" وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور انتہائی محبت سے بولا۔

"پلیز مشال! معاف کر دو مجھے۔ پلیز!" اس کی اتنی لجاجت کے بعد مشال نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا اور گویا پچھلے دنوں کا سارا غم اور سارا غصہ آپ ہی آپ ختم ہونے لگا۔

"وعدہ کرو، آئندہ ایسی بات نہیں کرو گے۔" اس نے وارننگ دی۔

"پکا وعدہ۔ آئی ایم سوری۔" سمعان نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور وہ مسکرا دی

"یہ لو تمہارا کارڈ۔ ضرور آنا۔ بی جان سے ملوانا ہے تمہیں۔ اور اس بار کم از کم بی جان کی رضامندی لے کر چھوڑنی ہے۔" سمعان نے اسے کارڈ دیا اور وہ سمعان کی بات پر بلش ہی تو ہو گئی تھی۔



سادات حویلی میں ایک نیا شور اُٹھا تھا۔ سمعان اور کرن کے نکاح کا جو کہ جتنی اچانک طے ہوا تھا، اتنی ہی اچانک ہو بھی رہا تھا۔ اور پھر مضبوط حصاروں والی اس حویلی کے تقریباً سبھی فیصلے اسی طرح ہوتے تھے۔ اتنی اچانک کہ پتہ ہی نہ چلتا تھا اور اتنی آہستگی سے کہ خود حویلی کے مکینوں کو ہی خبر نہ پڑتی۔

کرن حویلی پہنچی تو حویلی کی لڑکیوں نے اس کا سواگت کیا اور اسے اس نئی خبر کے متعلق بتایا اور وہ حیران سی ہر کسی کے چہرے کو تکتی رہی۔ دل اس اچانک ہی آئے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے سے خوش تو تھا لیکن بے یقینی بہر حال تھی۔

سمعان خود اس فیصلے سے بے خبر تھا اور پھر ویسے بھی حویلی کے فیصلہ کرنے والوں کی نظر میں بچوں کی رائے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ تو خود اپنے بچوں کی تقدیریں چنتے تھے اور ان کے بچوں کو ان کی چنی ہوئی تقدیروں اور ان تقدیروں کی کھینچی ہوئی لکیروں پر تاعمر چلنا ہوتا تھا۔

اور پھر جب کرن نے بی جان سے یہ سوال کیا کہ سمعان کو خبر بھی نہیں، کہیں وہ اس فیصلے پر اختلاف نہ کرے تو بی جان گویا غصے میں آ گئیں۔

"کیسے کر سکتا ہے سمعان شاہ اعتراض اس فیصلے پر۔ یہ فیصلہ میرا کیا ہوا ہے، اس کے والد کا کیا ہوا ہے اور ہمارے فیصلے بدلا نہیں کرتے کرن!"

"لیکن بی جان! وہ لڑکا ہے....... وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔" کرن نے کہا۔

"ہمیں اس بات کا یقین ہے کرن کہ ہمارے خاندان کے لڑکے تم لڑکیوں سے زیادہ باکردار ثابت ہوئے ہیں۔ بس یہ طے ہو چکا ہے کہ فراز شاہ کی رخصتی کے اگلے ہی دن تمہارا نکاح ہوگا اور عنقریب ہی رخصتی۔" بی جان فیصلہ کن لفظوں میں جواب دے کر بات ختم کرنے کی عادی تھیں اور مجبوراً کرن کو بھی چپ ہو جانا پڑا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر سمعان نے کوئی حرف اعتراض اُٹھایا بھی تو بی جان اسے چپ کرا دیں گی۔ لیکن پھر بھی اس کے دل کے اندر مشال کی محبت کی صداقت کا جو ایک ہلکا سا خوف تھا، وہ اپنی جگہ زندہ تھا، ثابت تھا۔

سمعان جہاں شادی سے دو دن پہلے پہنچنے والا تھا، وہاں طبیعت کی خرابی کے باعث شادی سے ایک ہی دن قبل اپنے گروپ کے تمام دوستوں کے ہمراہ ہی پہنچ سکا۔

یوں تو بابا سائیں، بی جان اور اس کی والدہ اس کی غیر حاضری پر بہت خفا تھیں لیکن اس کی طبیعت کی ناسازی کا سن کے ساری خفگی بھول گئیں۔

سمعان نے مشال سمیت سبھی کو بی جان اور امی جان سے ملوایا اور ان سبھی کو گھر کے لوگوں ہی کی طرح لیا گیا۔ ہر طرف قہقہے بکھر رہے تھے۔ نوجوان لڑکیاں اتنے دنوں بعد ملی تھیں تو شرارتوں اور مسکراہٹوں کا کبھی نہ رُکنے والا سلسلہ شروع تھا۔

پوری حویلی پھولوں اور روشنیوں سے سجی تھی۔ ہر طرف رنگ تھے، جگمگاہٹیں تھیں۔

مہمانوں کو علیحدہ کھانا دیا گیا۔ سمعان بھی انہی کے ساتھ ساتھ تھا۔ کھانے کے بعد اوپری منزل پر بنے پورشن والے دو کمروں میں ان کے رہنے کا انتظام بی جان نے کروایا تھا۔ ایک کمرہ سعد اور شاہ زیب کو دیا گیا تھا اور اس کے عین سامنے والا کمرہ مشال، کویتا، ...ل اور ندا کو۔

سمعان کو بی جان نے طلب کیا تھا، جسے وہ ایک روٹین کی طرح سمجھ کر ہی ان کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ لیکن اندر بی جان کے ہمراہ اپنے والد سکندر شاہ کو دیکھ کر حیران ہوا۔ سکندر شاہ اپنی والدہ کے فرمانبردار فرزند تھے۔ بی جان کی زبان سے نکلے ہر حرف کو تسلیم کرنا ان کے لئے دھرم جیسا تھا اور بی جان کی خدمت کرنا ان کے قلب کے اطمینان کا باعث تھا۔ اس وقت بھی بی جان اپنے بستر پر دراز تھیں اور سکندر شاہ، جن ہاتھوں سے پورے گاؤں اور حویلی کے امور سنبھالتے تھے، انہی ہاتھوں سے اپنی والدہ کے پاؤں دبائے جا رہے تھے۔ سمعان مسکرا کر ان کی جانب بڑھا تھا۔

"آؤ، آؤ سمعان! میرے بچے! میرے جگر گوشے۔" بی جان نے اسے دیکھتے ہی ہمیشہ کی طرح اپنے ممتا بھرے بوڑھے بازو پھیلا دیئے اور وہ چلتا ہوا ان کے بستر پر آیا اور ان کی بانہوں میں اپنا آپ دے دیا۔

"بی جان! میری اچھی بی جان!" بے اختیار ہی لب ہلے تھے۔

"کیسے ہو میرے بچے! شہر جاکے تو وہاں کی ہواؤں نے تمہیں بدل دیا ہے۔ ذرا برابر بھی اپنی بوڑھی بی جان کی خبر نہیں رکھتے۔ اب زندگی کے تھوڑے ہی دن باقی ہیں۔ تم لوگوں کی صورتیں نہ دیکھوں تو روح چین نہیں پاتی۔" بی جان نے اس کی کشادہ پیشانی پر ممتا بھرے ہونٹ رکھے اور وہ بی جان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ان کے ملبوس سے اُٹھنے والی مانوس مہک کو اپنے اندر اُتارتا رہا۔

"آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں بی جان! آپ تو ہمارے لئے سایہ دار شجر کی طرح ہیں جس نے ہمارے اوپر ہمیشہ رہنا ہے۔" سمعان نے کہا۔

"سایہ دار درختوں کو بھی آندھیاں، زلزلے، طوفان گرا ڈالتے ہیں۔ پھر میں تو ایک انسان ہوں۔ بیٹا! اس درخت کی تم لوگ شاخیں ہو، جسے میں اپنے سامنے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہوں۔" بی جان نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"سمعان! بی جان نے تمہیں ضروری کام کے لئے بلایا ہے بیٹے!" سکندر شاہ نے کہا۔

"جی بی جان! بولیں۔" وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

"پہلے یہ بتاؤ، تمہارے مہمان آرام سے تو ہیں ناں؟ ان کی رہائش کے انتظام میں ملازموں نے کوئی کوتاہی تو نہیں برتی ناں؟" بی جان نے پوچھا۔

"آپ کے ہوتے ہوئے کوئی کمی کیسے رہ سکتی ہے بی جان؟" سمعان مسکرایا۔

"کل نزہت کی رخصتی کے بعد اپنے مہمانوں کو مزید دو دنوں کے لئے روک لینا۔"

"کیوں بی جان! کوئی خاص وجہ؟"

"فراز شاہ کی شادی کے اگلے دن کرن کے ساتھ تمہارا نکاح ہے۔" بی جان کی جگہ سکندر شاہ نے کہا۔

"نکاح.......؟" سمعان کے ہونٹوں سے اچانک ہی مسکراہٹ اُڑ گئی۔ ذہن گویا ایک ہی نقطے پر اٹک گیا۔

"یہ فیصلہ میرا کیا ہوا ہے سمعان! اور تمہارے بابا اور چچا نے اپنی رضامندی دے دی ہے۔ ہم نے تمہارے رشتے داروں اور برادری والوں تک یہ خبر پہنچا دی ہے۔" بی جان

انتہائی سکون سے بولیں۔

وہ برف کی سل کی طرح جامد تھا لیکن پل بھر کو اس برف کے اندر ایک چنگاری بھڑکی۔

"لیکن بی جان......" اس نے کچھ بولنے کی سعی کی۔

"لیکن کیا سمعان؟" سکندر شاہ کی جہاں دیدہ آنکھوں نے اس کا ایکسرے کرنا شروع کیا۔

"آپ نے مجھ سے پوچھا ہوتا بی جان! مجھے بتایا تو ہوتا۔" وہ بولا۔

"سمعان! بی جان جو سوچ لیں، اس کے متعلق کسی سے پوچھنا اور کسی کو بتانا ضروری نہیں ہوتا۔ تمہارے باپ نے، تمہارے چچا نے، ان کی اولادوں نے کبھی بی جان کے کسی فیصلے پر شکوہ نہیں کیا تو تمہیں کیا شکایت ہے؟" سکندر شاہ کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی کرختگی در آئی۔

"سمعان بیٹے! ہم جانتے ہیں، کرن تمہارے لئے سب سے اچھا جیون ساتھی ثابت ہوگی۔ اس سے بہتر لڑکی اور کوئی نہیں ہوگی۔ اور پھر بڑوں کے جوڑے رشتے پائیدار ہوتے ہیں۔" بی جان نے لہجہ نرم رکھا۔ سمعان کی آنکھوں میں مشال کے خدوخال گردش کرنے لگے۔

"کرن جانتی ہے اس بارے میں؟" وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"اسے ہمارے اس فیصلے سے کوئی اعتراض، کوئی اختلاف نہیں۔ وہ بہت خوش ہے اس فیصلے سے۔" بی جان کی اس اطلاع کے بعد وہ کمرے میں رُکا نہیں اور تیزی سے کمرے کا دروازہ عبور کرتا اپنے کمرے تک جانے لگا۔

نزہت کے ہاتھوں میں نگل مہندی لگانے میں مشغول تھی اور کرن اس کے اگلے دن پہننے والے سرخ زرتار لہنگے میں ستارے لگا رہی تھی۔ مشال اور کویتا، کرن کے جہیز کے کپڑوں کو شوق سے دیکھ رہی تھیں اور ندا مہندی کے ڈیزائن کو۔

"ہمارے یہاں کی شادیاں لڑکیوں کو کتنا الگ بنا دیتی ہیں ناں۔ ہمیشہ سیدھی سادی رہنے والی لڑکی اچانک اُبٹن، خوشبو میں نہلا دی جاتی ہے۔ پھولوں میں، زیوروں میں، رنگوں میں سجا دی جاتی ہے۔ گوٹے، ستارے، کناریاں، چمک دمک اور زرق برق ملبوسات۔" مشال کپڑوں کو دیکھ کر بولی۔

"یہی چیزیں تو ہماری دُلہنوں کی، سہاگنوں کی شان ہوتی ہیں۔" نزہت نے کہا۔

"آپ کل کیا پہنو گی نگل آپی؟" نزہت نے محویت سے مہندی لگاتی نگل سے پوچھا۔

"میرا تو بھی چوڑی دار پاجامہ ہے سبز رنگ کا۔" سجل بولی۔

"اور میرا اپشواز ہے۔" ندا نے جھٹ سے کہا۔

"میں تو بھی اپنا ٹریڈیشنل لباس ساڑھی باندھوں گی۔" کویتا نے کہا۔

"اور مشال! تم؟" کرن نے مشال سے پوچھا۔

"میں شاید لہنگا چولی پہنوں۔ یا پھر کرتا پائجامہ۔" وہ سوچ کے بولی۔

"یہ تو کل کا طے ہوا۔ پرسوں کیا پہنیں گی آپ سب؟" نزہت نے کہا۔

"پرسوں؟........ کیوں، پرسوں بھی کوئی فنکشن ہے کیا؟ کارڈ پر تو نہیں لکھا تھا۔" ندا حیران ہوئی۔

"کارڈ پر تو نہیں لکھا، لیکن کیا آپ لوگوں کو نہیں پتہ کہ پرسوں سمعان بھائی اور کرن کا نکاح ہے۔ یعنی میری نند، میری بھابی بھی بن جائے گی۔" نزہت نے کھلکھلا کے کہا۔ سجل اور ندا کی نگاہیں اچانک ہی مشال کے چہرے پر جا پڑیں اور مشال۔ اس کے ذہن میں شائیں شائیں ہونے لگا تھا۔ ذہن نزہت کے ایک جملے پر ٹھہر سا گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد بے رنگ سے دائرے رقص کرنے لگ گئے تھے۔

"یہ کب طے ہوا؟" ندا بے چینی سے بولی۔ وہ مشال کے اندر کی فیلنگز کو سمجھتی تھی۔

"یہاں کے فیصلے اسی طرح ہوتے ہیں ندا! اچانک اور ٹھوس۔ جو بدل نہیں پاتے۔ پرسوں میں آئی تو مجھے خبر ہوئی۔" کرن کی نگاہیں بھی مشال کی آنکھوں پر تھیں اور مشال۔ اس کی آنکھیں ابھی چھلک پڑتیں، ضبط کی دیوار بھی گر پڑتی، برداشت کا پہاڑ ابھی ریزہ ریزہ ہو جاتا، اگر وہ وہاں سے اپنے وجود کو گھسیٹتی نہ جاتی۔ وہ وہاں سے اُٹھی اور مرے مرے قدموں سے باہر آ گئی اور اسی کے پیچھے کرن بھی آ گئی۔

"مشال! رُکو، میری بات سنو۔" وہ کرن کا سامنا کرنا نہ چاہتی تھی۔ لیکن کرن اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"میں جانتی ہوں کہ تم سمعان کو چاہتی ہو۔ لیکن میرا یقین کرو، سمعان اپنے بابا اور بی جان کے سامنے اس فیصلے کے خلاف نہیں بول سکتا اور بی جان اپنے اس فیصلے سے کبھی ہٹ نہیں سکتیں۔ پورے خاندان اور برادری کو پتہ چل چکا ہے کہ ادا فراز کی شادی کے اگلے دن سمعان کی اور میری شادی ہے۔" کرن اس کی محبت پر اپنی محبت کا جھنڈا گاڑ رہی تھی۔

"اور یہ فیصلہ بدل نہیں سکتا۔" کرن کا لہجہ ٹھوس تھا۔

"یہ کیسے فیصلے ہوتے ہیں جن کی خبر کسی کو نہیں ہوتی؟........ کیا ہوائیں بھی اس حویلی

کے بھید کسی کو نہیں بتاتیں؟ یہ کیسے فیصلے ہوتے ہیں جو بول نہیں سکتے؟ جو بنا بتائے، بنا پوچھے طے ہو جاتے ہیں؟ جو ہر کسی کا سر اپنے آگے جھکا دیتے ہیں؟" مشال کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔

"اس حویلی کے فیصلے واقعی ایسے ہوتے ہیں مشال! بہت خاموش، بہت مضبوط اور بہت سفاک۔" کرن نے کہا۔

"کیا میرے سمعان کے دل میں بھی یہ فیصلہ رضامندی بنا کے ڈال دیا گیا ہے یا وہ ابھی بھی اس سے بے خبر ہے؟ کیا اس کی محبت پر بھی یہ ضرب پڑ چکی ہے؟" مشال کے دل میں پڑی ضربیں اس کے لبوں پر آ ٹھہری تھیں۔

"وہ ایک پیدائشی جاگیردار ہے اور جاگیرداروں کے ٹھوس اور بے حس دلوں میں نہ محبتیں جنم لے سکتی ہیں اور نہ ان پر ضربیں پڑ سکتی ہیں۔ وہ اپنی محبت کی خاطر اپنی وراثت، اپنی جائیداد نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ اپنے بابا کے فیصلے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ وہ بے شک محبت تم سے کرتا ہو لیکن نکاح وہ مجھ سے کرے گا۔" کرن کے اندر کی سفاکی اس کے لفظوں سے عیاں تھی اور مشال اس کے لفظوں کی غلام گردش میں بھٹک رہی تھی۔ اس کی معصوم محبت سنگسار ہو رہی تھی۔ وہاں رک کے مزید باتیں سننا اسے سوہان روح محسوس ہو رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور راستے میں ہی شاہ زیب سے ٹکرا گئی۔

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اور اس کے چہرے کی سرخ رنگت دیکھ کر شاہ زیب کا دل ہول اٹھا۔ اس کے اندر کی محبت جھٹپٹا اُٹھی۔

"کیا ہوا مشال؟"

اور ایک ہمدرد سے دوست کو دیکھ کر مشال پر ضبط مشکل تھا۔ اس نے ضبط کی دیوار گرا دی اور شاہ زیب کے کندھے سے لگ کے آنسو بہانے لگی۔



مشال سے بات چیت کے بعد کرن نیچے جا رہی تھی تو سیڑھیوں پر ہی اسے سمعان مل گیا جو شاید اوپر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غم و یاس کی کیفیت اور کرب کے سائے دیکھ کر کرن سمجھ گئی کہ سمعان اس نئی خبر سے آشنا ہو چکا ہے۔ وہ اسے نظر انداز کر کے آگے جا رہا تھا کہ کرن نے اسے روکا۔

"امید ہے تمہیں بی جان نے بتا دیا ہو گا سمعان!"

"ہاں۔ بتا دیا ہے۔ کرن! میں تم سے پوچھتا ہوں، کیا تمہیں علم نہ تھا کہ میں مشال

سے محبت کرتا ہوں، اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اس کے بغیر میں کسی کا تصور نہیں کر سکتا۔" سمعان اس سے سوال کرنے لگا۔

"پتہ تھا۔ تو کیا کرتی؟" وہ اُلٹا سوال کرنے لگی۔

"تو تم منع کر دیتی بی جان کو۔ بتا دیتیں انہیں کہ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔"

"کیا تم منع کر سکے سمعان؟ تم بتا سکے انہیں؟ اگر تم لڑکا ہونے کے باوجود ایسا نہیں کر سکتے تو میں کس طرح کرتی؟" کرن پھٹ پڑی۔

"میں کروں گا منع...... کر دوں گا انکار۔ جہاں محبت ہی نہ ہو، وہاں رشتے جوڑنے سے کیا حاصل......" سمعان نے کہا۔

"محبت...... ہونہہ، محبت۔ کس کے لئے کرو گے انکار سمعان! کس کی محبت کے لئے؟ وہ جس نے تمہاری محبت کو کبھی محبت ہی نہیں سمجھا۔ جس نے تمہاری محبت اور اعتبار کی آڑ میں تم سے دھوکا کیا۔ جس نے تمہیں اپنے حُسن کے جال میں پھنسا کے تمہیں بے وقوف بنایا۔ اس کے لئے تم اپنے ماں باپ کا دل دکھاؤ گے، اپنی بی جان کو عمر کے اس حصے میں رُلاؤ گے؟" کرن انتہائی ظالم لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟...... کیا کہنا چاہتی ہو تم؟" وہ مشتعل سا ہو گیا۔

"جو میں کہنا چاہتی ہوں، وہ تم شاہ زیب کے کمرے میں جا کے دیکھ لو۔ اپنی محبت کے تقدس کو کسی دوسرے کی بانہوں میں سہارا لیتے دیکھو گے تو تمہیں تمہارے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔" یہ کہہ کے کرن تیز رفتاری سے سیڑھیاں اُترنے لگی اور سمعان لمبے لمبے ڈگ بھرتا شاہ زیب کے کمرے تک آیا۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے دھکیلا تو ہلکی سی کوشش کے بعد وہ کھل گیا۔

زرد رنگ کے پردے کے پیچھے اسے کرسی پر بیٹھا شاہ زیب نظر آیا اور اس کے گھٹنوں میں اپنا سر رکھے بیٹھی مشال......

شاہ زیب کے ہاتھ اس کی زلفوں پر تھے اور اُنگلیاں زلفوں کو سہلا رہی تھیں۔ وہ اس سے آگے وہاں رُکا نہیں، واپس مڑ آیا۔ اعتبار کی ٹوٹی کرچیاں سمیٹے۔ ریزہ ریزہ دھڑکنوں اکٹھا کیے۔ شاہ زیب کے ہاتھ ان زلفوں میں تھے، جن کو سمعان نے اپنا کہا تھا۔ مشال وجود ان گھٹنوں پر تھا، جو سمعان کے نہ تھے۔ وہ بے وفائی کے احساس تلے دبتا ہی چلا جا تھا اور اس کی محبت لٹتی چلی جا رہی تھی۔

اور وہاں مہمان خانے کے زرد پردے کے پیچھے شاہ زیب کے گھٹنوں میں چہرہ د

پاگلوں کی طرح رونے والی لڑکی منتظر تھی سمعان کی۔ اس کے محبت بھرے لمس کی۔ اس کی دوستی کی۔ لیکن وہ نہ آیا اور وہ اسی طرح اُلجھی بکھری رہی۔

اور شاہ زیب اس وقت درد کا درمان بنا اُس کی اس عجیب محبت کو سنبھال رہا تھا۔ اپنی محبت دبائے، چھپائے۔ اس نئی محبت کے انکشاف پر حیران بھی تھا اور اس کے انجام پر دُکھی بھی۔

اس ایک سیاہ رات نے کتنی محبتوں کو سیاہی بخشی تھی۔ کتنی آنکھوں کو آنسو بخشے تھے۔



"رُک جاؤ مشال! اس طرح تمہارا جانا سمعان کو برا لگ سکتا ہے۔" میرون رنگ کی شال میں لپٹی اپنا سامان سمیٹتی مشال سے ندا مخاطب تھی۔

"کس کی ذات کا احساس دلا رہی ہو ندا! وہ، جو کل سے میرے سامنے آیا ہی نہیں؟ نہ کوئی صفائی پیش کرنے اور نہ اپنی بے گناہی کا ثبوت دینے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ بے گناہ ہی نہیں۔ وہ انجانے پن کے بہروپ میں لپٹا اپنی من مانی کر رہا ہے۔" کرن کی باتوں کے بعد مشال کی آنکھیں اور دل رات بھر روئے تھے اور اسی لئے اس کا لہجہ اور آواز بھاری بھاری تھے۔

"تو تم خود سمعان سے جا کر بات کرو۔ اسے اپنی محبت کا احساس دلاؤ۔" شاہ زیب جس نے تمام رات مشال کے درد کو قطرہ قطرہ چنا تھا، بول پڑا۔

"محبتیں اس طرح نہیں ہوتیں شاہ زیب! گڑگڑا کر، بھیک مانگ کر محبت مانگنے میں محبت کی توہین ہوتی ہے۔ یہ کنپٹی پر پستول رکھ کر کسی سے کاغذ سائن کرانے جیسی نہیں ہوتی۔ یہ تو وہ یقین، وہ مان ہوتی ہے جو بنا بولے، بنا پوچھے رکھی جاتی ہے۔ ایک ایسا بھرم جس میں گڑگڑانے کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔" مشال کا لہجہ بار بار بھیگ جاتا۔

"پھر بھی اس طرح مت جاؤ مشال! آج کا دن رک جاؤ۔ کل چلی جانا۔" شاہ زیب نے اسے نرمی سے مشورہ دیا۔

"رک جاؤں؟...... تم کہتے ہو، میں رک جاؤں؟...... کس کے لئے رکوں میں شاہ زیب؟ وہ شخص...... وہ شخص، جو مجھ سے محبت کے، وفا کے وعدے کرتا آیا ہے، وہ کسی اور کا دولہا بننے جا رہا ہے، کسی کے ساتھ نکاح کرنے جا رہا ہے۔ پکے کاغذوں والا نکاح۔ دو گواہوں والا نکاح۔ تم کہتے ہو، میں رک جاؤں؟ کیوں رک جاؤں میں اپنی محبت کا تماشا دیکھنے کے لئے؟ اپنی وفا کی پامالی کا منظر دیکھنے کے لئے؟" مشال بولتے بولتے خود پر ضبط

نہ پائی اور ہتھیلیوں میں منہ چھپا کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شاہ زیب اور ندا اس کے قریب آ گئے۔

"سنبھالو خود کو مشال! کیسے ہوگا اس طرح" ندا نے اس کے سلکی بالوں کو سہلایا۔ وہ فوراً سنبھل کر سیدھی ہو گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں اور چہرہ پونچھا، اپنا بیگ مکمل کر کے اس کو زپ لگایا اور خود کو سنبھالتی بیگ اٹھا کے کمرے سے باہر آ گئی۔

تیسری منزل سے اُتر کے ابھی وہ نیچے آئی ہی تھی کہ کاریڈور نما برآمدے کے ایک کونے میں کھڑا سمعان اسے نظر آ گیا۔ وہ بے وفا اتنا منتشر سا کیوں تھا۔ وہ ہرجائی خود اتنا ٹوٹا ٹوٹا سا کیوں تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی جانب آئی اور اس کے قریب آ کر رُک گئی۔

"مبارک ہو سید سمعان شاہ! نکاح کرنے اور جیون ساتھی کے پانے کی۔"

سمعان کچھ کہنا چاہتا تھا مگر چپ رہا۔

"اور تو کچھ نہیں، بس صرف ایک افسوس رہے گا سمعان! کہ میں نے اپنی وفائیں تم جیسے ظالم شخص کو سونپیں اور اپنی خواہشیں تم جیسے سفاک وجود سے منسلک کیں۔" مشال کے لہجے میں کرب تھا، درد تھا۔ یہ کہہ کر وہ رُکی نہیں اور تیز تیز قدموں سے کاریڈور پھلانگتی جانے لگی۔ وہ اسے روکنا چاہتا تھا، اسے پکارنا چاہتا تھا لیکن آشنائی تو گویا پل بھر میں اجنبیت کا روپ دھار چکی تھی۔ سمعان کی نظر میں وہ بے وفا تھی لیکن اسے بے وفا کہہ کے چلی گئی تھی۔ وہ سفاک تھی مگر اسے سفاک ٹھہرا کر جا چکی تھی۔ سمعان کے دل سے آواز آئی۔

'اسے روک لو....... اس کے سامنے صرف ایک بار صفائی پیش کرو....... اپنی بے گناہی کی گواہی دو....... اپنی وفا کا بھرم رکھ کے اسے اپنی مجبوری بتا دو....... اور پھر اسی کی طرح اس سے بے وفائی کا گلہ کرو۔ اس کے دھوکا دینے کا شکوہ کرو۔'

وہ اپنے قدم آگے بڑھا لیتا لیکن سیڑھیوں سے اُترتے شاہ زیب نے اس کے قدم روک لیے۔ وہ بھی اپنا بیگ اٹھائے اُتر رہا تھا۔ سمعان کو دیکھ کے اس کی طرف آیا۔

"سوری یار سمعان! میں شادی اٹینڈ نہیں کر پاؤں گا۔ میں اس وقت مشال کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔" یہ کہہ کر شاہ زیب بھی مشال کے تعاقب میں آگے بڑھ گیا اور سمعان سگریٹ کی راکھ جھاڑتا دیر تک کاریڈور میں چلتا رہا۔



"تم اس کی شادی میں جاؤ گے شاہ زیب! تمہیں جانا پڑے گا۔" وہ کتنی دیر خاموش

رہنے کے بعد اچانک ہی بولی تھی اور شاہ زیب، جو سوچوں کی گہری فضاؤں میں کہیں بھٹک رہا تھا، اسے لگا کہ جیسے مشال کی آواز دور کسی گہری کھائی سے آئی ہو۔

"بولو ناں شاہ زیب! جاؤ گے ناں اس کی شادی میں؟" وہ تصدیق چاہتی تھی۔ رات بھر روتے رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

"آج ہی تو تمہارے ساتھ پہنچا ہوں کراچی اور کل پھر اس کی شادی اٹینڈ کرنے چلا جاؤں۔" شاہ زیب نے کچھ بولنے کی سعی کی۔

"دوست، دوست کی رٹ لگائے پھرتے ہو اور دوست کی خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتے۔ تم جاؤ گے ناں۔" وہ گویا منتظر تھی۔

"تمہیں اکیلا چھوڑ کے کس طرح چلا جاؤں مشال! تم جس ذہنی حالت سے گزر رہی ہو، کیا میرا جانا مناسب ہے؟" شاہ زیب بولا۔

"بہانے مت بناؤ شاہ زیب! میں کوئی ننھی بچی نہیں کہ کھلونا ٹوٹ جانے پر رونے بیٹھ جاؤں۔ اور نہ ہی اتنی بہادر لڑکی ہوں کہ زہر کھا کر خودکشی کر لوں۔ مجھے خودکشی سے ڈر لگتا ہے شاہ زیب!" اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں آنسو چمکے۔

"کل سادات حویلی روشنیوں سے جگمگائے گی۔ سمعان دولہا بن کر نکلے گا اور کرن دلہن کے لباس میں کتنی پیاری لگے گی ناں۔ شرمائی، لجائی، سمعان کے ساتھ یہ نازاں اور پھر....... اور پھر انہیں ایک دوسرے سے محبت ہو جائے گی....... تم دیکھنا شاہ زیب! کل وہ شادی میں ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھیں گے۔ میٹھے میٹھے اشارے کریں گے اور آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگیں گے۔" وہ خود اذیتی کا ذائقہ چکھ رہی تھی۔

"اوہ کم آن مشال! کوئی محبت اس طرح نہیں ہوتی۔ وہ مجبوری کے تحت کرن سے شادی کر رہا ہے۔ محبت وہ تم سے کرتا ہے۔" شاہ زیب نے اسے ٹوکا۔

آسمان پر شام کے سائے اُترنے لگے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اب قدرے دھیمی پڑنے لگ گئی تھی۔

"مجبوری....... ہونہہ، مجبوری....... پتہ نہیں اپنی کزن سے شادی کرنا اس کی مجبوری تھی یا مجھ سے محبت کرنا۔ یونیورسٹی کے سفید پھولوں والی سڑک پر چلتے چلتے مجھ سے وعدے کرنا اس کی مجبوری تھی یا اپنی بی جان کا فرمان ماننا۔ زیب! ابھی تو میں خود کو اس کے وعدوں کی سہانی گلیوں سے بھی نہ آزاد کرا پائی تھی۔ ابھی تو میں نے اس کے خوابوں کے اطلس نیند کی بانہوں میں سونا بھی نہ سیکھا تھا....... ابھی تو شاہ زیب! ابھی تو سب شروع ہوا

تھا۔" وہ بے تحاشا رونے لگی تھی اور اس کے آنسو بالکنی کی ریلنگ سے گر کر نیچے کہیں بارش کی طرح پڑتے ہوں گے اور بوند کی شکل بناتے ہوں گے۔"

"تم بہت پاگل ہو مشال!" اس عجیب لڑکی کی عجیب داستانِ محبت شاہ زیب کو اداس کیے تھی۔

"تم وہ سب چھوڑو۔ تم بس وعدہ کرو کہ تم جاؤ گے اور دیکھو گے کہ سمعان دولہا بن کر خوش تھا یا اس کے چہرے پر کوئی رنج، کوئی ملال، کوئی افسری تو تھی ناں۔ یا پھر وہ سب احساس بھول بیٹھا ہے اور اپنی زندگی کے نئے ساتھی کے ساتھ زندگی انجوائے کر رہا ہے، مسکرا رہا ہے۔ تم دیکھنا زیب! آج صبح سادات حویلی کے برآمدے میں جو شخص منتشر سا کھڑا تھا، دیکھنا کہ وہ اپنے وعدوں کا کتنا سچا تھا اور اپنے قول و قرار کا کتنا پکا تھا۔ تم دیکھنا۔" مشال کی آواز درد کی ان گنت لذتوں سے مزین تھی اور شاہ زیب اس ان کہے درد کی کیفیت سے خوب آشنا تھا۔



سادات حویلی رنگ برنگے قمقموں سے جھلملا رہی تھی۔ نور ہی نور اور رنگ ہی رنگ تھے۔ اس سال کی اس رُت نے اہلِ حویلی کو دو دو خوشیاں دی تھیں۔ بڑے عرصے بعد بی جان کے دونوں بیٹوں کے گھر ایک ساتھ بہار اُتری تھی، ہوا کا نرم جھونکا، جو ہر سُو اپنی ٹھنڈک سے آشنا کیے جا رہا تھا۔

حویلی کے وسیع و عریض ہال میں سمعان اور کرن کا نکاح ہونا تھا۔ قریب و دور کے بھی رشتہ دار، دوست موجود تھے۔ ایک طرف فراز شاہ اور نزہت ایک دن کے دولہا دُلہن بیٹھے لوگوں سے مبارک بادیں سمیٹ رہے تھے تو دوسری طرف ان کے والدین اپنی اولاد کی فرمانبرداری کا اطمینان اپنے دلوں میں بسائے مسکراہٹیں سمیٹ رہے تھے۔ تبھی سامنے کی سیڑھیوں سے دُلہن کی آمد ہونے لگی۔ ہر کسی سمیت، شاہ زیب کی نگاہیں بھی آپ ہی آپ اس جانب اُٹھ گئی تھیں۔

گلابی رنگ کے کامدار غرارے کو اپنے مہندی لگے ہاتھوں سے تھامے، اپنے شفاف چہرے کے ساتھ ساتھ زیوروں کی جگمگاہٹیں دور دور تک بکھیرتی ہوئی وہ کرن تھی۔ کرا شاہ۔ نے آج تک یونیورسٹی کے احاطے میں سیاہ اسکارف اور عبا میں لپٹا دیکھا تھا۔ روپ چڑھا تھا اس پر۔ کتنا حُسن ٹھہرا تھا اس کے رُخ پر۔ اُس کے رخساروں کی سرخی۔ یہ تو ظاہر نہ تھا کہ یہ رشتہ زبردستی کا ہے یا پھر اس میں کرن کی منشا نہیں۔ کیا تھا یہ سب؟...

چہرے سے ٹپکتی ایک روشنی کا جھرمٹ یا جیت کی مسرت سے سرشار خال و خد۔ فتح کا احساس لیے جگمگاتا انگ انگ۔ اپنی جیت کا علم بلند کرنے کے بعد کا احساس۔ یقیناً کرن کے چہرے پر سجا یہ نور اس کا احساسِ فتح تھا۔ اور پھر اس نے کام بھی تو ایسا کیا تھا۔ شبنم کے قطروں کو سمیٹ کے اس نے ان سے اپنے لیے ایک تاج بنا لیا تھا، جسے وہ سجائے بیٹھی تھی۔ مشال کی محبت کی شدتیں بھی کرن کو ہرا نہ پائیں۔ مشال اور سمعان کے بیچ کے وعدے، وفائیں، خواہشیں کچھ بھی اسے شکست نہ دے سکا۔

ابھی محفل کرن کے حُسن سے پوری طرح جگمگا بھی نہ سکی تھی کہ سمعان سراپا حُسنِ یوسف بنا آن پہنچا۔ فان کلر کی شیروانی کے اوپر سرخ رنگ کی چادر گلے میں لٹکائے۔ اسے کرن کے برابر جگہ دے دی گئی۔

شاہ زیب نے اسے غور سے دیکھا۔ پہلی بار وہ مسکرا رہا تھا۔ ہولے ہولے سے۔ لیکن یقیناً وہ مسکراہٹ سچی نہ تھی۔ وہ تو ایک کھوکھلا سا خول تھی، جو سمعان نے اپنے اوپر چڑھا رکھا تھا۔ شاہ زیب نے دل سے اعتراف کیا۔ یقیناً سمعان کو بھی مشال سے محبت ہے۔ ہو سکتا ہے وہ مشال کی محبت سے ذرا کم ہی ہو لیکن اس کا وجود پھر بھی ہے۔ وہ آج بھی وہیں ہے۔ شکست کھانے کے بعد بھی۔ ہار جانے، کملا جانے کے باوجود بھی اس کا موہوم سا احساس موجود تھا۔

نکاح کی رسم شروع ہونے والی تھی۔ قاضی جو کہ شاید خاندان ہی میں سے تھا، اپنی نشست سنبھال چکا تھا۔ تبھی شاہ زیب کے سیل پر بیپ ہوئی۔ اس نے یس کا بٹن پش کر کے فون سنا۔

"نکاح کی رسم ہو رہی ہے ناں شاہ زیب؟" دوسری طرف مشال کی آواز تھی۔ شاہ زیب صرف ہوں ہی کہہ پایا۔

"کرن کو سمعان کے ساتھ بٹھا دیا گیا ہے نا؟ وہ یقیناً ساتھ بیٹھے بہت اچھے لگ رہے ہوں گے۔ کرن نے آج وہ پایا ہے جو میری قسمت میں نہ تھا۔" شاہ زیب کان سے فون لگائے اس دیوانی لڑکی کی شدت کو سن رہا تھا۔ لیکن خاموش تھا۔

"شاہ زیب! تم سمعان کی آنکھوں میں چھپا کرب کا ایک ہلکا سا احساس دیکھ رہے ہو۔ یہ احساس میں ہوں۔ یہ احساس میری محبت کا ہے زیب!" وہ شاید رو رہی تھی۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"مشال! میں فون رکھ رہا ہوں۔" شاہ زیب کے گلے میں بھی گولا اٹک رہا تھا۔

"مت رکھو زیب! پلیز مجھے نکاح میں موجود رہنے دو۔ مجھے اس احساس کو جاننے دو کہ اپنی پسندیدہ چیز کسی کو سونپنا کیسا ہوتا ہے۔ مجھے یہ درد محسوس کرنے دو۔" وہ بولی۔ شاہ زیب خاموش ہی رہا۔

نکاح کی رسم شروع ہوئی۔ کرن سے پوچھا گیا اور اس نے بڑے اطمینان سے ہامی بھر لی۔ پیپرز سائن کیئے۔ پھر سمعان سے پوچھا گیا۔

"سیّد سمعان شاہ ولد سیّد سکندر علی شاہ! کیا آپ نے کرن شاہ کو بطور شریکِ حیات قبول کر لیا؟"

پھر دوہرایا گیا۔ سمعان وہاں ہونے کے باوجود بھی وہاں نہ تھا۔ اور پھر تیسری بار کہنے کے بعد اس نے با آواز بلند قبول کر لیا اور نکاح نامے پر دستخط بھی کیئے۔ ہر طرف مبارک باد کا ایک شور اُٹھا اور اسی وقت مشال نے فون ڈس کنکٹ کر دیا۔

شاہ زیب یقیناً پریشان ہو گیا تھا۔ وہ سمعان اور کرن کو مبارک باد دے کر کھانا کھانے سے پہلے ہی کراچی کے لئے نکل پڑا۔ لیکن فاصلہ منٹوں پر نہیں، گھنٹوں پر محیط تھا اور پھر جب چار گھنٹے کا سفر طے کر کے وہ سیدھا مشال کے ہاسٹل پہنچا تو ایک بری خبر اس کی منتظر تھی۔ وارڈن نے اسے اطلاع دی۔

"آج شام ایم اے جناح روڈ پر ایک روڈ ایکسیڈنٹ ہوا۔ ایک تیز رفتار گاڑی سڑک کراس کرتی ہوئی لڑکی کو لگ گئی۔ اور وہ لڑکی مشال احمد تھی۔ اسے ہسپتال پہنچا کے یہاں فون کیا گیا۔ اب تک شاید اس کے والدین بھی اسلام آباد سے آ چکے ہوں گے۔"

اور یہ سن کر شاہ زیب دوڑا دوڑا ہسپتال کے لئے نکلا۔ اسے یقین تھا کہ وہ گاڑی مشال کو نہیں لگی بلکہ مشال جان بوجھ کر اس کے آگے آئی ہے اور یہ سب نکاح کے بعد ہی ہوا ہے کہ جب مشال نے اچانک فون بند کر دیا تھا۔

ہسپتال میں واقعی مشال کے والد اور اس کی آپا فرزانہ بوا پہلے سے موجود تھے۔ شاہ زیب ان سے ملا اور اپنا تعارف اس کے دوست کی حیثیت سے کروایا۔ ان سے ہی اسے پتہ چلا کہ گاڑی والا تو فرار ہو گیا اور مشال کو کچھ لوگوں نے ہسپتال پہنچایا۔ اس کے سر میں گہری چوٹ آئی ہے اور ایک ٹانگ میں فریکچر ہے جو کہ میجر ہے اور فوراً اس کا آپریشن کرنا پڑے گا، جس کے لئے اس کے والد اسے اچھے ہسپتال شفٹ کر رہے تھے۔

اور اگلے ہی دن اس کا آپریشن ہوا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں اسٹیل کی راڈ ڈالی گئی۔ لیکن پھر بھی ڈاکٹرز نے کوئی خاص امید ظاہر نہ کی تھی، اس کے پہلے کی طرح چلنے کی،

آپریشن بہر حال کامیاب ہوا اور وہ خطرے سے باہر آ گئی تھی۔

اگلے دن وہ صبح وزیٹنگ آورز میں ہسپتال پہنچا تو کو بتا، سجل، ندا اور سعد کو پہلے سے موجود پایا۔ وہ فلورسٹ سے تازہ ٹیوب روز کا بکے بنوا کے لایا تھا۔ ان چاروں کے درمیان بیڈ پر ایک کملایا سا وجود پڑا تھا۔ سر پر سفید پٹی اور اس پٹی کے ہم رنگ چہرے کا عکس۔ یوں لگتا تھا جیسے اس چہرے سے ساری سرخی نچوڑ دی گئی ہو۔ پہلے سے اندر کو دھنسی آنکھیں مزید سیاہی کا شکار تھیں۔ ہونٹ پپڑیوں سے بوجھل تھے۔ یہ وہ لڑکی تو نہ لگتی تھی، جس کی صرف ایک ادا کسی کو بھی پاگل بنا سکتی تھی۔ یہ تو اس کا سایہ تھی۔ اس مشال کا وہ رُوپ، وہ حُسن، وہ معصومیت، وہ رکھ رکھاؤ کہیں بھی تو نہ تھا۔

سفاک عشق نے اس پری وش سے وجود کی ساری رمق چھین لی تھی۔ پل بھر کو شاہ زیب کے دل میں ایک ٹیس اُٹھی۔ آخر وہ بھی تو محبت کرتا تھا مشال سے۔

سمعان کی اور اس کی محبت میں کیا فرق تھا؟ پھر کیا وہ سمعان کی جگہ نہیں لے سکتا؟ کیا مشال اسے اپنا نہیں سکتی؟

وہ اسے دیکھ کے مسکرائی تھی۔ بوسیدہ ہونٹوں پر ایک کرن پھوٹی تھی۔

"تم آ گئے۔ تمہاری کمی فیل ہو رہی تھی۔ سبھی تھے۔ ایک تم نہ تھے۔" نحیف سی آواز اسیر ساری اُداسی کے ہمراہ نکلی۔ وہ چپ ہی رہا۔ خفا خفا تھا اس سے۔ کتنے گلے، کتنے شکوے تھے اس کے دل میں۔ مگر وہ چپ چاپ سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا اور پھول اس نے ٹیبل پر سجا دیئے۔

کچھ ہی دیر بعد سبھی رخصت ہونے لگے اور کمرے میں صرف وہی رہ گیا۔

"کیوں کیا تم نے ایسا مشال! کیوں؟" وہ الفاظ ترتیب دینے کی ناممکن کوشش میں تھا۔

"میں نے کیا، کیا ہے زیب؟ کیا تو اُس نے ہے۔ سمعان نے۔ وعدہ خلافی، فریب، چھل۔ میں نے تو........ میں نے........ تو صرف اپنی سانسوں کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی سعی کی تھی۔ اور پھر جو وجود سمعان کے لائق نہیں، اسے زندہ رہنے کا بھی کوئی حق نہیں۔" اس کی گہری سیاہ آنکھیں چمکیں۔

"کون کہتا ہے کہ تم سمعان کے لائق نہیں؟ ارے پگلی! وہ تمہارے لائق نہ تھا۔ جس نے تمہاری وفاؤں کی قدر نہ کی، اس کے لئے تم مرنے چلی تھیں۔ کیا فائدہ ملتا اس سے سمعان کو؟" وہ برس پڑا تھا۔

"تم بھی ناراض ہو مجھ سے ہر کسی کی طرح؟........ تم تو میرے چارہ گر، میرے
درماں ہو ناں زیب! دوست ہو ناں میرے۔ تم تو بیگانے نہ بنو۔" اس کی آس سے بھری
آنکھیں شاہ زیب کو پگھلانے لگیں۔ شاہ زیب کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"مت کرو ایسا مشال! مت ہرٹ کرو خود کو اتنا۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے تمہیں اس
حال میں دیکھ کر۔ مت سزا دو خود کو اس جرم کی جو تم نے کیا ہی نہیں۔" وہ اس کے ہاتھ پر
اپنا ہاتھ رکھ کے بولا۔

"کرن دُلہن بن کر بہت پیاری لگ رہی تھی ناں؟ اُس کا صبیح چہرہ سج کے کتنا نکھرا
تھا۔ اور اس کے گال کا وہ تل۔ جب سمعان حجلہ عروسی میں اسے دیکھ رہا ہوگا تو اُس نے
اس تل کی ضرور تعریف کی ہوگی۔ اور پھر اپنی وفائیں اس کے نام کی ہوں گی۔ اپنا نام اسے
سونپا ہوگا۔ خوش تھا ناں وہ کل۔" مشال کی آنکھیں تصور کے کھنڈروں میں بھٹک رہی تھیں۔

"کیوں دیتی ہو اتنی اذیت خود کو؟ کیا ملتا ہے تمہیں مشال! جو شخص تمہارا نہیں ہو سکا
اس کے لئے اللہ کی پوری کائنات کو آگ لگا دو گی کیا؟ زندگی کے نئے زاویے، نئے راستے
تلاش کرو۔ دنیا کو دکھا دو کہ تم کمزور نہیں ہو۔ لڑ سکتی ہو زمانے سے، زمانے کی آندھیوں
سے۔" شاہ زیب کا لہجہ دوستانہ تھا۔

"کس کس کو ڈھارس دوں زیب! زمانے کو یا خود کو؟........ کہاں تک بہلاؤں اس
دل کو؟ میرا دل کوئی بچہ تو نہیں جو کھلونوں سے سنبھل جائے گا۔ میں اتنی بہادر نہیں زیب
میں بہت عام سی لڑکی ہوں۔ مجھے قدم قدم پر سہارے کی ضرورت ہے۔ اور دیکھو ناں، اب
تو میں بغیر سہارے کے چل بھی نہیں سکتی۔" وہ طنز سے مسکرائی تھی اور شاید یہی لمحہ تھا، شاہ
زیب کی بھٹکتی محبت کے اقرار کا۔

"تمہیں میں سہارا دوں گا مشال!........ تمہیں میں خاص بناؤں گا۔" وہ بہت سچائی
سے بولا تھا۔ "شادی کر لو مجھ سے مشال!"

"کچھ دیر مشال خاموش رہی، پھر اِک آہ بھر کے بولی۔

"تم سے بے وفائی کروں میں زیب؟........ جھوٹ بولتی رہوں تا عمر تم سے؟ جس
طرح سمعان بولے گا کرن سے تا عمر۔ دل کوئی سرائے تو نہیں ہوتی کہ جب جو مسافر آیا
ٹھہر گیا۔ دل تو اِک گھر ہوتا ہے، اِک آشیاں۔ مکیں بدلنے کا تو سوال ہی نہیں اُٹھتا۔"

اُس کے اس صاف انکار سے شاہ زیب کو ٹھیس ہی پہنچی تھی۔ وہ کچھ دیر مزید ٹھہرا،
وہاں سے چلا آیا۔ دل میں یہ پکا عہد کر کے کہ وہ مشال سے محبت کی بھیک کبھی نہیں مانگے

گا۔ کبھی بھی نہیں۔



اور پھر ایک دن شاہ زیب کو ایک کال موصول ہوئی۔

"زیب! میں جا رہی ہوں۔ یہ شہر چھوڑ کے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔" وہ مشال تھی۔

"کیا........ کیا مطلب ہے تمہارا؟........ کہاں جا رہی ہو تم؟" وہ حیران ہی تو ہوا تھا۔

"میں پاپا کے ساتھ اسلام آباد جا رہی ہوں۔ اور یہ بات صرف ندا اور تمہیں ہی معلوم
ہوگی اور تم دونوں کسی کو کبھی نہیں بتاؤ گے۔" وہ سختی سے کہنے لگی۔

"لیکن مشال! اس طرح اچانک سب کچھ ادھورا چھوڑ کے؟ تم کم از کم اپنا آنرز تو پورا
کر لو۔" شاہ زیب اسے روکنا چاہتا تھا۔

"جب باقی ساری چیزیں ادھوری رہ گئی ہیں تو تعلیم کو مکمل کر کے کیا کروں گی؟ اور
ویسے بھی اب مجھے پڑھی لکھی عورتوں سے نفرت ہونے لگی ہے۔ کم بخت بلا کی جھوٹی ہوتی
ہیں۔" وہ شاید ہنسی تھی۔ وہ کتنی دیر خلا میں دیکھتا اس دیوانی لڑکی کے کرب کو محسوس کرتا رہا۔

"مت جاؤ مشال........ پلیز!" اس نے التجا کی۔

"میں رک کے کروں گی بھی کیا زیب! سمعان اور کرن کے بندھن کو محسوس کر کے ہی
میری آس ختم ہو گئی ہے تو کیا ان دونوں کو ایک ساتھ آتے جاتے، ہنستے بولتے دیکھوں گی
تو جی سکوں گی؟ ایک اپاہج لڑکی کے اندر سانس لیتی محبت احساسِ کمتری بن کر اسے مار
ڈالے گی۔ زیب! میں ایسی جگہ جانا چاہتی ہوں، جہاں سمعان نہ ہو، اس کا تصور، اس کی
یادیں، اس کا حصار نہ ہو۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"کیا تم سمعان کو بھلا نہیں سکتیں مشال؟" ایک اُمید پھر بیدار ہوئی تھی اور لائن کے
دوسری طرف مشال نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"اسی لئے تو جا رہی ہوں۔ شاید میری زندگی میں کوئی ایسا لمحہ آ جائے کہ جو سمعان
کے ساتھ کا متلاشی نہ ہو۔" وہ منتشر سی بولی تھی۔ یقیناً اس کی آنکھ سے شفاف لڑیاں گری
ہوں گی۔

"ندا کے پاس پاپا کے گھر کا ایڈریس ہے۔ مجھے خط لکھتے رہنا اور مجھے بھلانا نہیں۔ اگر
غلطی سے کبھی سمعان پوچھ بھی لے تو اسے مت بتانا۔ میں تم لوگوں کے ساتھ گزارے
گئے لمحوں کو کبھی نہیں بھولوں گی۔" اس شدت پسند لڑکی کے اندر کے احساس، شاہ زیب
کے دل کو لرزا رہے تھے۔ اُس کی آواز، اُس کے احساس اور وہ اچانک ہوا میں تحلیل ہو گئے

تھے۔ شاہ زیب کی آنکھوں کے کونے اس کے لئے ایک بار پھر سے نم ہو گئے تھے اور
بچھڑنے کا لمحہ تو یوں بھی اذیت ناک ہوتا ہے اور بچھڑنا بھی وہ کہ جس میں پھر ملنے کی
اُمید ہی نہ ہو۔



مشال نے اس شہر سے ناتا توڑ دیا لیکن وہ اپنے پاپا کے ہمراہ اسلام آباد نہیں آئی
اپنی آپا کے ساتھ مری کے اسی گھر میں آ گئی، جہاں سمعان اور اس کی ماما کی اچھی یادیں
تھیں اور اسے یہاں آئے چار سال ہو گئے تھے۔ ایک انجانی سی قید تنہائی میں جیتے ہو۔
چار برس گزار چکی تھی وہ۔ مہینے میں ایک دو بار جب بھی کبھی اس کے پاپا آتے تو اس
لئے آئے ہوئے خط لاتے۔ ندا اور شاہ زیب کے خط۔ ندا کے خطوط میں اس کے لئے
مندی ہوتی۔ اور شاہ زیب کے خط انتظار میں ڈوبے ہوتے۔ انتظار اُس کے لوٹ آنے
اُس کے کسی خط کے جواب آنے کا۔

وہ ندا کے خطوط کا جواب باقاعدگی سے دیتی تھی لیکن اس نے شاہ زیب کو آج تک
جواب نہ دیا تھا۔ اس کے انتظار کو کسی امید کا ساتھ نہ بخشا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ہر ماہ خط لکھتا
تھا۔ بلاناغہ، ایمان داری سے، مان سے۔

ان چار برسوں میں بہت کچھ بدلا تھا۔ ندا اور عمر کی شادی ہو چکی تھی اور ایک بیٹا
تھا۔ سعد ہائر اسٹڈیز کے لئے آسٹریلیا چلا گیا تھا۔ تکل نے بھی شادی کر لی تھی اور کرن
سمعان حویلی شفٹ ہو گئے تھے۔ ان کے متعلق شاہ زیب کے کسی خط میں کوئی بات نہ ہوتی
تھی۔ شاید وہ جان بوجھ کے ایسا کرتا تھا۔ مشال کے دل کی حالت اب بہت حد تک بدل
چکی تھی۔ سمعان کی بے وفائی کا غم اب کم تھا لیکن اب تنہائی اس کی دوست بن چکی تھی۔

اب اسے لوگوں سے خوف آتا تھا۔ لوگوں کے وجود، باتیں اس کو انجان لگتی تھیں۔
اس کی زندگی کا محور صرف فرزانہ بوا، یادیں اور ندا، شاہ زیب کے خط تھے اور کچھ نہیں۔



"مشال بیٹی! یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟ آ کے میرے ساتھ بیٹھو۔ سارا دن اکیلے
بیٹھے بیٹھے بور نہیں ہوتی ہو؟"

اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس اسے چپ چاپ بیٹھے فرزانہ بوا نے ٹوکا تھا اور
ہمیشہ کی طرح مسکرائی تھی۔ وہ اُٹھی، اپنے کرچ اٹھائے اور باہر لاؤنج میں آ گئی۔ فرزانہ
چھوٹی سی ٹیرس میں بیٹھی مٹر چھیل رہی تھیں۔ اس نے اپنی بانہیں پیچھے سے بوا کے گلے

ال دیں۔

"میری پیاری بوا!" وہ پیار سے بولی تھی۔

"ارے، ارے...... گر جاؤ گی۔" بوا نے اس کے بازوؤں کو تھام لیا۔ وہ دوبارہ
سنبھل کے اپنی بیساکھیوں پر کھڑی ہو گئی۔

"بوا! آپ مجھے بار بار یہ یاد نہ دلایا کریں کہ میں کھڑی نہیں ہو سکتی یا بنا سہارے کے
چل نہیں سکتی۔" وہ بوا کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی اور مٹر کے دانے چھلوانے لگی۔

"ارے پگلی! کیوں ایسی باتیں کرتی ہو؟ مجھے تو یہ احساس بھی نہیں ہوتا۔ بس تم خود ہی
اس احساس کے بوجھ تلے گھٹتی چلی جاتی ہو۔ کہنا مجھے یہ تھا کہ کل تمہارے ابا کا فون آیا تھا۔
کہہ رہے تھے، تمہارے لئے کوئی رشتہ آیا ہے اور لڑکا ہے بھی ہر طرح سے لائق۔ ان کے
کسی جاننے والے کا لڑکا ہے۔ اگر کہو تو ہاں کر دیں؟" فرزانہ بوا نے بے حد صاف اور
واضح انداز میں کہا۔ وہ چپ ہو گئی۔

"لگ گئی ناں تمہیں چپ۔ ارے کب تک یونہی بیٹھی رہو گی بنا سہارے، بنا آسرے
کے، صبح کو شام کا اور شام کو صبح کا انتظار کرتی ہوئی؟ اب میرے بوڑھے کندھے کب تک
تجھے سنبھالیں گے؟ مان لے ہماری بات۔" بوا خفا ہی تو ہوئی تھیں۔

"مان لوں گی...... آپ کی کہی ہر بات مان لوں گی۔ سوائے اس کے۔" وہ منہ بسور
کے بولی۔

"ہمیں سوائے اس کے تجھ سے کوئی بات منوانی بھی نہیں ہے۔ مشال بیٹی! اگر کوئی
لڑکا تجھے پسند ہے تو بتا دے، ہمیں کوئی انکار نہیں ہوگا۔ جو بات بھی تیرے دل میں ہے، کہہ
دے بیٹی! کہنے سے دلوں کے بوجھ چھٹ جاتے ہیں۔ یوں اس طرح پچھلے چار برس سے
دنیا سے چھپ کے، سب چھوڑ چھاڑ کے بیٹھی ہو۔ نہ کوئی تمہارا دوست ہے اور نہ کوئی
ہمراز۔ اتنی تنہائی سے تو خود موت بھی گھبرا جائے۔" بوا کی باتوں میں اس کے لئے صرف فکر
جھلکی تھی۔

"میں دنیا سے چھپ کے اس لئے بیٹھی ہوں بوا! کہ صرف یہ تنہائی ہی ایسی ہے، جو
میرا مذاق نہیں اُڑائے گی۔ ورنہ ایک اپاہج انسان کا دوست کون ہوتا ہے؟ کون کرے گا مجھ
سے شادی بوا؟ ایک لنگڑی، بے بس لڑکی کے وجود کو تا عمر گھسیٹنے کی خواہش کون سا نارمل شخص
کرے گا؟ کیا آپ نہیں جانتیں کہ مردوں کو اپنے لئے بیویاں نہیں، کٹھ پتلیاں چاہئے ہوتی
ہیں۔ ان کے آگے دوڑتی بھاگتی، ان کے کام کرتی۔ بوا! میرے پاس وہ کچھ نہیں، جو کسی

بھی لڑکے کی خواہش ہو سکے۔'' وہ بڑی نرمی سے بوا کو سمجھانے لگی۔
''لیکن مشال بیٹی! زندگی کس طرح گزرے گی؟'' بوا کی سوچ ابھی بھی اسی محور پر تھی
''گزر جائے گی بوا! زندگی گزرنے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ پلک جھپکنے کا بھروسہ نہ
ہوتا، کب سانسوں کی ڈوری ٹوٹ جائے۔ اور پھر ہم جتنے کم لوگوں کو جانیں گے، سمجھ
گے، اتنا ہی کم درد اُٹھائیں گے۔'' وہ کہتے کہتے کھوسی گئی تھی۔
''اچھا بوا! میں ذرا بک شاپ پر ہو آتی ہوں، مال روڈ پر۔ اس سے میں نے اُ
کتاب منگوائی تھی، وہ لے آؤں۔'' وہ بات ٹالتی ہوئی اُٹھنے لگی۔
''پھر اس دن کی طرح شام کر کے آنا، جب میں انتظار میں پاگل ہونے لگوں۔''
ناراض سی بولیں۔
''ارے آج تو آپ آلو مٹر پکا رہی ہیں۔ ابھی سے بھوک لگ رہی ہے۔ لیکن آ
جانے میں کچھ وقت تو لگ ہی جاتا ہے۔'' وہ مسکرا کے بولی تھی اور بوا اس کی باتو
ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گئی تھیں۔
وہ کوئی بیس منٹ کے بعد بک شاپ پر پہنچ گئی تھی۔ وادی میں ٹھنڈی ٹھنڈی شام
سائے اُتر رہے تھے۔ راستے میں اُسے کئی ٹورسٹ، ہنی مون کپل ایک دوسرے کے سا
بے فکری سے قہقہے لگاتے، گنگناتے نظر آئے تھے اور وہ ان کی زندگیوں پر رشک کرتی ہو
گئی تھی۔
''میں نے آپ سے فیض احمد فیض کی کتاب نسخہ ہائے وفا لانے کو کہا تھا۔ منگوالی آ
نے؟'' وہ دکاندار سے بولی۔
''جی میڈم! آپ کی مطلوبہ کتاب میں نے منگوالی ہے۔ لیکن ابھی جو وہ کسٹمر آ
ہیں تو انہوں نے اٹھالی ہے۔ میں ابھی ان سے کہتا ہوں کہ وہ کوئی اور کتاب خرید لیں
دکاندار نے ایک بندے کی طرف اشارہ کیا۔ مشال نے اس طرف دیکھا تو ایک لمبا
مرد، آف وائٹ اور میرون رنگ کے سویٹر میں ملبوس دوسری طرف چہرہ کیے ریک پہ
کتابیں ڈھونڈ رہا تھا۔ اُس کا قد، اُس کے کھڑے ہونے کا انداز سمعان سے کتنا ملتا
تھا۔ دل میں ایک ٹیس سی اُٹھی۔ مشال نے منہ پھیر لیا اور دکان کے شیشے کے باہر
پھرتے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد اسے عقب سے دکاندار نے پکارا۔
''میڈم! یہ صاحب آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''
اُس نے مڑ کے دیکھا۔ دکاندار کے ساتھ جو شخص کھڑا تھا، وہ سمعان تھا۔

سمعان شاہ......وہی چہرہ، وہی خال وخد، وہی وجاہت اور وہی چھب۔
پل بھر کو مشال کی دھڑکنوں کا نظام منتشر سا ہوا تھا۔ بیساکھیوں کا بیلنس اسے بگڑتا سا
محسوس ہوا۔ سمعان کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔
اس طرح اتنے برسوں بعد اس سے ملنا، اسے دیکھنا۔ وہ کیسے یقین کرتا اپنی بصارتوں
پر......اتنے برسوں دل کے اندر کلبلانے والی محبت، اتنی شدت سے غل مچانے والی
ادھوری خواہش اس کے سامنے تھی لیکن اس حال میں۔ سمعان کی آنکھیں اس کے چہرے
کے بعد فوراً ہی اس کی بیساکھیوں پر اُٹھ گئی تھیں اور ہزاروں سوال دل میں اُمڈ آئے تھے۔
''م......م......مشال......!'' وہ خود کو سنبھالنے کی سعی کرنے لگا اور خاموشی سے
ساکت آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی مشال کے دل میں ایک تل سا دھڑکا۔ کتنے عرصے
بعد سماعت نے یہ آواز سنی تھی۔ وہ ہلکے سے مسکرائی تھی۔
''کیسی ہو؟'' وہ پھر بولا۔
''میں اچھی ہوں......آپ کیسے ہیں؟......اور یہاں کیسے؟'' وہ نارمل سا لگنے کی
کوشش کرنے لگی۔
''فارسٹ ڈیپارٹمنٹ میں آفیسر ہوں۔ پچھلے سال بحرین ٹرانسفر ہوا اور اب یہاں۔ تم
یہاں رہتی ہو مشال؟'' وہ گہری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے اثبات میں گردن
ہلائی۔
''تمہیں کیا ہوا ہے مشال! یہ بیساکھیاں؟''
''زندگی میں کچھ حادثے ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کا تعلق لاشعور سے بھی ہوتا ہے۔''
وہ کھوئی کھوئی سی بولی تھی۔
''چلو، کسی جگہ بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔'' سمعان نے کتاب کاؤنٹر پر رکھی اور اسے
ہمراہ آنے کا کہا اور وہ بھی چپ چاپ اس کے ساتھ چلتی رہی۔ چلتے چلتے وہ ایک
ریسٹورنٹ کے باہر لگے بنچ تک آ گئے۔ درمیان میں خاموشی تھی، جھجک تھی۔ مگر پھر بھی
اپنائی تھی۔
''تم تو اچانک غائب ہی ہو گئیں۔ نہ کوئی خبر، نہ کوئی ملاقات۔ تم نے تو سب رشتے
ہی توڑ دیئے۔'' وہ دبی دبی شکایت کر رہا تھا اور وہ اس کے انداز پر دل ہی دل میں مسکرا رہی
تھی کہ جس نے سب رشتے توڑے وہی شکایت کر رہا ہے۔
''کرن کیسی ہے؟ کہاں ہے وہ آج کل؟ تمہارے بچے بھی ہوں گے سمعان!'' وہ

بات بدلتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ایک بیٹی ہے۔اس کا نام کرن نے مشال رکھا ہے۔تین سال کی ہے۔جانتی ہو،اس کی آنکھیں اور مسکراہٹ غیر معمولی طور پر تمہاری طرح ہے۔اور کرن........وہ ... چاری اپنی زندگی کے بقایا دن کاٹ رہی ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولا تھا۔

"کیوں؟" وہ ٹھٹکی ہی تو تھی۔

"اس کی کڈنی فیل ہوگئی ہے۔ٹرانسپلانٹ تو ہو سکتا ہے لیکن ابھی تک کسی کی کڈنی اس سے میچ نہیں ہوئی ہے۔" وہ بڑے تاسف سے بولا تھا اور مشال کے دل میں ایک گونج اٹھی تھی کہ خدا ہے۔کہیں نہ کہیں۔دیکھنے والا،سمجھنے والا۔زیادتیوں کے بدلے گن گن کے لینے والا۔غرور کو پل کے رکھ دینے والا،روندنے والا۔

"تم سناؤ اپنے بارے میں........کیسے ہوا تمہارے ساتھ یہ حادثہ؟ اور شاہ زیب کیسا ہے؟ یہیں رہتا ہے،وہ بھی تمہارے ساتھ؟ تم دونوں نے یونیورسٹی کیا چھوڑی،ہماری رونقیں ہی بچھڑ گئیں۔" سمعان مسکرا کے بولا۔

"کیا؟ شاہ زیب نے یونیورسٹی چھوڑ دی تھی؟........کب؟ کیا اس نے اپنا آنرز بھی مکمل نہیں کیا؟" مشال سراپا حیرت تھی۔

"تمہیں نہیں پتہ،وہ تو غائب ہی ہوگیا۔ہم تو یہی سمجھے تھے کہ تم دونوں نے شادی کر لی ہے اور کہیں سیٹل........"

"شادی اور ہماری؟........کیا مطلب ہے سمعان! تمہارا؟" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا مشال! تم اور شاہ زیب ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور ہمارا خیال تھا کہ تم دونوں نے شادی........" وہ کہتے ہوئے خود بھی جھجکا تھا۔وہ تیزی سے بنچ سے اٹھی تھی اور اپنی بیساکھیاں اٹھائی تھیں۔

"تم نے........تم نے سمعان! کس طرح یہ سوچا کہ میں کسی اور کو بھی پسند کرسکتی ہوں۔ تم نے جن وفاؤں کو ٹھکرایا تھا،وہ وفائیں آج بھی زندگی کی راہوں میں بھٹک رہی ہیں۔ چھوڑا تم نے تھا سمعان! میں نے نہیں۔وعدہ خلافی تم نے کی تھی،میں نے نہیں۔محبت کے محل توڑ کے نئے آشیانے تم نے جوڑے تھے،میں نے نہیں۔"

کہتے کہتے اس کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

"شاہ زیب تو بہت اچھا ہے۔ہمیشہ ایک دردمند دوست رہا۔ایک چارہ گر رہا۔

تکلیفوں کے وقت ہمیشہ اس کا کندھا آنسوؤں کے لئے موجود تھا۔اور تم........سمعان! تم نے تو بنا پوچھے،بنا بتائے نئی راہیں اور نئی منزلیں ڈھونڈ لیں۔اور میں اپنی ہی خواہشوں کے کھنڈروں میں بے چین روح کی طرح بھٹکتی رہ گئی۔تمہیں تو ساتھی ملا اور مجھے تنہائیاں، مایوسیاں،اندھیرے،اکیلا پن۔اور میرے پیچھے تم یہ سوچ بیٹھے رہے کہ میں نے شاہ زیب سے محبت کی تھی،اس سے شادی کی تھی۔تف ہے تم پر سمعان! افسوس ہے تم پر۔" وہ نم آنکھوں سے کہتی ہوئی جانے کے لئے مڑی اور پیچھے کتنی دیر تک ایک پشیمان شخص اسے پکارتا رہ گیا تھا۔



صبح ناشتے کے بعد وہ چائے کا کپ تھامے ٹیرس کی طرف آئی تھی اور دور وادی کے اوپر ٹھہرے بادلوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔آس پاس لگے چیڑ اور دیودار کے پیڑ صدیوں سے اسی طرح ساکت و جامد تھے،جیسے کہ وہ کسی کے منتظر ہوں۔وہ چائے کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لیتی کسی گہری سوچ میں گم تھی کہ جب ڈور بیل بجی۔اس وقت عموماً دودھ والا یا پھر کبھی کبھی فرزانہ بوا سے ملنے کوئی پڑوس کی عورت آتی تھی۔اس لئے مشال نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا اور چائے سے لطف اندوز ہوتی رہی۔تبھی اسے عقب سے بوا نے پکارا۔

"مشال بیٹی! تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔" اس نے مڑ کے دیکھا۔بوا کے پیچھے بلیک جیکٹ میں ملبوس وہ سمعان تھا۔

"انہوں نے کہا کہ یہ تمہارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو میں اندر لے آئی۔" بوا نے وضاحت کی۔

"آجائیں سمعان!" وہ سبز رنگ کی شال درست کرتے ہوئے بولی۔

"جاؤ بیٹا! میں تمہارے لئے چائے لاتی ہوں۔" یہ کہہ کے بوا چلی گئیں اور سمعان اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔کتنا اُداس،کتنا منتشر سا لگ رہا تھا وہ۔اسے دیکھ کے مشال کو سادات حویلی کے کاریڈور میں کھڑا وہ سمعان یاد آگیا۔

"تمہیں میرے گھر کا کیسے پتہ چلا؟" مشال نے اس کی چپ کے قفل کو توڑنا چاہا۔

"میں کیسے بھول سکتا ہوں اس پتے کو،اس گھر کو؟ یہیں سے تو ہماری محبت نے جوانی میں قدم رکھا تھا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"تمہیں ابھی تک یاد ہیں وہ دن؟" ذومعنی لہجے میں ہلکے سے طنز کی آمیزش تھی۔

"کبھی کبھی زندگی کے کچھ بیتے دن،زندگی کا قیمتی اثاثہ بھی بن جایا کرتے ہیں۔سچ

مشال! بہت آزمائشیں دیکھی ہیں تمہارے بعد میں نے۔ وجہ اب سمجھ میں آئی ہے کہ سمجھنے میں غلطی کی تھی میں نے......شک، محبت کا دشمن ہوتا ہے۔ بے اعتباری کی گنجائش نہیں ہوتی وفاؤں میں۔ لیکن میں نے وہی کیا اور تمہیں آج تک گناہ گار سمجھتا رہا، تمہارے حال سے بے خبر رہا اور تقدیر نے مجھے سزا بھی تو دی۔ شادی کے سال بعد بیٹی کی پیدائش کے بعد پتہ چلا کہ کرن دوبارہ ماں نہیں بن سکے گی۔ کیونکہ بیٹی کی پیدائش پر سیزرین کے وقت اس کی اووریز کسی وجہ سے نکالنی پڑی تھیں۔ ابھی اس غم کو وہ بھلا ہی پائی تھی کہ اس کی کڈنی فیل ہونے کا پتہ چلا۔ اور یقین کرو مشال! تبھی سے وہ تمہیں یاد کر کر کے روتی ہے اپنے گناہ کا اعتراف کرتی ہے، تمہاری صداقتوں کی گواہی دیتی ہے۔ وہ جی تو رہی ہے لیکن پل پل اس کا ضمیر اسے موت دے رہا ہے، اسے احساسِ جرم میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔"

ایک بے بس انسان کا اعتراف مشال کے سب دُکھوں کا مداوا بن چکا تھا۔ اس کے اندر چار برس تک پنپنے اور پل پل کھانے والا غم قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس شخص کو بنا کسی تاثر کے دیکھ رہی تھی، جس کی بے وفائی اور عشق کے بوجھ تلے وہ سانسیں لیتی آئی تھی۔ اتنی لمبی مسافت کاٹتی آئی تھی۔ وہ بنا رُکے بولے جا رہا تھا۔ اس کے آگے اپنے جرم کا اعتراف کرتا جا رہا تھا۔ وہ مشال کو ہرا کے بھی جیت نہ پایا تھا اور کرن، جس نے ایک معصوم محبت کے کھنڈر پر اپنی جیت کا علم بلند کیا تھا، قدرت نے اتنی جلدی اس سے بدلہ لیا تھا، اتنی جلدی اسے اپنے گناہ کا احساس دلا دیا تھا۔

"میں آج تم سے صرف معافی مانگنے آیا ہوں اپنے اور کرن کے گناہوں کی......میں نے تمہیں سمجھا نہیں، اور کرن نے تمہیں سمجھنے نہیں دیا۔ اور یہی چیز ہم دونوں کی منتشر زندگی کی وجہ بنی۔ پلیز مشال! مجھے معاف کر دو۔ اور پلیز! ایک بار زندگی کی جنگ ہارتی کرن سے ملنے چلو۔ یقیناً تم سے مل کے وہ اپنا آدھا احساسِ جرم زائل کر دے گی۔" وہ اُلجھے بکھرے لہجے میں مخاطب تھا۔

"میں نے تو کبھی تمہارا برا نہیں چاہا سمعان! تمہاری شادی کے بعد میں نے ہر سانس میں تمہاری اور کرن کی خوشیوں کی دعا کی ہے۔ تم دونوں کے تاعمر ساتھ کی دعا کی ہے۔ میں نے تو کبھی کسی سے شکایت بھی نہ کی۔ تم نے غلط فہمی کی آڑ میں آ کے مجھے ٹھکرا دیا، میں چپ رہی۔ تم نے بنا مجھ سے بات کیے، اطلاع دیئے فیصلہ کر لیا، میں نے کچھ نہ کہا۔ تم نے نئی دنیا بسا لی، میں چپ چاپ تمہاری دنیا سے نکل آئی۔ اور اب جب تم ملے تو اتنے منتشر، اتنے بکھرے، اُلجھے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ میری دعاؤں میں قبولیت کا اثر ہی

نہ۔ میری ساری دعائیں بیکار گئیں۔ فرش اور عرش کے درمیان اپنے معبود کو تلاشتی ہوئی اور لاتی ہوئیں۔ مشال بہت سچائی سے بولی تھی۔ "میں کرن سے ضرور ملوں گی سمعان! لیکن ں سے پہلے میں کرن کے ٹیسٹ رپورٹس دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرے ایک انکل ڈاکٹر ہیں، ں ان سے کرن کی بیماری ڈسکس کرنا چاہتی ہوں۔"

مشال کی اس بات نے سمعان کے چہرے پر مسکراہٹ ہی تو دوڑا دی تھی۔

"تم واقعی چلو گی مشال؟......واقعی؟ کرن کتنی خوش ہو گی ناں۔ میں تمہیں کل ہی ں کی ٹیسٹ رپورٹس بھجوا دوں گا مشال!" وہ بے یقینی سے بولا۔

"اور جب وہ جا رہا تھا تو مشال خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اس شخص کے اعترافِ جرم نے مشال کے تمام دکھوں کو دھو دیا تھا اور زندگی میں پہلی بار جب مشال نے اپنے دل کو ٹٹولا تو اسے جواب ملا کہ سمعان کی محبت کی بیل اب اس کے دل میں مرجھا چکی ہے۔ اب اس پر کوئی پھول، کوئی کانٹا نہیں لہراتا۔ آج وہ پہلی بار کھل کے مسکرا سکتی تھی کہ آج اس کا دل یکطرفہ محبت کے بوجھ سے خالی ہو چکا تھا۔ آج وہ عرصے بعد ایک الگ مشال تھی۔



"کیسے ہو زیب؟" چار برس کے طویل انتظار کے بعد ایئر پیس میں مشال کی آواز گونجی تھی۔ شاہ زیب نے تو خود کو عالم خواب ہی میں محسوس کیا تھا۔

"مشال! تم کہاں ہو؟......تم کیسی ہو؟"

"بالکل ٹھیک ہوں......آج تمہاری شدت سے یاد آئی تو تمہیں فون کر لیا۔ اتنے سالوں تک تم نے بنا میرے کسی جواب کے مجھے خط لکھے، مجھے اپنے رابطے کے نمبرز دیئے اور میں نے تمہارے کسی رابطے کا جواب نہ دیا۔ لیکن اب مجھے تمہاری ضرورت ہے زیب! مجھے اپنے سب سے اچھے دوست اور چارہ گر کی شدت سے ضرورت ہے......میں نے ایک فیصلہ کیا ہے زیب! اور مجھے اس فیصلے کی تکمیل کے لئے تمہاری ضرورت ہے۔" وہ بہت مان سے بولی تھی۔

"کہاں ہو تم؟ میں پہنچتا ہوں۔" وہ مسکرا دیا تھا۔

"مری میں ہوں......چار برس سے اسی گھر میں، جہاں ہم سب پکنک پر آئے تھے۔ آؤ گے ناں زیب؟"

"ضرور آؤں گا......میں کل ہی پہنچتا ہوں۔" وہ جتنے پیار سے بولا تھا، اتنا ہی مشال

کے دل میں اس کے لئے فخر جاگا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح دُکھوں کا مداوا بن کے آیا تھا۔ اس کی دوستی تھی بھی تو ایسی۔ ہر شرط سے پاک۔ ہر شک سے اوپر۔

اگلے دن اپنے قول کے مطابق وہ اپنے مختصر سے زادِ راہ کے ہمراہ موجود تھا۔

اتنے سالوں بعد اس نے اسے سامنے دیکھا تھا۔ پہلے سے زیادہ دُبلا اور لمبا لگ رہا تھا۔ چہرے پر سجتی مسکراہٹ اور اس مسکراہٹ کی اپنائیت بھی پہلے جیسی تھی۔

اور مشال.......وہ شاہ زیب کو بارش میں دُھلے اس پودے کی طرح لگی جو دُھلنے سے قبل مرجھانے والا ہو لیکن بوندوں نے اس کے انگ انگ میں اِک رمق دوڑا دی ہو۔

"مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ کیونکہ تم ہی تو وہ ہو، جس نے میرا ہر درد، ہر دُکھ میں ساتھ دیا ہے۔ اور جب میں تنہائی کی چادر اوڑھ کے دنیا سے چھپ کے بھی بیٹھی تو تم نے اپنی تحریروں کے ذریعے مجھے ڈھونڈا اور میرا سراغ لگانے کی سعی کی۔" مشال کی آنکھوں میں چھپی خوشی شاہ زیب کو سرشار کر رہی تھی۔

"تم بلاؤ اور میں نہ آؤں، ایسا ہو سکتا ہے؟ دوستی کا پتہ تو وہیں سے چلتا ہے جب دوست کو کوئی ضرورت آن پڑے۔" اس نے اپنا بیگ بیڈ پر گرا دیا اور ایزی ہو کے بیٹھا۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اس نے خود ہی بات کی شروعات کی۔

"اب بتاؤ، ایسا کیا فیصلہ کیا ہے تم نے، جو تمہیں میری ضرورت پڑی؟"

"سمعان سے ملی تھی میں۔" اس نے بات شروع کی۔ شاہ زیب کے دل میں ایک چھناکا ہوا۔

"فاریسٹ ڈیپارٹمنٹ میں آفیسر ہے۔ یہاں پوسٹنگ کے سلسلے میں آیا ہے۔ اس نے بتایا کہ کرن کی کڈنی فیل ہوگئی ہے اور کسی کی کڈنی ابھی تک میچ نہیں ہوئی ہے۔ میں نے کرن کی رپورٹس لے کے اپنے ٹیسٹ کرائے ہیں اور جانتے ہو زیب! حیرت انگیز طور پر میری کڈنی اس سے میچ ہوگئی ہے۔" وہ ٹھہر ٹھہر کے بولی۔

"تو کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ چونکا ہی تو تھا۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے زیب! کہ میں اپنی کڈنی کرن کو دے کر اس کی زندگی بچاؤں گی۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا مشال! پاگل ہوگئی ہو تم؟ اپنی کڈنی دے دو گی کرن کو؟ اُس کرن کو جس نے تمہاری محبت تم سے چھینی، تمہیں تمہاری تعلیم، تمہاری زندگی سے محروم کیا، دوستی کی آڑ میں دشمنی کی؟" شاہ زیب چلایا۔

"اس نے جو بھی کیا، اس کی سزا وہ بھگت چکی ہے زیب! اور پھر معاف تو اللہ تعالیٰ کی ذات بھی کر دیتی ہے زیب! ہم تو صرف انسان ہیں۔ ہم کم ظرف ہوں گے تو اللہ کس مخلوق پر فخر کرے گا؟" وہ شاہ زیب کو دھیمے انداز میں سمجھانے لگی۔

"لیکن مشال!"

"زیب! مجھے یقین ہے کہ تم میرا ساتھ دو گے، مجھے کمزور نہیں پڑنے دو گے۔" اس کے کہنے پر زیب چپ ہی تو ہو گیا تھا۔

اور پھر اُس کے اس فیصلے سے اختلاف سبھی نے کیا تھا۔ پاپا، فرزانہ بوا۔ لیکن اُس کی ایک ہی رٹ تھی کہ وہ ایک گردے پر زندہ رہ سکتی ہے۔ اور اگر اس کا ایک گردہ کسی مرتی ہوئی زندگی کو بچا سکتا ہے تو اس میں غلط ہی کیا ہے؟ اور زندگی بھی اس کی، جسے اس نے کبھی دوست کہا تھا۔ تلخیاں اپنی جگہ، فاصلے اپنی جگہ لیکن دوستی تو پھر دوستی ہوتی ہے ناں۔

سب مل کے بھی اس عزم کے پہاڑ کو ریزہ ریزہ نہ کر پائے تھے۔ سب مل کے بھی اس پگلی لڑکی کے دل کو سمجھا نہ پائے تھے۔ اور آخر کار سبھی کو اس کی ضد کے آگے ہار ماننی پڑی تھی۔

اور پھر جب سمعان کو اس چیز کے متعلق بتایا گیا تو وہ عجیب پشیمان سی آنکھوں سے مشال کو دیکھے گیا اور سوچے گیا کہ یہ لڑکی کیا ہے۔ اتنا درد سہنے کے باوجود بھی اتنی نرم۔ اگر انسان ہوتی تو کہیں سے تو ٹوٹتی، کہیں سے تو ضرب کھاتی۔ یہ تو کوئی دیوی کا روپ ہے۔ روحانی کا کوئی مقدس مجسمہ۔ وہ تو اس کا احسان مند بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ احسان تو مادی چیزوں پر کیا اور اُتارا جاتا ہے۔ لیکن زندگیوں کا احسان جان تک دے دینے کی رضامندی تھی اور وہ بھی اس کو، جس نے زندگی کا اثاثہ چھینا ہو، جس نے دل سے محبتوں کو نوچ کر صرف درد بھر دیئے ہوں، جس نے خواہشوں کے سبھی پرندوں کو غلط فہمی کی گولیوں سے فنا کر دی ہو اور جس نے زندگی کے پاؤں میں نوکیلی میخیں ٹھونک دی ہوں۔

وہ شاہ زیب کے ہمراہ حیدر آباد پہنچ چکی تھی۔ وہیں سمعان، کرن کو ہمراہ لے کر پہنچا تھا، جہاں پر کڈنی ٹرانسپلانٹ ہونا تھا۔ مشال نے سمعان کو قسم دے کر منع کر رکھا تھا کہ وہ کرن کو ابھی اس متعلق کچھ نہ بتائے کہ اسے کڈنی دینے والی مشال ہی ہے۔



وہ سادات حویلی کے احاطے میں ایک بار پھر قدم رکھ چکی تھی۔ جو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ سادات حویلی کے سنگدل حصاروں نے ایک بار پھر اس کے لئے اپنے در کھول دیئے تھے۔

وہ اپنی بیساکھیوں کے سہارے چلتی اندر آ رہی تھی۔ اندر کاریڈور میں داخل ہونے کے بعد اس کے قدم پل بھر کو لڑکھڑائے تھے کہ اسی جگہ اس نے سمعان کو آخری بار دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ندامت کا کوئی عکس ہونے کے بجائے شکوہ تھا، گریز تھا اور کرختگی تھی۔ جیسے کہ اس نے نہیں، مشال نے دھوکا دیا ہو۔ جیسے کہ اس کے سپنوں کے شیش محل کو مشال نے پتھر مار کے توڑا ہو۔

سیڑھیاں عبور کر کے وہ اس کمرے میں داخل ہوئی تو کمرے میں سمعان اور کرن کو پایا۔ کرن بیڈ پر دراز لمبی لمبی سانسیں بھر رہی تھی۔ ایک پل کو تو مشال اسے پہچان ہی نہ پائی۔ کہاں وہ شفاف رنگت، مغرور تیکھے نین نقش والی لڑکی۔ سارے جہاں کو اپنے پاؤں تلے روندنے والی لڑکی۔ اور کہاں یہ سیاہ رنگت، مرجھائے نین نقش، پپڑیوں والے سیاہ ہونٹ، اندر دھنسی کمزور آنکھیں۔

مشال کو دیکھتے ہی کرن کی ان بیمار آنکھوں میں کچھ اشک چمکے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مشال اس کے قریب آئی، اس کے بیڈ پر بیٹھی اور اس کے گلے لگ گئی۔

دل کی دھڑکنوں میں ایک شور اُٹھا۔ پرانے غم پھر سے بل کھانے لگے۔ کرن دل کھول کے اس کے شانے پر آنسو بہانے لگی۔ اپنی ندامتوں کو اس کے آگے چھلکانے لگی اور وہ اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں ڈالے اسے ڈھارس دینے لگی، اسے چپ کرانے لگی۔ دوستی سے بھرے نرم ہاتھ اس کے وجود پر سایہ کرنے لگے۔

"میں تمہاری گناہ گار ہوں مشال! میں نے تم سے تمہاری محبت چھینی ہے، تمہاری وفاؤں کو پامالی دی ہے۔" روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

"نہیں کرن! تم کسی کی بھی گناہ گار نہیں ہو۔ جو میری قسمت میں نہ تھا، اس کا غم کیسا؟ تم تو میری دوست ہو ناں۔ اور دوست تو اپنے ہوتے ہیں۔ اپنوں سے بھی زیادہ قریب۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے۔" مشال نے اس کے آنسو پونچھے۔

"نہیں مشال! تم مجھ سے گلہ کرو...... شکوہ کرو...... لڑو مجھ سے...... بدلہ لو مجھ سے۔ تمہاری اسی چپ نے عرش کو ہلا ڈالا مشال!...... تمہاری اسی خاموشی نے مجھ کو سزا دی ہے۔ خدا کے واسطے اس چپ کو توڑو مشال!" کرن نے بے بسی سے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"تم نے جتنی سزا جھیلنی تھی، جھیل لی کرن! اب خدا نے تمہارے لئے خوشیاں چنی ہیں، جن کی تم حق دار ہو۔ کل انشاء اللہ تمہارا ٹرانسپلانٹ ہوگا۔ تمہیں نئی زندگی ملے گی۔

اپنی زندگی کی ہر خوشی دیکھو گی۔ اور جب دُکھ کی کانٹوں بھری راہوں کے بعد خوشی کی من چاہی منزلیں ملتی ہیں ناں تو بہت اچھا لگتا ہے۔ بھول جاؤ سب کچھ کرن! بھول جاؤ پلیز!" مشال کے لفظ محبت میں ڈوبے تھے۔

"پاپا! یہ آنٹی کون ہیں؟ اور ماما انہیں مشال کیوں بلا رہی ہیں؟" مشال کو عقب سے ایک معصوم سی آواز آئی۔ اس نے مڑ کے دیکھا، سمعان کی گود میں ایک ننھا سا، گول گوتھنا سا وجود تھا۔ پنک فراک میں بالوں کی دو چھوٹی سی پونیاں بنائے۔

"کیونکہ بیٹا! ان کا بھی نام مشال ہے۔ مشال احمد خان۔" سمعان نے اسے سمجھایا۔

"جس طرح میرا نام مشعال سمان شاہ ہے، اسی طرح؟" وہ بھی اسی معصومیت سے بولی اور سمعان اور مشال دونوں کے دل میں ایک ٹیس اُٹھی۔

"یہ میری بیٹی ہے۔ مشال۔ تمہاری ایک جیتی جاگتی یاد۔ جسے دیکھ کے پل پل مجھے تم یاد آئیں۔ اس نے تمہیں کبھی فراموش نہیں ہونے دیا۔" کرن نے ننھی مشال کو اپنے پاس بلا کے کہا اور مشال نے اسے پکڑ کے اپنی بانہوں میں تھام لیا۔

"آنٹی! آپ بھی مشال ہیں اور میں بھی......" وہ بہت پیار سے مسکرائی تھی اور مشال نے اسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

"اسے غور سے دیکھو مشال! تمہیں ایسا لگے گا کہ قدرت نے تمہیں تصور میں رکھ کے اسے بنایا ہو اور ہمارے آنگن میں تمہاری نشانی کے طور پر بھیج دیا ہو۔ ہے ناں؟" کرن کے کہنے پر مشال نے اس کے ننھے سے خال وخد کو دیکھا۔ اس کی لو دیتی آنکھیں، ننھی سی ٹھوڑی اور کشادہ ماتھا، مشال کی طرح تھا۔

"یہ تو تحفہ ہے تم دونوں کو اللہ کی طرف سے کرن! اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے؟ خدا اس کے سر پر تم دونوں کا سایہ ہمیشہ قائم رکھے۔" مشال کے دل سے دعا نکلی۔ کرن بھی قدرے ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔ ندامتوں کی گرد چھٹ چکی تھی۔

اگلے دن ٹرانسپلانٹیشن کا آپریشن تھا۔ پہلے مشال کو او ٹی میں لے جایا گیا۔ او ٹی کے باہر شاہ زیب فکرمند اور دعا گو کھڑا تھا۔ محبتوں کے امتحان کے لمحے تبھی ہوتے ہیں کہ جب محبوب کے بچھڑ جانے کے خدشے اور مل جانے کی اُمیدیں ساتھ ساتھ ہوں۔

ڈھائی گھنٹے کے بعد ڈاکٹر او ٹی سے باہر آیا اور آپریشن کامیاب ہونے کی خوشخبری انہیں سنائی۔ مشال کو آئی سی یو میں شفٹ کیا گیا۔

اگلے ہی دن کرن کا آپریشن کرنا تھا اور کڈنی لگانی تھی۔ تب تک مشال ہوش میں آ

چکی تھی اور کرن کے لئے دعا گو بھی تھی۔

کرن کی باڈی نے بھی مشال کی کڈنی ایکسیپٹ کر لی تھی اور اب اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ مشال کے جسم کا ایک ضروری پرزہ کرن کی زندگی کا باعث بن گیا تھا۔

اور کرن کو جب ہوش میں آنے کے بعد علم ہوا کہ اسے زندگی بخشنے والی مشال ہے، تو وہ اپنی آنکھوں پر بند باندھ نہ سکی۔ احساسِ تشکر اور پشیمانی تلے اور دبی جاتی تھی۔

"معاف کرنا ہی تمہارا بہت بڑا احسان تھا۔ اس نئے احسان کے بدلے میں تمہیں کیا دوں مشال؟" وہ نم آنکھوں سے بولی تھی۔

"اپنی زندگی بھر کی دوستی اور ڈھیر ساری دعائیں۔" مشال نے مسکرا کے اس کا ہاتھ تھاما۔

"میری ایک بات مانو گی مشال! تم سمعان سے شادی کر لو۔ سچ مانو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" کرن نے محبت سے کہا اور سمعان نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ کونے میں کھڑے شاہ زیب کے دل کی دھڑکنوں میں اتھل پتھل ہونے لگی۔

"نہیں کرن! سمعان تمہارا نصیب تھا اور تمہارا ہی رہے گا۔ میں اپنی تقدیر چمکانے کے لئے کسی کے مقدر کا ستارہ چھین تو نہیں سکتی ناں۔ میں چلتی ہوں۔ زندگی نے چاہا تو ہم پھر ملیں گے۔" یہ کہہ کے وہ کرسی سے اُٹھی، اپنی بیساکھیاں تھامیں اور جانے لگی۔ ابھی وہ دروازے سے باہر آئی ہی تھی کہ عقب سے اسے سمعان نے پکارا۔

"مشال! رُک جاؤ...... مشال! ایک بار پھر میری زندگی سے مت جاؤ...... مشال! کرن کی بات مان لو۔ مجھے اپنی غلطیوں کی تلافی کا صرف ایک موقع دو۔ میری بن جاؤ مشال!...... میری بن جاؤ۔" سمعان نے کہا۔ مشال کی آنکھیں پل بھر کو نم ہوئیں۔

"سمعان! اگر یہ بات تم مجھے تب روک کے کہتے، جب میں جا رہی تھی ہمیشہ کے لئے تمہاری زندگی سے، تو شاید میں پلٹ آتی۔ دنیا بھر کو ٹھکرا کے تمہارے سائے سے لپٹ جاتی۔ لیکن اب...... اب یہ باتیں میرے لئے نہیں ہیں سمعان! اب تمہاری محبت میرے لئے نہیں ہے...... اب تمہاری زندگی تمہاری کرن اور تمہاری مشال ہیں۔ ان دونوں کو اپنی محبتیں دو سمعان! ان دونوں سے اپنی خواہشیں منسلک کر دو۔ مجھے تنہا رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اور پھر دل کوئی پتھر تو نہیں ہوتا کہ جس پر کھینچی لکیر دوبارہ کبھی مٹ نہ سکے...... عشق کا مزاج بڑا آوارہ ہوتا ہے سمعان!...... یہ کسی کے بہلانے سے نہ بہلتا ہے اور اور نہ بلانے سے پلٹتا ہے۔ یہ تو بنا بلائے، بنا کہے ہوتا ہے اور پھر دلوں میں بس جاتا ہے۔ مجھے

سہاروں کے بغیر زندہ رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔"

یہ کہہ کے وہ پلٹی اور اپنی بیساکھیوں کے سہارے جانے لگی۔ سیڑھیوں پر ہی تھی کہ لڑکھڑا گئی اور کسی کی بانہوں نے اسے تھام لیا۔ اس نے دیکھا تو وہ شاہ زیب تھا۔

"اگر تمہیں سہاروں کی عادت نہیں ہے مشال! تو مجھے تو ہے...... میں تمہارے سہارے کے بغیر مر جاؤں گا...... مجھے تنہا مت چھوڑو۔" شاہ زیب کے لہجے میں محبتوں کے دیے روشن تھے۔

"مجھے بھی تو پل پل تمہاری ضرورت رہی ہے زیب! تم نے مجھے تب بھی چاہا، جب میری چاہت کسی اور کی تھی۔ تم نے مجھے تب بھی سنبھالا، جب مجھے سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ تم میرے تب بھی بنے، جب میرا بننے والا کوئی نہ تھا۔ مجھے صرف اور صرف تمہارے سہارے ہی کی ضرورت ہے۔" وہ اس کے کندھے پر اپنا وجود گرائے نم آنکھوں سے مخاطب تھی۔

"بس، اب روؤ نہیں...... بہت وقت برباد کر لیا تم نے رو دھو کے، تنہا رہ کے۔ چلو، اب نئی منزلیں تلاش کریں۔ نئے گھروندے جوڑیں۔ خوشیوں کے نئے گیت بُنیں۔ خواہشوں کی تتلیوں کو تھامیں۔ چلو، ایک دوسرے کے ہو جائیں۔" شاہ زیب کی آنکھوں کے کونے بھی نم ہو گئے تھے۔

"میں تمہاری ہوں زیب!...... میں صرف تمہاری ہوں۔"

"مجھے یقین ہے مشال!...... مجھے اعتبار ہے تم پر۔" اور پھر اعتبار ہی کی تو کمی تھی مشال کی زندگی میں۔ محبتوں کو بھی تو صرف اعتبار کی بیساکھیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن کے سہارے وہ تا عمر چل سکیں۔

"اب تمہیں ان بیساکھیوں کی کوئی ضرورت نہیں...... میں ہر قدم پر تمہارا سہارا بنوں گا مشال! چلو۔" وہ اس کے دونوں ہاتھوں سے بیساکھیاں لے کر، اسے اپنے ہاتھوں میں تھامے اس کے ہم قدم چلنے لگا۔

ہسپتال کے کاریڈور میں کھڑا سمعان شاہ، آوارہ مزاج عشق کی اس عجیب تکمیل کو دیکھتا رہا اور نم آنکھوں سے شاہ زیب اور مشال کے تا عمر ساتھ کی دعا کرنے لگا۔

عشق آوارہ مزاج، وہ مسافر تو گیا
نہ کوئی اس کی مہک ہے کہ جو دے اس کا پتہ
نہ کوئی نقش کفِ پا

نہ کوئی اس کا نشاں
کوئی تلخی بھی نہ جام نہ چھوڑی اس نے
ایک دُکھتا ہوا دل
چوٹ تھی جس پہ لگی
چوٹ ویسی تو نہیں
درد باقی تو نہیں
لاکھ مانے نہ مگر
کچھ پشیمان سا دل
یوں بدل جانے پر
آپ حیران سا دل
اس کو کیا اپنا پتہ
یہ ہے انسان کا دل
کوئی پتھر تو نہیں
جس پہ مٹی نہیں پڑ جائے جو اِک بار لکیر



تم میری آخری محبت ہو

نفرت تھی اسے احد صدیقی سے۔

نہ جانے کیا سمجھتا تھا خود کو۔ بہت اکڑتا تھا اپنی خوبیوں پر۔ ہر بات میں خود کو ماہر سمجھتا تھا، ہر فیلڈ کا راجہ سمجھتا تھا۔ کلاس میں چلتا کوئی لیکچر ہو، یا پھر بیت بازی کا مقابلہ، شعر لکھنے کا مقابلہ ہو یا پھر اسپورٹس، وہ خود کو بادشاہ سمجھا کرتا تھا۔ جنگل کا بادشاہ۔ اور اسے وہ لگتا بھی "جنگل" کا باشندہ تھا۔ وہ اکثر اس کا مذاق بھی جنگلی بادشاہ کہہ کے اُڑایا کرتی تھی۔

یوں تو وہ ہر کسی کو حرمین خان کے، جو واقعی اس کے مقابل تھی ہر فیلڈ اور ہر میدان میں، اور حقیقتاً اس کی Rival بن جاتی تھی۔ یوں بھی حرمین کو اکڑے ہوئے، نک چڑھے لڑکے زہر لگتے تھے۔ وہ ہر وقت اسے ہرانا چاہتی تھی۔ گویا یہ مشن اس کی زندگی کا اوّلین مشن بن گیا تھا، کہ ان نک چڑھے، ہر فن مولا لڑکوں کو مات دے سکے اور انہیں ان کی اوقات یاد دلا سکے۔

یوں تو اسکول، کالج میں اس طرح کے کئی پیس اس کے سامنے آئے تھے، لیکن احد صدیقی تھا بھی ماسٹر پیس۔ اپنی طرز کا اکلوتا ماڈل۔ نہایت کول رہنے والا، ہر وقت مسکرانے والا۔ لیکن انتہائی ڈھیٹ اور سازشی ذہن والا۔ جملہ بازی اور حاضر جوابی کا ماہر۔

اور آج بھی ان دونوں کا مقابلہ اُردو ایم اے کے لیکچر کی کلاس میں زوروں پر تھا اور موضوع تھا شاعر۔ بے چارے مرحومین شاعر حضرات کی شامت آئی ہوئی تھی۔ باقی تمام افراد خاموش تھے۔ پروفیسر شمسی کے ساتھ صرف حرمین خان اور احد صدیقی ہی کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

"آبجیکشن، آبجیکشن مائی لارڈ! مس خان بحث کو غلط موڑ پر لے جا رہی ہیں......از،

کا یہ کہنا کہ غالب ایک سطحی شاعر تھا، غالب جیسے عظیم شاعر کی بے حرمتی اور بے عزتی ہے۔
مانا کہ غالب کے آخری دور کی شاعری میں پینے پلانے اور مئے نوشی کا کافی عنصر ہے، لیکن
ہم اس بات سے منکر نہیں ہو سکتے کہ غالب ایک طے شدہ الہامی شاعر تھا۔" احد ا
مخصوص مدبرانہ اسٹائل میں بول کے لوگوں کو قائل کرنے لگا۔

"سر! میں یہ نہیں کہہ رہی کہ غالب سطحی یا غیر سطحی شاعر تھا۔ مسٹر صدیقی بحث کو غلط
لئے جا رہے ہیں۔ میں تو فقط یہ نقطہ اُٹھانا چاہ رہی تھی کہ غالب کی شاعری نے عشق مجاز
اِک نئی سمت عطا کی۔ غالب کے اندر کی بے باکی نے جس طرح خطوط سے مبہم انداز
تمثیلات ختم کیں، بالکل اسی طرح شاعری میں بھی محبوب اور شاعر کے درمیان
تکلفات کو ختم کیا۔ غالب وہ واحد شاعر تھا، اس وقت کا جو محبوب کے تصور سے نہیں،
کے وصال سے لطف لیتا تھا۔" حرمین نے بھی بھرپور حصہ لیا۔

"یو مین ٹو سے مس خان! کہ غالب ایک ٹھرکی شاعر تھا، جو محبوبہ کی آنکھوں میں اُتر
کی جگہ اس کی کھڑکی میں ڈائریکٹ اُتر جاتا تھا۔" احد کی بات پر کلاس میں ایک بھرپور ق
اُٹھا۔ حرمین کو اس پہ ٹوٹ کے غصہ آیا۔

"سر! پورَ فیلو کلاس میں چلنے والی نہایت ادبی اور شائستہ گفتگو کو غلط مطلب دے ر
ہیں۔ ان سے التجا ہے کہ ٹو دی پوائنٹ ہی بات کریں۔ میں نے غالب کے متعلق ایسا
غلط فقرہ استعمال نہیں کیا۔" حرمین نے اسے جتاتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ کا مطلب ضرور یہی تھا۔" وہ بولا۔

"جی نہیں........ اپنی ذہنیت کو درست کر لیجئے۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔" ح
کی آنکھوں میں بے پناہ غصہ تھا۔

"او کے........ بیٹھ جا یار! پٹھان پارٹی بھڑک نہ جائے۔" پیچھے سے ایک اور کلاس
نے کہا۔ سبھی کھلکھلا کے ہنس دیئے۔ حرمین کو بے پناہ غصہ آیا اس فقرے پہ۔ وہ بھی
کے بولی۔

"ہاں جی، جنگل کے بادشاہ ہیں۔ انڈے دیں یا بچے، کوئی کچھ کہے گا تھوڑ
حرمین کے کمنٹ پر لڑکیوں کی جانب سے ایک قہقہہ بلند ہوا۔

"کیپ کوائٹ کلاس! کل ہم ترقی پسند رائٹرز کو پڑھیں گے۔ منٹو، عصمت چغ
واجدہ تبسم کے کچھ افسانے زیرِ بحث رہیں گے۔ تمام اسٹوڈنٹس اچھی طرح سے تیار
آیئے گا۔" پروفیسر شمسی نے بحث کا اختتام کیا اور کلاس آف کر دی۔

"بڑا جیمز بانڈ سمجھتا ہے خود کو، نالائق کہیں کا۔" کلاس کے ختم ہونے کے بعد احد اپنے
دوستوں کے ہمراہ کسی بات پر ہنس رہا تھا، حرمین کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"تُو چھوڑ ناں یار! تجھے کیا اللہ واسطے کا بیر ہے اس سے؟" ثناء نے اسے بازو سے
کھینچا اور کلاس سے باہر لے گئی۔



اور اگلے ہی دن ترقی پسند رائٹرز کی شامت تھی۔ منظر نامہ قریب قریب وہی تھا۔ کلاس
کے چند ہونہار اسٹوڈنٹس بحث میں حصہ لے رہے تھے۔ حرمین اور احد انہیں لیڈ کر رہے
تھے۔

"میرے خیال میں عصمت چغتائی، منٹو سے زیادہ بہتر افسانہ نگار تھی۔ اس کے یہاں
احساسات خود بخود جملوں کی شکل اختیار کر جایا کرتے تھے۔ جب کہ منٹو اُلٹے سیدھے الفاظ
کا سہارا لے کر کہانی میں کرسپ پیدا کرنے کی ناممکن کوشش کرتا تھا۔" حرمین کے ہاتھ میں
بال پوائنٹ تھا اور وہ بڑے مفکرانہ انداز میں بال پوائنٹ والا ہاتھ ہلا ہلا کے بات کر رہی
تھی۔ اس کے سیاہ لمبے بال کیچر میں قید تھے اور لٹیں اس کی گوری چٹی رنگت پہ لہرا رہی
تھیں۔ احد صدیقی ایک رو چھوڑ کر اس کے سامنے والی ڈیسک پر بیٹھا تھا اور اس کی آنکھیں
بھی اس کی لٹوں میں اُلجھ رہی تھیں۔

"لیکن مس خان! منٹو کی روانی اور بے باکی سے انکار کرنا تو اس کے ساتھ ناانصافی
ہے۔" پروفیسر شمسی نے کہا۔

"بلاشبہ ہے سر! لیکن ادب صحیح معنوں میں اس کو کہتے ہیں جو ہم اپنی اگلی نسلوں تک
بے کم و کاست منتقل کر سکیں۔ اور میرا نہیں خیال، منٹو ایسا رائٹر ہے کہ جس کے افسانے ہم
اپنے بچوں کو سنا سکیں۔ بے مقصد Moral less کہانیوں کو ہم کیسے بچوں کے سامنے
دوہرا سکتے ہیں؟" حرمین پُر اعتماد تھی۔

"تو کیا مس خان! آپ عصمت چغتائی کے افسانے، اپنے بچوں کو سلاتے وقت
اریبین نائٹ اسٹوریز کی طرح پڑھ کے سنا سکتی ہیں؟" احد نے اپنے مخصوص انداز میں
کہا۔ سبھی کھلکھلا کے ہنس دیئے۔ حرمین جل کے رہ گئی۔

وہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ گندمی رنگت اس وقت سنہری محسوس ہو رہی تھی۔ اسکائی
کلر کی ٹی شرٹ اور بلیک جینز، وہ واقعی ایسا تھا کہ جس کے ساتھ کھڑا ہونا ہر لڑکی کے لئے
باعث فخر ہو سکتا تھا۔

"میرا تو خیال ہے سر! کہ منٹو نہ صرف احساسات کو بیان کرنے میں ماہر ہے بلکہ روحانیت کے بھید بھی جانتا ہے۔ اس کے افسانے "ٹھنڈا گوشت" کو پڑھیں گے تو یقین جائے گا کہ محبت دراصل روحانی ہوتی ہے کہ محبت میں سے روح کو نکال دیں تو جسم بیکار جایا کرتے ہیں۔ محبت کی پیاسی روح ہوتی ہے اور ہم جسموں کو دوشی ٹھہراتے ہیں، انھیں سیراب کرتے ہیں۔ اُس کے افسانے "بو" کو پڑھیں تو پتہ چلے گا کہ دراصل منٹو نے رو کو چھونے کی سعی کی ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک محبت اور قربت فقط روح کی خاطر ہیں ا روح کے لیئے ہی بنائے گئے ہیں۔" احد صدیقی یقین کے ساتھ بولا۔

پروفیسر شمسی سمیت سبھی اس کی سوچ کے قائل ہو گئے۔ سبھی نے اسے بے حد سراہا ا یقیناً اس کی یہ باتیں حرمین خان کی روح میں بھی اُتر رہی تھیں، اس کی روح بھی سیراب رہی تھی۔ نجانے اسے کیا ہوا کہ وہ مزید کوئی رائے نہ دے پائی۔ فقط کچھ جملے اور الفاظ جو اس کی سماعتوں میں رقص کر رہے تھے۔ وہ موجودہ وقت سے کہیں دور جانے لگی تھی کلاس میں کیا موضوع چلتا رہا، اسے پتہ ہی نہیں تھا۔ وہ فقط روح اور محبت کے درمیان دھاگوں میں اُلجھی رہی۔

"محبت سے روح نکال دیں تو جسم بیکار ہو جایا کرتے ہیں، محبت کی پیاسی روح ہو ہے اور جسموں کو سیراب کرتے رہتے ہیں۔"

وہ کھو ہی تو گئی تھی۔



دوسرے سمسٹر میں یونیورسٹی کا اینوئل فنکشن اناؤنس ہوا اور اسٹیج ڈرامہ کے لیئے اچھ اور قابل اسٹوڈنٹس سے رابطہ کیا گیا۔ حرمین اور احد بھی انہی قابل اسٹوڈنٹس کی صف میں تھے۔ رائٹرز گلڈ کا وہ دونوں پہلے ہی حصہ تھے۔ رائٹرز گلڈ کی میٹنگ ہوئی اور سبھی ممبرز موجو تھے۔ حرمین جب ہال میں داخل ہوئی تو سبھی کو اپنا منتظر پایا۔ میڈم جہاں آراء، فاروق کل کی ہیڈ کی حیثیت سے کرسی پر براجمان تھیں۔

"جی تو ڈیئر ممبرز! اس سال دو اسٹیج ڈرامے پیش کیئے جائیں گے۔ ایک تو اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کے گروپ نے سلیکٹ کر لیا ہے، دوسرا کرنا ہے۔ آپ میں سے کسی کے پاس آئیڈیاز ہوں تو پلیز شیئر کریں۔" میڈم نے ابتداء کی۔

"میں نے اور احد نے ایک کانسپٹ کو اسٹڈی کیا ہے۔ آسکر وائلڈ کا لکھا ڈرامہ ہے لیکن ہم اپنی طرف سے کچھ تبدیلیاں لانے کی کوشش کریں گے تو بہت نئی اور بہترین ج

بن جائے گی۔" سلمان علوی نے کہا۔

"اور میرا خیال ہے میڈم! آسکر وائلڈ اور شیکسپیئر بہت ہو چکے۔ پچھلے سال ہیلمٹ بھی ترجمے اور تبدیلیوں کے بعد دکھایا گیا تھا۔ میرا خیال ہے اس سال کوئی نئی تخلیق ہونی چاہیئے۔" نائلہ علی نے کہا۔

"یس.......شی اِز رائٹ۔ مجھے کوئی نئی تخلیق چاہیئے۔" میڈم نے تائید کی۔

"میرے پاس ایک بالکل نیا کانسپٹ ہے میڈم! ڈرامے کا نام ہوگا "مسیحا" اور کہانی دو کرداروں کے اردگرد گھومے گی۔" حرمین نے کہا۔

"مسیحا"........انٹرسٹنگ۔ آپ کچھ بریف کر سکتی ہیں اس کہانی کے بارے میں؟"

میڈم کے کہنے پر حرمین کہانی کے متعلق بتاتی رہی۔ وہ ہمیشہ کی طرح بہت پُر اعتماد تھی۔ احد اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کرتا رہا۔ اس کے جادوئی لفظوں میں، اس کے چہرے کی گلابی رنگت میں کھویا رہا۔ اس کے چہرے کی رنگت ہمہ وقت دودھ کی طرح اُجلی رہتی تھی۔ اور جب وہ بولتی تھی یا دھوپ میں کھڑی ہوتی تھی تو وہ دودھیا رنگت، گلابی پڑ جاتی تھی جیسے کہ کسی نے دودھ کے پیالے میں روح افزاء کے چند قطرے ڈال دیئے ہوں۔

"ویل ڈن حرمین! بہت خوب........ بہت نیا اور بہت منتخب کانسپٹ ہے۔ آپ اس پہ مزید کام کریں۔ بلکہ آپ ایسا کریں زرش اور احد صدیقی کو شامل کر لیں۔ اسکرپٹ لکھنے میں یہ دونوں آپ کی مدد کریں گے۔" میڈم نے سراہتے ہوئے کہا۔

"لیکن میڈم! احد صدیقی ہی کیوں؟" وہ احد کی جانب کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہ اس لیئے کہ احد صدیقی کی اسٹڈی ڈرامہ نگاری میں وسیع ہے۔ زرش انگلش لٹریچر کو پڑھتی ہے۔ ان دونوں کی مدد سے آپ کا کانسپٹ ایک بہترین ڈرامے میں تبدیل ہو سکتا ہے۔" میڈم نے حتمی طور پر کہا۔ حرمین مزید کچھ نہ کہہ سکی۔

اس طرح احد صدیقی اور زرش، حرمین کے ساتھ ڈرامہ نگاری کے لیئے منتخب کیئے گئے۔



"مجھے سمجھ نہیں آتی کہ جہاں آراء میڈم نے زرش کے ساتھ احد صدیقی ہی کو کیوں چنا مجھے اسسٹ کرنے کے لیئے؟ میرا مطلب، کوئی اور بھی تو ہو سکتا تھا۔ انیلہ علی تھی، نعمان خواجہ تھا، سہیل تھا اور انیلہ کی بہن نائلہ بھی تھی۔ پھر احد صدیقی ہی کیوں؟" پوائنٹ میں ساتھ بیٹھے حرمین نے ثناء سے کہا۔

"اس کی وجہ بھی میڈم تمہیں بتا ہی چکی ہیں۔ یہی کہ احد صدیقی کی اسٹڈی لٹریچر کے لحاظ سے بہت اسٹرانگ ہے اور یہ واقعی ماننے والی بات ہے۔ موصوف ہمیشہ لائبریری میں ہی پائے جاتے ہیں۔" ثناء نے ہوا میں اُڑتے اپنے سنہری بالوں کو چہرے سے ہٹایا۔

"وہ کہاں نہیں پایا جاتا، یہ بتاؤ۔ کیا نہیں کرتا وہ۔ ہر جگہ اپنے پاؤں پھیلائے رہتا ہے اور کہاں ہے اس کی اسٹڈی اسٹرانگ؟ وہ تو لکھنے والے کے نفس مضمون کو بھی نہیں چھو پاتا۔ وہ کہاں ڈرامہ لکھ پائے گا؟" حرمین بضد تھی۔

"لیکن اب تو فائنل ہو چکا کہ وہ تمہیں اسکرپٹ لکھوائے گا۔ تم تو یوں بھی اس سے خوامخواہ چڑتی ہو۔ اتنا بھی برا نہیں ہے وہ۔" ثناء مسکرائی۔

"زہر لگتا ہے مجھے وہ اور اس کی مطمئن ہنسی بھی۔" حرمین نے چڑ کر کہا۔ ثناء نے نفی میں گردن ہلائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ جانتی تھی، حرمین کو سمجھانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔"



اگلے ہی دن شروع کے پیریڈز کے بعد ایم۔ اے انگلش کی زرش کے ہمراہ احد اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"حرمین! چلو کسی بہتر جگہ بیٹھ کے ہم پلاٹ ڈسکس کرتے ہیں اور پھر لکھنے کی شروعات کریں گے۔" زرش نے کہا۔

"اوکے......میرا خیال ہے، لائبریری چلتے ہیں۔" وہ بولی۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ لائبریری میں ہم اس وقت جائیں گے جب اسکرپٹنگ کی شروعات ہو گی۔ فی الحال ہمیں ڈسکس کرنا ہے، جو لائبریرین ہرگز کرنے نہیں دے گا۔" احد بولا۔

"تو پھر کہاں چلیں؟" زرش نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے، کینٹین میں چلتے ہیں۔ موسم بھی کتنا مزے کا ہے۔ چائے پیتے پیتے ڈسکس کریں گے۔" احد نے خیال ظاہر کیا جو کہ حرمین کو بالکل بھی پسند نہیں آیا۔

"گڈ آئیڈیا! بارش میں چائے پینا مجھے ہمیشہ سے پسند ہے۔" زرش کھلکھلا دی۔

ہلکی ہلکی بوندوں میں وہ ان کے ہمراہ کینٹین کی جانب چل پڑی۔ زرش اور احد اس کے آگے آگے ہم قدم ہو کے چل رہے تھے اور زرش، احد کی باتوں پہ ہولے سے ہنس رہی تھی اور حرمین نہایت خاموشی سے ان کے پیچھے چل رہی تھی۔

نومبر کے مہینے میں پڑتی بوندیں جسم پہ ٹھنڈا ٹھنڈا سا احساس جگا رہی تھیں۔ چلتے چلتے احد نے پیچھے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ ہاتھ میں فائل اٹھائے چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتی زمین کی طرف دیکھتی چل رہی تھی۔ اس کا کاسنی ریشمی دوپٹہ ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔

"آپ کا کانسیپٹ بہت اچھا ہے۔ اس پہ ایک بہترین پلاٹ اور اسکرپٹ بنایا جا سکتا ہے۔" احد نے اپنے قدم آہستہ کیے اور زرش سے پیچھے ہو کے حرمین کے ساتھ چلنے لگا۔

"تھینک یو!" وہ محض اتنا ہی بولی۔

"آپ کو لکھنے لکھانے میں دلچسپی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں رائٹرز کی فیملی سے بی لانگ کرتی ہوں۔ میری والدہ اُردو کی مشہور افسانہ نگار تھیں۔ انہوں نے ڈائجسٹ اور رسالوں میں تیس سال تک لکھا۔ لکھنے کے جراثیم تو موروثی ہیں۔" وہ بظاہر زرش کی طرف دیکھ رہی تھی اور احد کے سوال کا جواب دے رہی تھی۔

"ویل ڈن......بہت خوب!" احد نے سراہا۔ چلتے چلتے وہ سب کینٹیریا کے پاس آگئے۔

"کینٹین تو پہنچ گئے ہیں۔ یہ تم کہاں چلتے چلے جا رہے ہو؟" زرش نے آگے بڑھتے ہوئے احد کو ٹوکا۔

"کیا تم لوگ اس تھرڈ کلاس کینٹین کی گندی کرسیوں پہ بیٹھ کے چائے پیو گے؟" وہ بولا۔

"تو پھر اور کہاں؟"

"گیٹ سے نکل کر دو قدم کے فاصلے پہ ہمارے نوشاد بھائی کا ڈھابہ ہے۔ دس روپے کی چائے کے کپ میں غضب کا ذائقہ ہے۔ اس کی اوپن ایئر چارپائیوں پہ بیٹھ کے اس موسم کو انجوائے کرنے کا مزا ہی اور ہے۔" احد کے لہجے میں بے پناہ کھنک تھی۔ زرش بھی کھلکھلا دی۔ زرش تھی بھی کچھ ایڈونچر پسند لڑکی۔ وہ حرمین کی طرح رزروڈ اور بور نہیں تھی۔ جدید تراش خراش کے کپڑے پہنتی تھی۔ آج بھی اس نے نیلی جینز کے ساتھ فیروزی کھلا کرتا پہنا تھا۔

یونیورسٹی گیٹ پھلانگنے کے بعد واقعی ذرا سے فاصلے پہ کیفے سعید کا بورڈ نظر آیا، جس کے باہر چار پانچ عام سی چارپائیاں رکھی تھیں۔ وہ تینوں بھی انہی میں سے ایک چارپائی پہ بیٹھ گئے۔ بوندیں برسنا اب بند ہو گئی تھیں مگر سفید بادلوں نے اپنے وجود سے پورا نیلا

آسمان ڈھک رکھا تھا۔

''نوشاد بھائی! مہمان لایا ہوں۔ ذرا تین اسپیشل کپ چائے لانا۔'' احد نے بڑے اسٹائل سے کہا اور آلتی پالتی مار کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور حرمین دل ہی دل میں کڑھتی رہی کہ یہ بھی کوئی جگہ ہے بھلا پلاٹ ڈسکس کرنے یا اسکرپٹ لکھنے کی، حتیٰ کہ چائے پینے کی؟ اگر اسے کسی نے یہاں دیکھ لیا تو کتنا مذاق اُڑایا جائے گا اس کا۔ کتنی انسلٹ ہوگی اس کی اتنے ویل آف بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھنے والی حرمین خان معمولی سے ڈھابے میں چارپائی پہ بیٹھ کے چائے پی رہی ہے۔

یہ احساس شروع میں تو بہت ہی گہرا تھا لیکن آہستہ آہستہ وقت گزرتا رہا اور یہ احساس معدوم ہوتا گیا۔ اس خوبصورت موسم میں وہ خاص ذائقے دار چائے کی پیالی پینا، احد کی مسکراہٹیں اور لطیفے سننا، اس کی جادوئی باتوں میں ایک کشش تھی۔ وہ مسلسل بول رہا تھا اس کے بولنے کی رفتار بہت زیادہ تھی۔ موسم، لٹریچر، یونیورسٹی فیلوز کے متعلق بولتے بولتے وہ بہت اچانک حرمین کے کانسپٹ کی طرف نکل گیا اور اس نے اسکرپٹ اور مناظر کے متعلق ایسے ایسے آئیڈیاز دیئے کہ حرمین خود حیران رہ گئی۔

یہ ملاقات یادگار تھی اور خوب صورت بھی۔ اس کا احساس اسے ملاقات کے اختتام پر ہوا تھا۔



محبت، کائناتی وسعتوں سے بھی
کہیں آگے کی، لامحدود وسعت ہے
کسی چہرے کو آنکھوں اور خوابوں کی دعا پر نقش کرنا
اور اس کے بارے میں سوچنا
اور اپنی ہر خواہش کو بس اس ذات تک محدود کر لینا
کبھی مل کر کسی سے
بے خبر، آدھے سمندر تک سفر کرنا
شبوں کے گنبدوں میں گونجتی، بے چینیوں کے درمیاں رہنا
ہمیشہ بے خیالی میں
ستاروں، چاند، تاروں، بادلوں پر
اس کے بارے میں کوئی جھلملاتی بات لکھ دینا

یا پھر لکھ کر مٹا دینا
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
بہت ہی رُوٹھ کر، ناراض ہو کر
اس کے چہرے کو ہمیشہ کھوجتے رہنا
وہ مانے یا نہ مانے، بس اسے لکھنا
اسے کہنا، محبت ہے......!

''حرمین خان! تمہارا تصور مجھے قرار لینے کیوں نہیں دیتا؟'' اسکرپٹ کے پیپرز سامنے رکھے تھے، جن پہ فقط چند سطریں ہی وہ لکھ سکا تھا۔ بار بار حرمین کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا۔ وہ بار بار اسے جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''فار گاڈ سیک حرمین! مجھے لکھنے دو۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال پکڑ کے سر کے بال زور زور سے ہلانے لگا۔

''کیا ہے یہ؟...... وہاٹ اِز دِس؟...... کیوں سوچ رہا ہوں میں تمہیں؟...... کیوں لکھ رہا ہوں میں تمہارا نام؟...... کیا ہو گیا ہے مجھے؟'' وہ نفی میں گردن جھٹکنے لگا اور لکھنے کا ارادہ ترک کر کے ٹیبل سے اُٹھا اور اپنی جیکٹ پہننے لگا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' اس کے روم میٹ، سہیل نے پوچھا۔

''ذرا ہائی وے پہ واک کرنے جا رہا ہوں...... آ جاؤں گا جلدی۔'' موبائل فون اپنی جیب میں ڈالتا وہ ہاسٹل کے کمرے سے نکل آیا۔

باہر جامشورو کی ٹھنڈی سڑک تقریباً سنسان تھی۔ بس گاڑیوں کا شور تھا، جو رات کے سناٹے میں ایک گونج پیدا کرتا اور پھر خاموشی چھا جاتی۔

سامنے یونیورسٹی کی امپلائز کالونی تھی اور کچھ ہی فاصلے پر ماروی ہاسٹل، جہاں کسی کمرے میں احد صدیقی کی بے قراری کی وجہ محوِ خواب ہوگی۔

وہ تارکول کی بنی سڑک پہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا چلنے لگا۔ ایک گولڈ لیف کی سگریٹ بھی سلگا لی تھی۔

''کیا ہے اس لڑکی میں؟...... کیوں اس کا خیال بار بار مجھے پریشان کر رہا ہے؟...... وہ نک چڑھی، خود پسند، گھمنڈی لڑکی، جس کی آنکھوں سے میرے لئے فقط نفرت کے شعلے اُبلتے ہیں، وہ لڑکی کیوں میری نیندیں اُڑا رہی ہے؟...... کیا مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے؟ محبت؟...... محبت؟...... محبت؟'' وہ خود سے سوال کر رہا تھا۔

"مگر کیوں؟ کس لئے؟ کس طرح؟" سگریٹ پہ سگریٹ سلگ رہی تھی۔ اسی طر
سوال غل مچا رہے تھے اور ہر چیز کے اوپر حاوی ہو رہا تھا، ایک دودھیا، چاند سا معصوم چہر
شفاف جھرنوں کی بہتی آنکھیں اور ان کی ستاروں ایسی چمک۔ جامشورو کی ٹھنڈی پڑ
رات کے سنسان آکاش میں ستارے اپنی جگمگاہٹ بکھیرتے رہے۔



اور اگلے ہی دن وہ اپنی دھن میں مگن یونیورسٹی کی جانی پہچانی راہگزر پہ سیٹی پہ کو
دھن بجاتا جا رہا تھا۔ موسم بے حد اچھا تھا۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی اور دُھند تھی اور آسمان
بادل اور کہرا ایک ساتھ زمین پہ چھائے تھے۔ یونیورسٹی کے احاطے کے اندر قدم رکھتے ہ
سفید اور پیلے پھولوں والی سڑک شروع ہو گئی تھی۔ یہ سڑک احد کو بے حد پسند تھی۔ سفید ا
پیلے ننھے ننھے پھول بے پناہ سبزے کے ساتھ کھلے ہوئے تھے۔ وہ اپنی دُھن میں مگن آگ
ہی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

ذرا آگے جا کے اس نے لڑکوں کا رش دیکھا اور اس رش کے بیچ اسے حرمین کا چہرہ نظر
گیا۔ چاہتا تو وہ نظر انداز کر کے آگے بڑھ سکتا تھا مگر بے ارادہ اور بے اختیار ہی اس ک
پاؤں آگے کی طرف بڑھ گئے۔ وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ حرمین کا دوپٹہ کانٹوں بھر
جھاڑی میں بری طرح پھنسا ہوا ہے اور وہ اسے احتیاط سے نکالنے کی کوشش کر رہی ہے
اس کے دوسرے ہاتھ میں فائل اور کتابیں ہیں۔ لڑکے اس کی مدد کرنا چاہ رہے تھے مگر
مسلسل انکار کر رہی تھی۔

"پلیز! آپ چھوڑ دیں، میں نکال لیتا ہوں۔" ایک کلاس میٹ نے پیشکش کی۔

"تھینکس! میں نے کہا ناں، میں نکال لوں گی۔" وہ بے رُخی سے بولی۔

اچانک احد وہاں آیا اور اس کا دوپٹہ چھڑانے لگا۔ بنا پوچھے، بنا سوال کئے یا اجاز
مانگے، بہت حق، بہت استحقاق سے۔ اور حیرت انگیز طور پر اس نے بھی اسے نہیں روکا
باقی لڑکے ایک ایک کر کے وہاں سے چلے گئے۔ ذرا سی احتیاط اور کوشش کے بعد دوپٹ
وہاں سے نکل آیا۔ احد نے اسے اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے بہت خاموشی سے اس سے
لے لیا اور اسی خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔



"میں چھٹیوں میں اٹک جا رہی ہوں۔ دو ماہ وہیں گزاروں گی۔" حرمین نے کتاب
پڑھتے پڑھتے اچانک ہی ثناء سے کہا تھا۔ رات کا کوئی دس گیارہ بجے کا وقت تھا اور دونوں

ک رہی تھیں۔

"میں بھی سکھر جاؤں گی۔ یوں تو ہمارے سکھر میں چھٹیاں انجوائے کرنے کے لئے
لی خاص جگہ نہیں، لیکن پھر بھی گھر تو ہے۔ میں تو دو ماہ خوب سوؤں گی۔" ثناء نے مزے
لے کر کہا۔

"سوتی رہنا۔ ایگزام یہاں پہ تمہارے فرشتے دیں گے۔" حرمین نے کہا۔

"کاش! فرشتے ایگزام دے دیتے۔ دو فرشتے تو کندھوں پہ بیٹھے لکھتے رہتے ہیں۔
ل ایگزامینیشن ہال میں آ کے ہماری طرف سے لکھ دیتے۔" ثناء نے خوش ہو کے کہا۔

"تمہیں جتنی نیند کی بیماری ہے ناں، تمہارے فرشتے بھی اتنا ہی سوتے ہوں گے۔ کسی
ام کے نہ ہوں گے۔" حرمین نے اسے چھیڑا۔

"اچھا بند کرو اپنا یہ ٹاپک اور بتاؤ، قصہ چہار درویش کو اپنے لفظوں میں لکھا کہ نہیں؟"

"تو جان چھوڑ دے قصہ چہار درویش کی۔ صبح کر لینا۔ فی الحال میرا موڈ نہیں۔" ثناء
اس کی کتاب چھین کے بند کر لی۔

"تو کیا کرنے کا موڈ ہے محترمہ؟" وہ بولی۔

"باہر سردی میں واک کرنے کا موڈ ہے۔" ثناء نے آنکھ دبائی۔

"باہر کہاں؟........ کاریڈور میں؟"

"ارے نہیں یار! ہاسٹل کے باہر، مین روڈ پہ۔" ثناء نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن وارڈن کو کیا کہو گی؟" حرمین نے حیرانی سے پوچھا۔

"دفع کرو وارڈن کو........ اس پھولن دیوی سے نمٹ لوں گی اگر اسے پتہ چلا تو۔ تو
فی الحال۔"

ثناء اسے کھینچتی اندر کمرے میں لے گئی۔ اس نے سیاہ رنگ کی شال اوڑھی جس پہ
ل پھول بنے ہوئے تھے۔ ثناء نے بھی ایک سوئیٹر لے لیا اور دونوں بہت خاموشی سے
ہاں سے آنکھ بچا کے ہاسٹل سے باہر نکل آئیں۔

دھند سے بھری خنکی میں دونوں واک کرنے لگیں۔ خاموشی اور سناٹا تھا۔

"کس سوچ میں گم ہو محترمہ؟" ثناء نے اسے ٹوکا۔

"اپنے اسکرپٹ کے متعلق سوچ رہی تھی........ کہانی بہت Unusual قسم کی ہے۔
ی انوکھا عشق، جو کہ آج کے دور میں پایا ہی نہیں جاتا۔" وہ بولی۔

"کس قسم کا عشق ہے یہ، جو ناپید ہے؟" ثناء نے دلچسپی لی۔

"ایسا عشق کہ جو ہوش وحواس پہ حاوی ہو جاتا ہے۔ جس میں انسان کا اپنا آ
انسان کی ذات سرے سے ہی مٹ جاتی ہے۔ کچھ نہیں بچتا اس کے پاس، سوائے اس
جو اس کا عشق ہوتا ہے۔ تصور ہی تصور میں اسے اپنے اندر بساتے وہ اپنا آپ کھو دیتا ہے۔"
حرمین نے گہرائی سے بیان کیا۔

"وہ کیا کہا ہے شاعر نے ۔

"اچھا خاصا بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا ہوں
اکثر میں اب، میں نہیں رہتا، تم ہو جاتا ہوں"

ثناء نے شعر پڑھا۔

"ہاں...... کچھ اسی طرح کا عشق، کہ جو اپنی ذات بھلا دے۔ بس اسی کی ذ
سامنے رہے۔ اپنا جینا مرنا کوئی حیثیت نہ رکھے۔ دنیاوی ہر چیز فنا ہو جائے، فقط عشق
رہے۔" حرمین کے چمکتے الفاظ اس کے روشن ذہن کے آئینہ دار تھے۔

"بہت خوب...... کہاں تک پہنچا تمہارے اس عشق کا اسکرپٹ؟" ثناء نے پوچھا۔

"میں نے کچھ حصہ لکھ لیا ہے، باقی احد صدیقی لکھ رہا ہے۔ کل میٹنگ ہے پھر ا
کسی اور ساتھی کے ساتھ ڈرامے کی میکنگ میں حصہ لے رہی ہے۔ ایکٹرز ڈھونڈ
ہے۔ کردار تو فقط دو ہی ہیں، امان اور ثانیہ کے۔ ثانیہ کے کردار کا زیادہ تر حصہ میں نے
ہے، باقی احد صدیقی نے۔"

چلتے چلتے وہ دونوں ہاسٹل سے کافی دور آ گئی تھیں۔ ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ ح
اپنی شال میں مزید سمٹتی جا رہی تھی۔ ذرا دور ہائی وے پہ سیمنٹ کے بنے سنگ میل پہ ا
ایک شخص نظر آیا۔ عام سے شلوار قمیض میں، سردی سے بالکل بے نیاز، ہاتھ میں سگر
دبائے۔ سگریٹ سے نکلتا دھواں فضا کی دھند میں تحلیل ہو رہا تھا۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟ اتنی سردی میں اکیلا کھڑا ہے۔" حرمین نے پوچھا۔

"مجھے تو احد صدیقی لگ رہا ہے۔ بات کرنی ہیں تو چلیں اس کے پاس؟" ثناء بو

"پاگل ہو گئی ہو کیا؟...... ہاسٹل میں اسکینڈلز کتنی جلدی بن جاتے ہیں۔ رات
اس پہر، بنا انفارم کیئے ہم نکل آئے ہیں۔ کسی نے اس سے بات کرتے دیکھ لیا تو بہ
اسکینڈل بن جائے گا۔" حرمین نے گھبرا کے کہا۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ لیکن یہ اتنی رات گئے یہاں کر کیا رہا ہے؟" ثناء کو تش
ہوئی۔

"آیا ہوگا ملنے کسی ہاسٹل کی لڑکی سے، یا پھر سگریٹ پھونکنے آیا ہوگا۔" حرمین نے چڑ
کے کہا۔

"تمہیں اُس غریب سے آخر پرابلم کیا ہے؟...... کیوں ہر وقت اس کے پیچھے پڑی
رہتی ہو؟"

"زہر لگتا ہے مجھے یہ۔ مردوں کی انتہائی بری قسم میں سے ہے۔" حرمین نے شکل بنائی۔

"اس طرح کی نفرتیں ہی اکثر محبتیں بن جایا کرتی ہیں۔" ثناء نے اسے چھیڑا۔

"محبت۔ ہونہہ۔ میں تو احد صدیقی کو نفرت کے قابل بھی نہیں سمجھتی۔ جس شخص پہ کبھی
اعتبار ہی قائم نہ ہو سکے، اس سے محبت کیا خاک ہو گی؟" حرمین نے ناک سکیڑ کے کہا۔

"پتہ نہیں، اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟...... ذرا سے اختلافات ہو جایا کرتے ہیں،
مگر اس قدر نفرت، میری تو سمجھ سے باہر ہے۔" ثناء نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"اچھا، چلو تم واپس۔ وارڈن کو پتہ چل گیا تو بہت برا ہوگا ہمارے ساتھ۔"

حرمین واپسی کے راستے پر اسے کھینچتی لے گئی لیکن مڑ کے ایک بار احد صدیقی کی
طرف دیکھا ضرور تھا، جو رات کی تاریکی میں کسی کھنڈر میں سجا، کیشو کا وہ بت لگ رہا تھا،
جس کے ہاتھ میں بانسری ہوتی ہے۔ نجانے یہ خیال کیوں حرمین کے دل میں آیا تھا کہ احد
بھی کیشو کی طرح بہت اچھی بانسری بجا لیتا ہوگا۔

اور احد صدیقی نے اسے مڑ کے دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ خوش فہمی کے احساس نے
دل میں چٹکی لی اور پہلے سی بے قراری کہیں کھو سی گئی۔



اگلے ہی دن اسے احد صدیقی نے اپنا لکھا اسکرپٹ پکڑایا۔

"میں نے اپنی طرف سے پورا پورا انصاف کیا ہے اسکرپٹ کے ساتھ۔ باقی اگر کوئی
تبدیلی آپ چاہیں تو بلاشبہ کر سکتی ہیں کہ یہ کانسپٹ آپ کی تخلیق ہے اور آپ کو مکمل حق
حاصل ہے اپنی طرف سے کہانی کو بدلنے کا۔" وہ بہت پُر اعتماد تھا۔

"اوکے، فائن۔ کل تو چھٹی ہے۔ ایسا کرتے ہیں، پرسوں فائنل میٹنگ رکھتے ہیں۔
اب تک میں یہ اسکرپٹ پڑھ کے مکمل طور پہ لکھ لوں گی اور پھر ہمارا کام مکمل۔ آگے پھر
ماڈل اور ڈرامہ بنانے والوں کا کام ہے" وہ بہت لئے دیئے انداز میں بولی اور اسکرپٹ کا
پلندا سنبھالتی آگے بڑھ گئی۔

احد صدیقی کی آنکھوں نے حد نظر تک اس کا تعاقب کیا۔ جب وہ آنکھ سے اوجھل

ہوئی تو وہ واپس مڑ گیا۔

رات کی تنہائی میں احد کے ہاتھ سے لکھا اسکرپٹ اور اس کے الفاظ ٹیبل پہ بکھرے پڑے تھے۔ وہ مکمل طور پہ اس کے لفظوں کے سحر میں کھوئی گئی تھی۔

"میں نے ایک کہانی پڑھی تھی ثانیہ! کہ جس میں کیشو کے پتھر کے بت پہ رمبھا کا... پڑجاتی ہے۔ کیشو کو زندگی میں کبھی کسی سے محبت نہیں ہوئی، سوائے اپنی وینا کے۔ لیکن ا... کو دیکھ کے وہ دیوانہ ہو جاتا ہے، اپنا آپ کھو دیتا ہے اور رات کے وقت اپنے شیو... کرتا ہے کہ اس میں جان ڈال دی جائے تاکہ وہ رمبھا کی محبت حاصل کر سکے...... دیکھ کے میرے اندر بھی کچھ اس طرح کی دیوانگی آگئی ہے ثانیہ!...... تم نے بھی مجھے سے انسان بننے پر مجبور کر دیا ہے۔"

احد کے ہاتھ سے لکھے ڈائیلاگ پہ وہ حیران رہ گئی۔ پچھلی رات ہی تو احد کو تار... کھڑا دیکھ کر اسے کیشو کا خیال آیا تھا اور آج اس نے احد کے ہاتھ سے وہی سب ک... دیکھا تھا۔

وہ حقیقی طور پر احد کے ہاتھ سے لکھے لفظوں میں کھوئی گئی تھی اور سوچ رہی تھی ک... طرح لکھ لیتا ہے یہ شخص اتنے اچھے الفاظ؟ اتنے نرم، ملائم جذبات کا ادراک کس طرح... ہے اس کو؟...... محبت میں مٹ جانے کی وہ تھیوری، جو خود حرمین نے اپنی کہانی... ڈیویلپ کی تھی، اس تھیوری کی ہو بہو عکاسی احد کے الفاظ کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا ک... یہ تمام کا تمام اسکرپٹ کسی ایک فرد نے لکھا ہے۔ احد اور حرمین دونوں ہی کے ا... یکساں تھے۔



اور اس رات وہ سوئی تو تمام کی تمام رات اس کی احد کے ہمراہ گزری۔ اُس... خواب میں دیکھا کہ ایک پرانا مٹی کا اور پتھر کا کھنڈر ہے، جہاں کیشو کا بت ہے، جس... ہاتھ میں صدیوں پرانی وینا ہے۔ حرمین آتی ہے اور اس بت کے پاس بیٹھ جاتی... ڈھلتی ہے، رات ہوتی ہے اور کیشو کا بت احد کا روپ دھار لیتا ہے۔ اس میں جان... ہے۔ وہ اپنی رمبھا یعنی حرمین کے لئے اپنی وینا بجاتا ہے۔ اس وینا میں سے ایک... دھنیں نکلتی ہیں، جو زمین و آسمان کو لرزا دیتی ہیں۔ چاروں طرف محبت کا نور چھا جا... یوں لگتا ہے کہ ستارے، چاند، بادل، کہکشاں سبھی کچھ احد کی وائلن کی دھنوں پہ جھو... ہیں، گا رہے ہیں۔ وہ بھی آنکھیں موندے اس کی گردن سے اپنا سر ٹکائے، بیٹھ...

کھوئے انداز میں بیٹھی ہے۔ اچانک وینا کی تار سے احد کا ہاتھ کٹ جاتا ہے اور خون کی ایک دھاری اس کے ہاتھ سے نکلتی ہے۔ حرمین گھبرا کے اپنا دوپٹہ اس کے ہاتھ پہ باندھ دیتی ہے۔

اچانک اُس کی آنکھ کھلی اور وہ تڑپ اُٹھی۔ کچھ سنبھل کے اس نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھے گلاس والا پانی لیا۔ وہ خواب کو خواب ہی سمجھی تھی۔ پھر دوبارہ اس نے سونے کی کوشش کی، لیکن خواب کا منظر اب اسے سونے ہی نہیں دے رہا تھا۔

یہاں تک کہ سحر ہونے لگی اور فضا میں اذان کی آوازیں بکھرنے لگیں۔



"بہت پرفیکٹ اسکرپٹ ہے حرمین! ویل ڈن۔ اور احد! آپ نے بھی خوب لکھا ہے۔" میڈم جہاں آراء اسکرپٹ پڑھ کے بولیں۔

"تھینکس میڈم! لیکن اصل محنت حرمین خان کی ہی ہے۔ پلاٹ ان کا تھا، کردار اور کانسپٹ ان کا تھا۔ میں نے کچھ خاص نہیں کیا۔" وہ مروت سے بولا۔

"یس...... آف کورس! کریڈٹ انہی کو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے، آج سے ریہرسل اسٹارٹ کروا دیں زرش! پلے میں دس دن ہی باقی ہیں۔" میڈم نے زرش کو مخاطب کیا۔

"اوکے میڈم!...... تمام کرداروں کے لئے ہم نے فنکار سلیکٹ کر لئے ہیں، لیکن بیک گراؤنڈ تھیم کے لئے ہمیں ایک وائلن بجانے والے کی ضرورت ہو گی۔ کیونکہ حرمین کے کانسپٹ کے مطابق وائلن کا میجر رول ہے پلے میں۔" زرش نے کہا۔

"دور کیوں جاتی ہے مس زرش! کیا آپ کو نہیں پتہ کہ احد صدیقی بہت اچھا وائلن پلے کرتا ہے۔" سلمان نقوی نے کہا۔ سبھی سمیت حرمین نے بھی احد کو دیکھا۔

"واقعی احد! تم وائلن بھی بجا لیتے ہو؟" زرش بے حد خوش ہوئی۔

"بس، یونہی تھوڑا بہت۔" وہ مسکرایا۔

"اوہ گریٹ! سارے فنکار تو گھر میں ہی مل گئے۔ اگر تم ذرا بجا کے دکھاؤ گے تو کچھ آئیڈیا ہو جائے گا۔" زرش بولی۔

"شیور۔ لیکن وائلن ہے کہاں؟"

"میوزک روم میں ایک پرانا وائلن موجود ہے۔ اگر تم ابھی چل کے سنا دو کچھ تو کل ریہرسل میں تم بھی شامل ہو جانا۔"

زرش کے کہنے پر سبھی نے اتفاق کیا۔ وہ بھی کچھ کہہ نہ سکا اور اُٹھ کے ان کے ساتھ

میوزک روم جانے لگا۔

"تم نہیں آ رہیں حرمین؟" زرش نے اسی طرح بیٹھی حرمین سے پوچھا۔

"نہیں زرش! آپ لوگ جائیں...... مجھے ذرا مارکیٹ تک جانا ہے۔ کچھ شا
کرنی ہے۔" اس نے معذرت کی۔

احد کی آنکھوں میں جلتی روشنیاں یکا یک مدھم پڑ گئیں۔ نجانے اس لڑکی کی موج
میں ایسا کیا تھا کہ دل پہ اک خاموشی سی چھا جاتی تھی۔

اگلے دن اسکرپٹ کی فائنل میٹنگ کی غرض سے حرمین، آڈیٹوریم میں داخل ہو
زرش نے پہلے اسے ان اسٹوڈنٹس سے ملوایا جو کہ ڈرامے کو ایکٹ کرنے والے
حرمین ان سے مل کر بہت مطمئن ہو گئی۔ پھر زرش نے احد کو وائلن بجانے کو کہا۔

آج احد اپنا ذاتی وائلن اٹھا لایا تھا۔

زرش کے کہنے پر احد نے اپنے وائلن کی سیاہ چکنی سطح پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس
تاروں کو آہستہ سے چھوا اور اسے اٹھا کے وہ آڈیٹوریم میں بنی ایک کھڑکی کے پاس کھڑ
گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پہ گہری سنجیدگی چھائی تھی۔ پھر اس
وائلن اپنے کندھے پہ رکھا اور بجانے لگا۔ کسی نغمے کی دلفریب دُھن اس کی تاروں سے
رہی اور حرمین کے دل کے خاموش کواڑوں کو کھولتی رہی اور دُور کہیں روح کی رگ و پے
روشنی کی طرح پھیلتی رہی۔

حرمین کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ وہ کھو سی گئی۔ زمان و مکان کی قید
آزاد ہو کے احد کے وائلن کے ہمراہ دور کہیں سفر کرنے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے
پرانے کھنڈر میں کیشو اپنی وینا بجا رہا ہے اور اس کی رمبھا اس کے کندھے سے لگی اس
دُھن سن رہی ہے۔

احد کی آنکھیں بھی حرمین کے چہرے پر بھٹک رہی تھیں۔ اس کا صبیح چہرہ دیکھ کے اح
پھر وہی بے قراری چھا گئی تھی، جو روز رات کو اس کا چین چھین لیا کرتی تھی۔ وہ بہت
قراری سے وائلن بجانے لگا۔ اب ایک تیزی اور رفتار سی پکڑ لی تھی اس کے ہاتھ نے۔
یوں لگ رہا تھا، حرمین اور احد ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے ہیں۔

اچانک...... بہت اچانک، احد کا وہ ہاتھ جس نے وائلن تھام رکھا تھا، تاروں
درمیان آ گیا اور تار سے ٹکرا کے زخمی ہو گیا۔

"آہ......" احد نے تار ہٹائی اور خون بہتے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔

دُھن کے بند ہوتے ہی حرمین کی آنکھ کھلی۔ جیسے وہ نیند سے جاگی تھی۔ احد کے ہاتھ
بہتا خون دیکھ کے وہ تڑپ اٹھی اور دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ اسے احساس ہی نہ
کہ یہاں ان کے علاوہ بھی کچھ اور لوگ موجود ہیں۔ اس نے اپنے کاسنی دوپٹے کو پھاڑا
اسے احد کے ہاتھ پہ باندھ لیا۔ احد خود بھی حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اسے کیا ہو گیا
۔ ذرا دیر بعد حرمین کو بھی احساس ہوا کہ اس نے کیا کر دیا تھا۔

ہو بہو، خواب کا منظر حقیقت بنا تھا۔

شرمندگی، خجالت کا عجیب احساس تھا اس کے اوپر۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی سعی کی
اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کے آڈیٹوریم سے باہر آ گئی۔ احد حیران آنکھوں سے کبھی اپنے ہاتھ پہ
ھی پٹی کو دیکھتا تو کبھی اس دروازے کو، جہاں سے وہ ابھی ابھی گئی تھی۔



چھٹی کے بعد وہ کلاس روم سے باہر آئی تو احد صدیقی اسی کا منتظر تھا۔

"اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو ذرا میری بات سنیے۔" احد نے اسے کہا۔ اس کے
پہ اب بھی وہی پٹی بندھی تھی۔

"وائے ناٹ۔ کہیے۔" وہ بولی۔

"یہاں نہیں، یہاں رش ہے۔ کیفے چلیں؟" اس نے پیشکش کی۔

"نہیں، کیفے تو نہیں۔ البتہ یونیورسٹی گیٹ تک میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔ میرا خیال
اس دوران آپ کی بات مکمل ہو جائے گی۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"تو پھر چلیے۔" دونوں چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتے آگے چلنے لگے۔

"دراصل میں شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔" وہ واقعی اس کا مشکور تھا۔

"شکریہ کی تو کوئی بات نہیں۔ مگر اس وقت نجانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں آپ کے
ن کی دُھن میں اس قدر کھو گئی تھی کہ آپ کو بتا نہیں سکتی۔ اور اس کے بعد جو کچھ بھی میں
ا، وہ میں نے خود نہیں کیا۔ یوں لگتا ہے جیسے مجھ سے کروایا گیا ہو۔" وہ پہلی بار احد
لی اور اپنائیت سے بات کر رہی تھی۔

"لیکن مجھے بہت اچھا لگا یہ سب۔ آپ کو میری دُھن کیسی لگی؟" وہ بولا۔

"بہت اچھی...... بہت ایمانداری اور لگن سے بجایا آپ نے وائلن۔" اس نے دل
ریف کی۔

"وائلن تو میری روح ہے۔ اور یوں بھی فنکار کو اپنے ساز سے محبت کرنی ہی پڑتی

ہے۔ جب تک محبت رہے گی، ساز بھی عمدہ بجے گا۔" احد نے کہا۔

"محبت آدمی ایک ہی بار کرسکتا ہے ناں؟" حرمین نے کہا۔

"ایک سے زیادہ چیزوں سے بھی محبت کرسکتا ہے۔ وہ وائلن ہو یا پھر کوئی شخص ہو یا پھر کوئی فن۔" احد پُر اعتماد تھا۔

"لیکن اپنا آپ کھونے کے لئے تو ایک محبت ہی کافی ہوتی ہے۔" حرمین نے دیا۔ احد خاموشی سے اسے دیکھتا ہے۔

'کیا اسے کسی سے محبت ہے؟ کیا وہ محبت کی آگ میں سلگنا جانتی ہے؟ کیا ا۔ کی بے قراری کا علم ہے؟ اور اگر ہے تو کس سے ہے؟'



"اُٹھ جاؤ یار! رات کے دو بج رہے ہیں اور تم پچھلے تین گھنٹوں سے اسی کھڑ بیٹھے اپنے ہاتھ پہ بندھی اس پٹی کو دیکھ رہے ہو۔" فاروق نے بیڈ پہ لیٹے لیٹے اسے ٹو

"تجھے کیا پتہ، اس پٹی میں کیسی خوشبو ہے؟ کیسا سرور ہے؟" احد نے ٹھنڈی کے کہا۔

"جانتا ہوں۔ بقول تمہارے اس دشمن جاں نے اپنے ہاتھوں سے تمہارے مرہم رکھا ہے۔ تمہارے لئے تو یہ زخم ہی انمول ہے۔" فاروق نے کروٹ بدل کے ک

"زخم تو واقعی انمول ہے۔ لیکن اسے دشمن جاں مت کہو۔ وہ تو مسیحا ہے میرے اسی نے تو اِک پتھر کے بت میں جان ڈالی ہے۔ اسی نے تو آگہی کے نئے دروا۔ میرے اوپر۔" احد کے لہجے میں گہرائی اور گمبھیرتا تھی۔

"بتا کیوں نہیں دیتا اُسے، جب اُسے اتنا چاہتا ہے؟ پہلے ہر وقت اس کے مقا اڑا رہتا تھا اور اب خود ہی مات کھالی۔"

"یار! تُو کیا جانے، محبوب سے ہارنے میں کتنا مزا آتا ہے۔ اور اسے بھی نہیں گا۔ اگر میرے دل کی لگن سچی ہوئی تو وہ خود ہی سمجھ جائے گی، ایک نہ ایک دن، بنا. سنے۔" احد اس کے دوپٹے کے ٹکڑے کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"اور اگر وہ نہ سمجھ سکی تو؟" فاروق نے لیٹے لیٹے اس کی طرف دیکھا۔

"تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری لگن ادھوری تھی، میرا عشق سچا نہ تھا۔" وہ سنجیدگی۔ ہوا۔

"احد صدیقی نے آج تک کسی انسان سے محبت نہیں کی۔ اسے اگر اس ا

بے کا کسی نے ادراک دیا ہے تو وہ وہی ہے۔ بس اس سے ایسی محبت کرنی ہے کہ اس احسان کا بدلہ پورا ہو سکے۔"

"احسان؟........ کیسا احسان؟" فاروق حیران ہوا۔

"اس نے محبت کرنا جو سکھائی ہے، اس کا یہی احسان۔" احد نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔

"تُو پاگل ہو گیا ہے عشق میں۔ عجب فلسفہ ہے تمہارا۔" فاروق نے چادر اُٹھا کے اپنے پر ڈالی اور کروٹ بدل لی۔

"جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی"

احد ہلکے سُروں میں گنگنا رہا تھا۔



اور اسی رات، ایک بار پھر حرمین کے خوابوں پہ احد صدیقی نے دستک دی۔ اس نے بہت عجیب خواب دیکھا۔ احد کسی آئینے کے سامنے کھڑا شیو بنا رہا ہے۔ سفید رنگ کے رنگ کریم سے اس کا چہرہ آدھا چھپا ہوا ہے۔ ریزر سے کریم ہٹاتے ہوئے اسے ایک موٹا سا کٹ لگتا ہے اور سفید کریم کی موٹی تہہ کے پیچھے سرخ گاڑھے خون کا دھبہ نظر آتا ہے۔ وہ کٹ دیکھ کر حرمین کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اسی طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ پھر اس نے خواب کو نظر انداز کر کے دوبارہ سونے کی کوشش کی۔

اور پھر کچھ ہی دنوں بعد، اینوئل فنکشن کا دن آ پہنچا۔ سبھی اسٹوڈنٹس خصوصی لباس زیب تن کر کے آئے تھے۔ حرمین نے بھی سبز رنگ کا، خوب صورت سوٹ پہنا تھا، جس پر سلور کلر کا کام تھا۔ چہرے پر نفیس میک اپ کئے، بال کھولے وہ ہمیشہ سے بہت الگ، بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اعتماد سے ثناء کے ہم قدم چلتی ہوئی آڈیٹوریم تک آئی۔ دروازے کے باہر ہی اسے اور لڑکوں کے ہمراہ زرش اور احد نظر آ گئے۔ حرمین کو آتا دیکھ کر احد اسی کی طرف چلا آیا۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟"

"وعلیکم السلام۔ الحمدللہ، بالکل ٹھیک ٹھاک۔" وہ مسکرائی۔

"بس پروگرام شروع ہونے ہی والا ہے۔ آپ کی سیٹس ہمارے گروپ کے ساتھ اگلی رو میں ہیں۔ آپ لوگ اپنی نشستیں سنبھال لیں۔" گرے کلر کے ٹو پیس کے اندر بلیک شرٹ اور نیلی نیک ٹائی تھی۔ تازہ شیمپو کئے بال تھے۔ آفٹر شیو کی مہک حرمین کو

واضح محسوس ہوئی اور حرمین نے اس کے چہرے کو دیکھا اور چونک گئی۔ اس کی
دائیں جانب ہلکا سرخ نشان تھا۔ بالکل اسی جگہ، جہاں حرمین نے خواب میں اسے
دیکھا تھا۔

"یہ زخم کیسا ہے آپ کے چہرے پہ؟" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھی۔ ا
چہرے کے زخم تک گیا۔

"ارے کوئی خاص بات نہیں۔ شیو کرتے ہوئے ذرا سا کٹ لگ گیا تھا
مسکرایا۔ حرمین کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

کیا تھا یہ؟.......خواب تھا یا حقیقت؟.......کیسا ناتا سا جڑ گیا تھا اس کے خوا
احد کی حقیقت سے۔

"ارے، آپ تو گھبرا گئیں۔ معمولی سا کٹ ہے، جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" و
کے چہرے پہ پریشانی کے تاثر دیکھ کے بولا۔ حرمین نے خود کو سنبھالنے کی سعی کی ا
ہال کی طرف بڑھ گئی۔

ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے، کچھ روایتی قسم کے ڈانسز ہوئے جو کہ ہر اینوئل
میں ہوتے ہیں۔ ابرار الحق کے پنجابی گانوں کے ری میک پہ سبھی نے بہت انجوا۔
لڑکیاں ہاتھ لہرا لہرا کے گانے والے کو خراج تحسین پیش کر رہی تھیں اور لڑکے کرسیو
اوپر بھنگڑا ڈال کے۔ احد صدیقی بھی انہی لڑکوں میں سے ایک تھا۔ وہ بھی اپنی کرسی
گلے میں اجرک ڈالے فاروق، سلمان اور کچھ اور لڑکوں کے ساتھ ڈانس کر رہا تھا۔
اور ثناء بھی بہت انجوائے کر رہی تھیں۔

آئٹم کے اختتام پر پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اور پھر زرش، اناؤنس منٹ
فرائض انجام دینے کے لئے اسٹیج تک آئی۔

"دوستو! اس سال بھی حسب روایت ہماری یونیورسٹی کے کچھ ہونہار اور
اسٹوڈنٹس نے ایک پلے لکھا ہے۔ یقیناً یہ پلے آپ کے دلوں میں بھی اُتر جائے گا
پلے میں جذبات کی مدھم پڑتی اور بھڑکتی لو بھی ہے اور لفظوں کا عمدہ چناؤ بھی۔ دل
بدلتے اور پھلتے پھولتے احساسات کی کہانی ہے، جو کہ مسیحا کی زبانی ہے۔ حرمین خا
احد صدیقی کی خوب صورت قلم کے نوک سے نکلا "مسیحا"۔

زرش کی اناؤنس منٹ کے ساتھ اسٹیج کی لائٹس لمحہ بھر کے لئے بند ہو گئیں اور ہال
تالیوں کی گونج ہوئی۔ احد اور حرمین ایک دوسرے کی طرف دیکھ کے مسکرائے۔ پھر

کی لائٹ جلی اور پردہ ہٹا۔ سامنے ان کے دو فیلوز ثانیہ اور امان کے کردار میں
تھے۔

ڈرامہ جیسے جیسے آگے بڑھتا رہا، ناظرین کی دلچسپی بھی مزید گہری ہوتی گئی۔ بہترین
میں دونوں کردار ڈائیلاگز ادا کر رہے تھے۔ حرمین بھی کھوسی گئی تھی۔

"تم کس طرح انکار کر سکتی ہو ثانیہ! محبت کے وجود سے، کہ محبت ہی تو وہ دیوی ہے،
جو انسان میں روح پھونکتی ہے اور احساسات کو آگہی دیتی ہے۔ تم اس عظیم جذبے
کا انکار مت کرو ثانیہ! مت کرو۔" امان کے کردار نے بخوبی اپنا ڈائیلاگ بولا۔

"مجھے تم سے محبت نہیں ہے امان!" ثانیہ نے جذباتی ہو کے کہا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں، کیوں؟"

"کیونکہ یہ صحیح نہیں ہے۔" وہ خود تذبذب میں تھی۔

"تو یہ کہو ناں کہ صحیح نہیں ہے، یہ کیوں کہتی ہو کہ محبت نہیں ہے۔" وہ اس کا ہاتھ تھام
کے بولا۔

"تم نہیں جانتے امان! کہ مجھے ساتھ لے کے چلنا کس قدر مشکل ہے۔"

"میں تمہارے لئے ہر مشکل سہنے کے لئے تیار ہوں۔" امان بولا۔

"درد کو ناپنا یا درد دینا بہت آسان ہے امان! لیکن مسیحا بننا بہت مشکل۔"

"مجھے مسیحائی کا ہنر آتا ہے ثانیہ!" وہ پُر اعتماد تھا۔

"بن سکو گے میرے مسیحا؟" سوال بدستور تھا۔ امان اس کے قریب آیا۔

"ہاں.......میں تمہارے ہر درد پہ اپنی محبت کا مرہم رکھوں گا۔ تم دیکھو گی کہ محبت کس
طرح صبح و شام کو پُرنور بنا دیتی ہے۔ کس طرح اندھیروں کو روشنی عطا کرتی ہے۔ کس طرح
مُردوں کو زندگی دیتی ہے.......تم دیکھو گی ثانیہ! کہ محبت کیسے کیسے معجزے دکھاتی ہے۔
احساسات کو کس طرح جاوداں کرتی ہے۔ فانی زندگی کا ہاتھ تھام کر کس طرح اسے بقاء کے
راستوں پہ لے کے جاتی ہے۔ میں تمہیں دکھاؤں گا اپنی آنکھوں سے کہ عیسیٰ نفسی کیا ہوتی
ہے، مسیحائی کیا ہوتی ہے۔"

بیک گراؤنڈ میں احد کے بجاتے ہوئے وائلن کا ریکارڈ چلتا ہے۔ امان، ثانیہ کو دونوں
بازوؤں سے تھام لیتا ہے۔

ہال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اُٹھا۔

حرمین، احد کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ اسی کی جانب دیکھ رہا ہوتا ہے، اس کی آنکھوں

میں جذبات کا اِک بھڑکتا الاؤ روشن ہوتا ہے، جس کی تپش حرمین کو بھی محسوس ہوتی ہے۔ گھبرا کے نظر چرا لیتی ہے۔ کچھ دیر بعد دوبارہ دیکھتی ہے، وہی شدت اور وہی الاؤ۔

اِک شدت پسند اور محبت کرنے والے لڑکے کی آنکھوں میں اقرار روشن ہوتا ہے۔

لمحے قبل جو کرسی پہ چڑھ کے، ایک ٹانگ پہ بھنگڑا ڈال رہا تھا، قہقہے اور مستیاں جس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھیں، یہ وہ تو نہ تھا۔ یہ تو کوئی اور تھا۔ پتھر سے نہر کھودنے والا فرہاد یا پھر تخت ہزارے کا کوئی رانجھا، اپنا تخت و تاج چھوڑ کے بھینسیں چرانے والا مہینوال، یا پھر سسی کی خاطر دھوبی گھاٹ پہ کپڑے دھونے والا پنوں! سراپا محبت آنکھیں آنکھوں میں دھڑکتے دل کے سائے۔

وہ اندر تک لرز ہی تو گئی تھی۔ عشق کے شعلے، عاشق کی آنکھوں سے پھوٹ رہے اور لپک لپک کے اس کے تن من کو سلگا رہے تھے۔

میں کس کس کو سمجھاؤں
کہ میں جذبہ ہوں ضدی سا
میں ہٹ دھرمی کا سایہ ہوں
میں بے باکی کا جھونکا ہوں
میں نیندیں چھین لیتا ہوں
میں آہیں سونپ دیتا ہوں
میں آنسو دان کرتا ہوں
میں تنہائی کا تکیہ ہوں
میں بربادی کی چادر ہوں
مجھے تم خود ہی پہچانو!
محبت ہوں، محبت ہوں!



چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ عموماً چھٹیوں میں ہر کوئی اپنے اپنے گھر، گاؤں یا شہر چلا تھا اور دو ڈھائی مہینے کی جدائی دوستوں اور کلاس فیلوز کی یاد شدت سے دلاتی تھی۔ لہٰذا بار ایم۔اے کے کچھ ڈیپارٹمنٹس نے مشترکہ پکنک کا فیصلہ کیا، المنظر کے کنارے پہ۔ ارینج کرنے والے گروپ میں احد بھی شامل تھا۔ اُسی کے آئیڈیا پہ کاغذ پرنٹ کروائے گئے جن میں لکھا تھا کہ جو کوئی پکنک میں جانا چاہتا ہے، وہ اپنا نام لکھوا دے اور سو روپے کھا

کے لئے جمع کروا دے۔

دو دن بعد پکنک تھی اور اسٹوڈنٹس کافی جوش دکھا رہے تھے۔ ناموں کی لسٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر وہ ایک نام جس کا احد کو انتظار تھا، وہ غائب تھا۔ آخری دن احد کے سامنے سے ثناء گزری۔

"ثناء! ذرا بات سننا۔" احد نے آواز دے کر اسے روک دیا۔

"جی، کہئے۔" وہ مسکرائی۔ اُسے حرمین کی طرح احد سے کوئی اللہ واسطے کا بیر نہ تھا۔

"کیا تم پکنک پہ نہیں جا رہیں؟"

"جا رہی ہوں۔ میں نے تو اپنا نام لکھوا دیا تھا، زرش کے رجسٹر میں۔ آپ کو نہیں پتہ؟" وہ حیران ہوئی۔

"لیکن تمہاری دوست کا نام تو نہیں۔ نہ اُس رجسٹر میں اور نہ میرے پاس۔" احد نے تشویش ظاہر کی۔

"کس کا؟ حرمین کا؟ لیکن وہ تو نہیں جا رہی۔" ثناء نے کہا۔

"لیکن کیوں؟"

"بقول اُس کے، اس طرح کی پکنک وقت کا زیاں ہوتی ہیں۔" ثناء نے سادگی سے کہا۔ احد بھی خاموش ہو گیا۔

"آپ چاہتے ہیں کہ وہ جائے؟" ثناء کی مسکراہٹ میں شرارت اُتر آئی۔ احد بھی مسکرایا اور گردن اثبات میں ہلائی۔

"تو پھر اُس کا نام لکھ لیں۔ میں اُسے لے آؤں گی۔" ثناء نے یقین سے کہا۔

"تمہیں یقین ہے کہ وہ آ جائے گی؟ بڑی ضدی چیز ہے۔" احد نے کہا۔

"دو سال اُس کے ساتھ گزارے ہیں۔ اُس کی کمزوریاں معلوم ہیں۔ آپ اُس کا نام لکھ لیں۔" اعتماد سے کہتی ہوئی ثناء آگے بڑھ گئی۔ احد مسکراتا رہ گیا۔

"اور ہاں، سنیے!" ثناء مُڑی۔ "نام فاؤنٹین پین سے لکھئے گا، یا بال پوائنٹ سے۔ دل کے قلم سے نہیں۔" ثناء نے آنکھ مار کے کہا۔ احد کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

اور پھر اُسی رات ہاسٹل کے کمرے میں ثناء کی شامت آئی تھی۔

"کہہ دیا ناں، مجھے نہیں جانا کسی پکنک شکنک پر۔ ایک بات سمجھ نہیں آتی تمہیں؟" حرمین اُچھل ہی تو پڑی تھی۔

"لیکن میں تمہارا نام لکھوا آئی ہوں اور تمہارے حصے کی اماؤنٹ بھی دے آئی ہوں۔"

ثناء ڈھیٹ پن سے بولی۔

"کس نے کہا تھا ایسا کرنے کو؟ ہم لوگ یہاں پڑھنے آئے ہیں، کوئی فضول کا کرنے نہیں۔"

"پکنک پہ جانا فضول کام نہیں ہے۔ اور اگر فضول کام ہے تو پھر پچھلے سال کیوں گ تھیں ہاکس بے؟ یہاں المنظر تک ہی تو جانا ہے۔" ثناء نے لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچایا۔

"پچھلی بار میڈم زارا کے کہنے پر چلی گئی تھی۔" وہ ذرا دھیمی ہوئی۔

"اُن کے لئے جاسکتی ہو، میرے لئے نہیں جاسکتیں؟ بیسٹ فرینڈ کہتی ہو، سمجھتی نہی ہو۔" ثناء بسوری۔

"ثناء!" حرمین شرمندہ ہوئی۔

"ٹھیک ہے، مت جانا۔ میں اکیلی چلی جاؤں گی۔ یوں بھی تم اگر میرے بغیر رہ سک ہو، تو میں بھی کوشش کروں گی۔" ثناء بستر پہ لیٹ گئی اور منہ پہ چادر اوڑھ لی۔

"ثناء! ناراض تو مت ہو........ اچھا، اچھا ٹھیک ہے۔ میں چلوں گی۔ لیکن صرف تمہاری خاطر۔" وہ ہار مانتے ہوئے بولی۔

"رہنے دو، خود پہ ظلم مت کرو۔" ثناء اداکاری کر رہی تھی۔

"ثناء! پلیز مان جاؤ ناں۔ کل ہم دونوں بہت انجوائے کریں گے المنظر پہ۔ میں ا کیمرہ بھی ساتھ لے چلوں گی۔ ہم بہت ساری سنیپس کھینچیں گے۔" حرمین اُسے منا لگی۔ ثناء کا پلان کامیاب ہوگیا تھا۔



بہت ہی عجیب خواب سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ احد کسی ٹھہر ہوئے پانی میں گر جاتا ہے اور بہت زور سے اُس کا نام لے پکارتا ہے۔ اس نام کی گو نے اُس کی نیند اُڑا دی تھی۔ وہ بہت گھبرا گئی تھی۔ خصوصی طور پر ان پچھلی دو خوابوں کی ت کے بعد۔

'میں احد صدیقی ہی کو خواب میں کیوں دیکھتی ہوں؟ وہ کیا ہے، جو بار بار اُس کا میری آنکھوں کے سامنے لے آتا ہے؟ وہ کون سا جذبہ ہے، جو بھڑکتی آگ کے شعلو طرح اُس کی آنکھوں سے لپکتا محسوس ہوتا ہے؟........ کون ہے وہ؟ اور کیا رشتہ ہے اُس سے؟' وہ بستر پہ لیٹے لیٹے خود سے سوال کرتی رہی۔ یہاں تک کہ صبح کی ہلکی ہلکی

ہاسٹل کے کمرے کی کھڑکی کے ٹوٹے شیشے سے اندر آنے لگی اور وہ اُٹھ بیٹھی۔

ثناء کو منانے کی خاطر وہ پکنک پہ جانے کے لئے راضی ہوگئی تھی۔

وہ دونوں جب پوائنٹ تک پہنچیں تو تقریباً سبھی لڑکے، لڑکیاں بیٹھ چکے تھے۔ کچھ پچھلی نشستیں ہی خالی تھیں۔ لڑکے زیادہ تر چھت پہ بیٹھے تھے اور شور مچائے جا رہے تھے۔ حرمین کو مسلسل ثناء پہ غصہ آرہا تھا۔

"کہاں بیٹھو گی؟........ دو منٹ پہلے اگر اپنی تیاری مکمل کر لیتیں تو یہ خواری تو نہ دیکھنا پڑتی۔"

"مل جائے گی کوئی سیٹ۔ صبر تو کرو۔" ثناء یہاں وہاں دیکھ رہی تھی۔

"ارے حرمین! ثناء!" انہیں پیچھے سے زرش نے آواز دی۔ "تم دونوں کی سیٹس تو یہ آگے ہیں۔" زرش نے دو خالی سیٹس کی طرف اشارہ کیا۔

"آگے؟........ لیکن ان پہ تو Booked لکھا ہے۔" حرمین نے کہا۔

"احد نے یہ تمہیں دونوں کے لئے بک کی ہیں۔ آجاؤ، یہاں بیٹھو۔" زرش نے کہا اور ثناء اُسے کھینچتی ہوئی سیٹ تک لانے لگی۔

"کوئی ضرورت نہیں اس سیٹ پہ بیٹھنے کی۔ ہم پیچھے کہیں بیٹھ جائیں گے۔" اُس نے ثناء کے کان میں سرگوشی کی جو ثناء نے اَن سنی کر دی اور دھڑام سے کھڑکی کی طرف بیٹھ گئی۔ مجبوراً حرمین کو بھی بیٹھنا پڑا۔

"خوامخواہ کسی کا احسان لینے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

بس مکمل طور پہ بھر گئی، تب احد اوپر چڑھا۔ اُس کے ہاتھ میں گٹار تھا اور چہرے پہ بھرپور مسکراہٹ۔ اسکائی کلر کی ٹی شرٹ تھی، جس پہ سفید رنگ کے اسٹرپس تھے۔ وہ زرش اور سعادت کے ہمراہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پہ بیٹھ گیا، لیکن چہرہ پیچھے کی طرف تھا۔ احد نے نظر بھر کے حرمین کی طرف دیکھا۔ حرمین نے اپنی نظریں چرا لیں۔ کچھ ہی دیر بعد لڑکیوں کی رو میں شور مچ گیا۔

"کوئی گانا سناؤ احد!" کچھ لڑکیاں ہم آواز تھیں۔

"ارے واہ! صرف میں سناؤں؟ اتنے سارے لوگ ہیں، کوئی تو ہم آواز ہو۔" احد مسکرایا۔

"ارے تم اپنی گٹار تو بجاؤ۔ آوازیں خود ہی ساتھ دیں گی۔" زرش نے کہا۔

"تو موصوف کو گٹار بجانا بھی آتا ہے۔" اُس نے ثناء سے سرگوشی کی۔

''جیک آف آل ٹریڈز ہے۔'' ثناء فخر سے بولی۔

''اینڈ ماسٹر آف نن۔'' وہ منہ بنا کے بولی۔

احد نے گٹار کا بیلٹ اپنے گلے میں ڈالا اور ایک مدھم سی بیٹ بجانی شروع کی۔ گٹار کے تاروں سے بہت سُریلی دُھن نکلنے لگی۔ گانا پرانا تھا، لیکن احد نئے انداز میں، دُھن کو تیز کر کے گا رہا تھا۔

سبھی لڑکیاں تالیاں بجا رہی تھیں اور اُس کے ہم آواز گانے کی کوشش کر رہی تھیں، مگر وہ خاموشی سے اپنا دھیان یہاں وہاں لگا رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ احد اُسی کے لئے گا رہا ہے۔ اور گیت کے ساتھ اُس کی آنکھوں سے بھی بے پناہ جذبات چھلک رہے ہیں۔ مگر وہ اُسے مسلسل نظر انداز کر رہی تھی۔

بہت ہی کم وقت میں المنظر کا وہ کنارہ آ گیا، جہاں پہ پکنک کی تیاری کچھ اسٹوڈنٹس نے پہلے کر رکھی تھی۔ یہ پوائنٹ عام پوائنٹس سے کافی فاصلے پر تھا۔ پانی کا بہاؤ کافی تھا۔ ہوا پانی میں لہریں بنا رہی تھی۔ کنارے کے پتھروں کے اوپر میدان پہ گھاس تھی، جہاں جگہ جگہ لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے گروپ کے لئے چادریں بچھا رہے تھے۔ وہ زرش، ثناء اور کچھ لڑکیوں کے ہمراہ بیٹھ گئی۔

ایک کشتی ارینج کی گئی تھی، جس پہ باری باری سبھی کو سیر کروائی جا رہی تھی۔ زرش اور ثناء بھی کشتی میں سوار ہو گئیں۔ وہ اکیلی بیٹھی اُن کو جاتے دیکھ رہی تھی۔

آج کوئی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ کسی کی کمی بے انتہا فیل ہو رہی تھی۔ کوئی، جو دُور دیس، سمندروں کے فاصلوں پہ بیٹھا تھا۔ جو نہ دل کی دھڑکن سن سکتا تھا اور نہ آنکھ کے آنسو دیکھ سکتا تھا۔

کیوں چھوٹی سی زندگی میں فاصلے آ جاتے ہیں؟ رزق کی بھاگ دوڑ کیوں ضروری بن جاتی ہے کسی کے لئے؟ کیوں محبت کا مقدر تنہائی بن جاتی ہے؟

''آپ کی ایک تصویر لے سکتا ہوں؟'' گلے میں کیمرہ ڈالے وہ احد تھا۔

''میرے علاوہ اور بھی تو بہت سے لوگ ہیں یہاں۔ ان کی تصویر کیوں نہیں لیتے؟'' وہ بولی۔ احد مسکرا کے اُس کے پاس آیا۔

''میں تو سبھی کی تصویریں لے رہا ہوں۔ ریکارڈ رکھوں گا اور سبھی کو ایک ایک کاپی بھی دوں گا۔'' وہ اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ خاموش یہاں، وہاں دیکھ رہی تھی۔

''آپ بوٹنگ کرنے نہیں گئیں؟'' احد اُس کی سنہری رنگت کو دیکھ رہا تھا، جو سوچ کی

شعاعوں سے سرخ ہو رہی تھی۔ گہری براؤن آنکھوں میں اِک کتھئی چمک تھی۔

''مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ان میں۔'' وہ لئے دیئے انداز میں بولی۔

''ایک بات کہوں حرمین! یہ تمام چیزیں اس عمر اور اس پیریڈ کا حصہ ہوتی ہیں۔ اس عمر میں بہت اچھی بھی لگتی ہیں۔ اگر آپ اسی طرح ان سے آنکھ چرائیں گی تو عمر کے کسی حصے میں آپ کو پچھتاوا ضرور ہو گا کہ آپ نے یہ سب مس کیوں کیا؟ بالکل ایسے ہی، جیسے ہم میں سے بہت سے لوگ اپنا بچپن انجوائے نہیں کرتے اور بڑے ہو جاتے ہیں۔ نہ کھیلنے کی وہ کسک کبھی بھی ان کے اندر سے مٹ نہیں پاتی۔'' حرمین نے سمجھایا۔

''مگر مجھے یہ سب، کچھ اچھا نہیں لگتا۔'' وہ بولی۔ اُس کے لہجے میں ایک اَن دیکھی اُداسی تھی۔

''حُسن، رنگ، گیت، قدرت، نظارے کس کو اچھے نہیں لگتے؟...... قدرت کے حُسن کو محسوس کرنا، رنگوں سے لطف لینا، نظاروں میں کھو جانا، گیتوں کو اپنی سماعت میں اُتارنا، کوئی کیوں سب سے منہ موڑے گا؟'' وہ اپنے خیال پہ بدستور اڑا تھا۔

''میں نے کسی سے منہ نہیں موڑا۔'' وہ احد کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تو پھر آپ اُداس کیوں ہیں؟...... اس قدر کھوئی کھوئی اور تنہا؟''

''نہ میں اُداس ہوں اور نہ کھوئی کھوئی۔'' مختصر سا جواب آیا۔

''ایک بات پوچھوں حرمین! آپ برا تو نہیں منائیں گی؟'' احد نے کہا۔

''پوچھیں۔'' اُس نے اُڑتے بالوں کی لٹیں کانوں میں پھنسائیں۔

''جب سے ہم ملے ہیں، میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ مجھ سے خفا رہتی ہیں، کتراتی ہیں، مجھے پسند نہیں کرتیں۔ مقابلے کا میدان الگ، لیکن عام زندگی میں بھی ایسا ہے۔ یوں تو آپ کسی بھی لڑکے سے بات نہیں کرتیں، لیکن خصوصاً مجھے اگنور کرتی ہیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں، ایسا کیوں ہے؟'' احد نے آج بہت عرصے سے دل میں چھپائی بات کہہ دی۔

''ایسا آپ کو لگتا ہے۔ اصل میں ایسا کچھ نہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''میں نے ہمیشہ آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کی ہے۔'' وہ بولا۔

''اچھا...... کون کون سی کوشش کی ہے آپ نے؟ کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے۔''

''ڈیڑھ سال کے عرصے میں بہت سی ایسی باتیں ہوں گی۔ جیسے کہ میں کوئز پروگرام کے فائنل میں جان بوجھ کے آپ سے ہارا تھا۔ مجھے آخری دو سوالوں کے جواب آتے تھے مگر میں نے غلط جواب دیئے۔ اور تقریری مقابلے میں اپنا نام آپ کے بعد رکھوایا، تاکہ

آپ کی تقریریں سُنے پھر میں اس سے ذرا کم یعنی سیکنڈ نمبر کے لئے کروں۔ ہر جگہ آپ اوّل آئیں اور میں آپ کے پیچھے رہا۔" احد بہت اطمینان سے بتاتا رہا اور وہ حیرت سے مسکرا رہی۔

"اچھا........ لیکن آپ ایسا کیوں کرتے تھے؟ ہارنا اچھا لگتا ہے کیا؟"

"نہیں، مجھے آپ کا جیتنا اچھا لگتا ہے۔" وہ بے اختیار ہی بولا۔ وہ اُس کے جملے پہ کچھ لمحے اُسے دیکھتی رہی۔ نجانے اُس کے کہے عام سے جملے میں اتنی گہرائی کیوں تھی۔

"بہت اگنور کرلیا آپ نے۔ اب دوستی کرلیں ناں۔" اُس نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ آگے کیا۔ وہ مسکرادی۔

"دشمنی تو میری آپ سے کبھی بھی نہ تھی۔ نجانے آپ کو ایسا کیوں محسوس ہوا۔" اُس نے لاپرواانداز میں کہا۔

"تو پھر دوستی سے بڑھے اس ہاتھ کو یوں نظرانداز تو مت کریں ناں۔" حرمین نے مسکرا کے اُس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

محبت کے پہلے لمس نے جادو سا جگا دیا احد صدیقی کے روم روم میں۔ معطر کر دیا اُس کی نس نس کو، مہکا دیا اُس کی ہر ہر سانس کو۔

"بوٹنگ کرنی ہے دوست؟" اُس نے پیشکش کی۔

حرمین نے مسکرا کر ہامی بھری۔

اور کچھ ہی دیر میں وہ اُس کے ہمراہ لکڑی کی چھوٹی سی کشتی پہ سوار تھی۔ ثناء بھی ایک اور رائیڈ لینے کے لئے اُن کے ساتھ ہو لی۔ زرش نے احد کے کیمرے سے اُن کی تصاویر کھینچیں۔ احد کے گلے میں گٹار تھا اور ثناء کے پاس چپس کے پیکٹ۔

شام ہونے کو تھی اور خنکی کا احساس بھی تھا۔ احد نے جینز کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ حرمین کو بھی سردی کا احساس ہوا۔ اُس نے اپنے دونوں بازو سکیڑ لئے۔ احد نے اُس کی طرف دیکھا اور اپنے چھوٹے سے بیگ میں سے سیاہ رنگ کی شال نکال کے اُس کی طرف بڑھائی۔ حرمین نے بنا کسی تردد کے لے لی اور اوڑھ لی۔ نرم سی گرمی کا احساس اُس کے رگ و پے میں دوڑ گیا۔

ہلکے پانی کی چھوٹی چھوٹی لہروں پہ کشتی چل رہی تھی۔ کشتی والا ہاتھ میں لکڑی کے چپو تھامے چلا رہا تھا۔ سورج بہت نیچے دریا میں ڈوبنے کو آرہا تھا اور احد نے اپنے گٹار کے تار چھیڑنے شروع کئے۔

"کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لئے
تُو اب سے پہلے ستاروں میں بس رہی تھی کہیں
تجھے زمیں پہ بلایا گیا ہے میرے لئے!"

قدرت کا یہ بے پناہ حُسن، المنظر کے کنارے ڈوبتا ہوا سورج، احد کے گٹار سے نکلتی ہوئی خوب صورت دُھن اور کائنات کی ہر شے پہ چھاتی اُس کی جادوئی آواز........ حرمین واقعی مبہوت ہو رہی تھی، کھو رہی تھی اس حُسن میں۔ وہ آنکھیں موندے کالی چادر میں لپٹی سنگ مرمر کی کوئی مورت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دل نہ کھوتا تو اور کیا ہوتا۔

کشتی واپس کنارے پہ پہنچی تو وہاں پہ آگ جلائی ہوئی تھی سبھی نے، اور کھانے پینے کا دور تھا۔ وہ لوگ بھی ان میں شامل ہو گئے۔

اس طرح یہ شام بہت ہی خوب صورت یادیں اپنے اندر سمیٹے ڈھل گئی۔



چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ سبھی لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ حرمین بھی کوہاٹ چلی گئی تھی۔ احد کا گھر حیدرآباد میں ہی تھا، لہٰذا اُسے کوئی خاص جلدی نہیں تھی جانے کی۔ آج وہ یونہی بنا کسی وجہ کے یونیورسٹی آ گیا تھا۔ دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ حرمین کی یاد، اُس کی باتیں بہت بے چین کر رہی تھیں۔ یونیورسٹی کی سفید پھولوں والی سڑک پہ بھاری بھاری قدموں سے چلتا، کوئی گیت گنگناتا وہ یونہی بے خیالی میں جا رہا تھا۔ ارادہ تھا کہ ٹہل کے بابا ڈھابے سے چائے پیئے گا۔ اُس پری پیکر کو یاد کرے گا۔ اور شام کو حیدرآباد کے لئے نکل پڑے گا۔

وہ یونہی چلتا چلا جا رہا تھا۔ جس طرح ہوا کے دوش پہ پتے اُڑتے ہیں۔

"احد بھائی!" اُسے کسی نے آواز دی۔ وہ ثناء تھی۔

"ارے ثناء! تم گھر نہیں گئیں؟" وہ مسکرا کے اُس کے پاس آ کے کھڑا ہو گیا۔

"کل چلی جاؤں گی۔ کچھ کام تھا یہاں یونیورسٹی میں۔ اور گھر والوں کے لئے کچھ شاپنگ بھی کرنی تھی۔ اس لئے کچھ دن رُک گئی۔ آپ بھی گھر نہیں گئے؟" اُس نے پوچھا۔

"ہمارا جیسا ہاسٹل ہے، ویسا ہی وہ گھر، جسے عموماً گھر کہتے ہیں۔" اُس نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب احد بھائی؟"

"مطلب یہ میری چھوٹی سی بہن! کہ گھر تو گھر والوں سے ہوتا ہے، چاہنے والوں
سے ہوتا ہے۔ اور گھر والوں کے نام پر اس گھر میں میرا صرف ایک بھائی اور بھابی ہے
اور ان دونوں کو بھی میری ضرورت ہے اور نہ پروا۔ اس لئے میں جاؤں نہ جاؤں، کچھ زیادہ
فرق نہیں پڑتا۔" احد نے اُسے سمجھایا۔

"اوہ!........ اور آپ کے امی ابو؟" ثناء نے معصومیت سے پوچھا۔

"وہ دونوں اوپر آسمانوں پر بیٹھے مجھے دُعائیں دیتے ہیں۔" احد نے مسکرا کے او
آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھائی۔

"میں چائے پینے اور کچھ کھانے جا رہا تھا۔ چلو گی؟" اُس کی پیشکش پہ ثناء نے مسکر
کر حامی بھری۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے احد بھائی! جو لوگ اتنی محبت کرتے ہیں دوسروں سے، اُن
اپنی زندگی میں محبت کی اتنی کمی ہوتی ہے، اتنے خالی ہوتے ہیں وہ لوگ۔" ثناء نے چ
چلتے کہا۔

"یہ تو دستور ہے دنیا کا۔ جن کے پاس ڈھیروں ڈھیر محبتیں ہوتی ہیں، وہ انہیں
نہیں کرتے۔ بہت خود غرض بن جاتے ہیں۔ اور جو خالی داماں ہوتے ہیں، وہی محبت
بانٹتے ہیں اس انتظار میں کہ شاید اُن کی محبت کے بدلے کوئی محبت دے سکے اُنہیں۔" ا
نے وضاحت سے کہا۔

"آپ کتنی اچھی باتیں کرتے ہیں احد بھائی!" ثناء نے مسکرا کے کہا۔ دونوں کینٹین م
آمنے سامنے کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔

"اچھا؟........ تمہاری دوست تو ہر وقت مجھے نظر انداز کرتی ہے۔ میری باتیں سننے
تیار ہی نہیں ہوتی۔ اور تم کہتی ہو کہ میں اچھی باتیں کرتا ہوں۔" احد نے جتایا۔

"وہ تو پاگل ہے۔ اُسے تو احساس ہی نہیں آپ کے جذبات کا۔ وہ جانتی ہی نہیں
آپ اُس سے۔" ثناء کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

"کیا تم جانتی ہو ثناء؟" احد اُس کی آنکھوں میں جھانک کے بولا۔

"جی، میں جانتی ہوں کہ آپ اُس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ میں نے اکثر
محسوس کیا ہے۔ لیکن آپ اُسے بتاتے کیوں نہیں؟" ثناء نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم جان سکتی ہو۔ وہ نہیں جان سکتی۔ تم محسوس کر سکتی ہو۔ وہ نہیں محسوس کر سکتی۔" ا
چائے کی پیالی کی طرف دیکھ کے کہہ رہا تھا۔

"پتھر کی بنی ہے وہ۔ بہت سخت، بہت ضدی ہے۔" ثناء نے کہا۔

"محبت اگر قطرہ قطرہ بھی برستی رہے تو پتھروں میں بھی سوراخ ہو جاتے ہیں۔ محبت تو
سخت سے سخت پیڑوں میں بھی نرم و ملائم بیلیں پیدا کر دیتی ہے۔ وہ بیلیں جو جنگلوں میں اپنا
راستہ بناتی ہیں۔" احد کی آنکھوں میں محبت کی شدت اُتر آئی تھی۔

"اگر آپ اتنے ہی پُر اعتماد ہیں تو اُسے بتا دیں۔ کب تک چھپائیں گے؟ ہر گزرتے
دن کے ساتھ آپ کی محبت اتنی ہی شدید ہوتی جائے گی اور اُس کی بے رُخی بھی۔ مواقع
انسان خود تلاش کرتا ہے، قدرت صرف مدد کرتی ہے۔" ثناء نہایت اپنائیت سے بولی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو ثناء! وہ جیسے ہی واپس آئے گی، میں اُسے بتا دوں گا۔" احد نے
ارادہ ظاہر کیا۔

"وہ تو شاید دو ڈھائی ماہ بعد واپس آئے۔ میں آپ کو اُس کا کوہاٹ کا ایڈریس اور نمبر
دیتی ہوں۔ اُسے خط لکھیں، فون کریں، جو بھی کریں، مگر اُسے بتا دیں۔ دل کی دل میں
رکھنا، دل کے ساتھ نا انصافی ہوتی ہے۔" ثناء نے اپنے پرس سے کاغذ اور قلم نکالا اور اُس
دشمنِ جاں کا ایڈریس لکھ دیا۔

"یہ لیجئے۔ دیکھئے گا، وہ ہے بڑی ٹھوس چیز۔ بہت ضدی اور بہت ہٹ دھرم۔" ثناء
نے مسکرا کے چٹ اُسے تھمائی۔

"اور میری بہت بہت نرم، بہت اُجلی، بہت میٹھی بہن! گھبراؤ نہیں۔ وہ کہیں جا نہیں
سکے گی۔" احد پُر اعتماد تھا۔ ثناء نے اُس کے دل کی گھبراہٹ اور اُداسی دُور کر دی تھی۔ وہ
کاغذ جیب میں رکھ کے کھل کے مسکرایا اور چائے کا آخری سپ لیا۔



بس سے اُتر کر اُس نے اِک ٹھنڈی آہ بھری اور بھرپور انگڑائی کے ساتھ سانس لی۔ یہ
کوہاٹ شہر کی فضا تھی، جہاں پہ وہ اپنی زندگی کے سب سے اہم مشن پہ آیا تھا۔ بہت اُمید
اور بہت خواب لے کر۔ ثناء کی باتوں نے اُس کی محبت کے اندر اِک نئی رُوح پھونکی تھی۔ وہ
بہت پُر عزم اور پُر اُمید بن کے آیا تھا۔ اُس نے مرحلہ در مرحلہ اپنا لائحہ عمل تیار کر لیا تھا۔
اب اُسے اس پہ عمل کرنا تھا۔ ایک پرائیویٹ ریسٹ ہاؤس میں رہائش کے لئے اُسے کمرہ
مل گیا۔ اُس نے بیڈ پہ لیٹ کر سب سے پہلا فون حرمین کو کیا۔ مگر فون مسلسل مصروف تھا۔
دوسری طرف حرمین، شاہ میر سے بات کر رہی تھی۔

شاہ میر........ جو اُس کے دل کی دھڑکن تھا۔ اُس کا خواب، اُس کی محبت، اُس کا

انتظار تھا۔ شاہ میر، جو اُس کا شوہر تھا۔

"حد ہوتی ہے انتظار کی شاہ میر!....... پانچ سال ہو گئے، آپ لوٹ کے نہیں آ
ایک بار بھی ملنے نہیں آئے۔ میں کب تک آپ کا انتظار کروں گی؟" وہ آنکھوں میں آ
سجائے بولی۔

"مینا! میری جان! تم بھی تو اپنی اسٹڈیز میں مصروف ہوتی ہو۔ کہاں کوہاٹ، کہ
حیدر آباد۔ نجانے تمہیں اتنی دُور جا کے پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارے علاقے
ایجوکیشن لیول سندھ سے زیادہ بہتر ہے۔" شاہ میر نے کہا۔

"شاہ میر! آپ ہمیشہ لیول، اسٹیٹس اور کام کی باتیں کیوں کرتے ہیں؟ جذبا
محبت، وعدے، کیا ان کی کوئی اہمیت نہیں آپ کے نزدیک؟" وہ بولی۔

"دیکھو مینا! زندگی بہت چھوٹی ہے اور کرنے کو بہت سے کام ہیں۔ کما رہا ہو
عنقریب میں پاکستان آؤں گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"اور یہ عنقریب کب آئے گا شاہ میر! نکاح کو پانچ سال ہو گئے ہیں۔ نکاح کے
بعد آپ چلے گئے۔" آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ برس رہے تھے۔

"چیئر اپ مائی سویٹ ہارٹ! دل کیوں چھوٹا کرتی ہو؟ میں آ جاؤں گا۔" یہ اور ا
طرح کے کچھ اور معمول کے جملے کہہ کے شاہ میر نے فون رکھ دیا۔

نمکین، بے رنگ بوندیں ریسیور کے اوپر برسنے لگیں۔ وہ جب بھی فون کرتا تھا، اُدا
کر دیا کرتا تھا۔ محبت کے دو بول بولنے تو اُسے آتے ہی نہ تھے۔ وہ ہمیشہ جذبوں کو تھ
کے سلا دیا کرتا تھا۔

فون کی گھنٹی ایک بار پھر زور زور سے بجی۔ حرمین نے لپک کے فون اُٹھا لیا، یہ سو
کے کہ شاید شاہ میر نے دوبارہ کچھ کہنے کے لئے فون کر لیا ہو۔

"حرمین! میں احد بات کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"احد صدیقی! آپ؟....... نمبر کہاں سے ملا آپ کو؟" وہ آنکھیں صاف کر کے خو
سنبھالتے ہوئے بولی۔

"ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے حرمین! بس مجھے پتہ چلا ہے، آپ اُداس ہی
میں نے آپ کو فون کر لیا تاکہ اپنی بکواس اور سرپرائز سے آپ کو خوش کر سکوں۔" وہ
ہلکے پن سے بولا۔

"کس طرح کا سرپرائز؟"

"بہت شاندار سرپرائز....... مابدولت کے آپ کے شہر میں ہونے کا سرپرائز۔"

"آپ کوہاٹ آئے ہیں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"نہیں، کوہاٹ چل کے حیدر آباد آ گیا ہے۔" اُس کی بے تکی بات پہ وہ مسکرا دی۔

"گھر آئیے ناں۔ امی اور بہن سے ملواؤں گی آپ کو۔ اور کھانا بھی کھائیے ہمارے
ساتھ۔" اُس نے آفر کی، جو احد نے فوراً قبول کر لی۔

"کل شام کو آؤں گا۔" اُس نے مسکرا کر کہا اور فون رکھ دیا۔

اور اگلے ہی دن خوب صورت سے پھولوں کے گلدستے اور کارڈ کے ہمراہ وہ حرمین
کے گھر میں موجود تھا۔ بچھڑی صورت دیکھ کے اُس کے روم روم میں جادو سا بکھر گیا تھا۔
روح بھر گئی تھی۔

وہ پوری شام احد نے حرمین کے گھر والوں کے ہمراہ گزاری۔ خوب ہنسی مذاق ہوا۔ حرمین
بھی بے حد ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ شاہ میر کی بے رُخی کا اثر احد کے اپنے پن نے دُور کر دیا۔

اگلے دن حرمین اُس کے ریسٹ ہاؤس آئی تھی۔ احد نے اُس کا استقبال کیا۔ اُس نے
ائے کا آرڈر دیا۔ حرمین آتش دان میں جلتی لکڑیوں کے پاس بیٹھ گئی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے
ول میں جلتی لکڑیوں سے آتی گرمائش اور اُن کی آواز ماحول پر اِک سحر سا پھونک رہی
ی۔ چائے آ گئی اور احد نے اُسے چائے پیش کی۔

"یہ لیجئے، ٹھنڈی ٹھنڈی شام میں گرما گرم پٹھانی چائے۔"

"کتنا زبردست ماحول ہے تمہارے کمرے میں۔ جلتی لکڑیوں کی خوشبو، کھڑکی سے
ظر آتا شام کا منظر اور خنکی۔ کس طرح خوب صورت بنا لیتے ہو تم لمحوں کو۔" وہ بہت
مایت سے بولی۔

"آج کی شام تو کچھ زیادہ ہی خوب صورت بنا دی ہے آپ کی آمد نے۔ اور آج کی
شام تو خوب صورت ہونی بھی چاہئے۔ کیونکہ یہ آپ کے جنم دن کی شام ہے۔" احد نے
مسکرا کے کہا۔

"میرا جنم دن؟....... کیا آج چوبیس جنوری ہے؟" وہ حیران ہوئی۔

"جی....... آج چوبیس جنوری ہے۔ آپ کا تیئسواں جنم دن۔" احد نے مسکرا کے ایک
پھول اُسے پیش کیا۔ سرخ رنگ کا تازہ خوب صورت گلاب۔

"یہ کدھر سے آیا؟" اُس نے پھول کی جانب اشارہ کیا۔

"جدھر سے آپ آئی ہیں، پھولوں کی بستی سے خوشبو کا پیرہن پہن کر۔ کہئے، آج کے

جنم دن پہ آپ کو کیا تحفہ چاہئے؟"

"تحفہ جو مجھے مل گیا سرپرائز۔ مجھے اپنی سالگرہ یاد بھی نہ تھی۔ گھر میں تو خیر کوئی ٹرینڈ نہیں پارٹی کا۔ لیکن پچھلے دو سال سے شاہ وش کرتی آئی ہے۔" حرمین نے کہا۔

"اُسی نے مجھے بتایا۔ اچھا، کوئی گیت سنیں گی؟" احد نے اپنا گٹار صوفے کے سے اُٹھایا۔

"اس کو بھی لے آئے ہو ساتھ؟" حرمین نے مسکرا کے چائے کا خالی کپ سائیڈ دیا۔

"میں سفر کروں اور میرے ہمراہ میری محبت نہ ہو، کیسے ممکن ہے؟....... کیا سنیں" احد گٹار پکڑ کے بجانے کی پوزیشن بنا کے بیٹھ گیا۔

"کوئی نظم سناؤ اپنی۔ بہت اچھی نظمیں لکھتے ہو، یونیورسٹی کے رسالے میں۔" نے تعریف کی۔

"آپ پڑھتی ہیں؟" اُس کے کہنے پر حرمین نے گردن ہلائی۔

"ایک تازہ نظم ہے، اسے میوزک میں گانے کی کوشش کرتا ہوں۔" اُس نے گٹار کے تاروں پہ ہاتھ رکھ دیئے۔ خوب صورت دُھن کے ہمراہ خوب صورت لفظ بکھ لگے۔

"وہ بادلوں کی بنفشی لکیر ہے کوئی
نظر کی تتلی کے پَر پہ جو دائروں کی طرح
سکڑتی، پھیلتی رہتی ہے ساتھ خوشبو کے
وہ چاندنی ہے کہ جو برف پوش وادی میں
خیالِ شوقِ تمنا کے خواب میں اُترے
جو شب کے پچھلے پہر دل کی شبھ دُعا کی طرح
سکون یافتہ جھیلوں کے آب میں اُترے
جو تمتماتے گلابوں کے اَن چھوئے در پہ
محبتوں کی ہوا کی گداز دستک ہے
وہ ایک خواب ہے دنیا میں آشتی کی طرح
وہ بے ثبوت ہے لیکن وجود ہے اس کا
دھنک کا آٹھواں رنگ ہے وہ عام سی لڑکی

اسی کے نام کرتا ہوں شاعری اپنی"

احد کے بولوں میں، اُس کے سازوں، اُس کی دُھنوں میں وہ ہمیشہ کھو جاتی تھی۔ اب بھی وہ نم آنکھوں سے اُس کو دیکھ اور اُس کے بولوں کو محسوس کر رہی تھی۔

"کتنی چاہت، کتنی محبت تمہارے لفظوں میں ہے۔ تمہارے لہجے میں احساسات کا اک بھنڈار ہے۔ کچھ لہجے کتنے چبھتے ہیں، جب بولتے ہیں۔ دوسرے کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ رُوح لرز جاتی ہے۔ لیکن تمہارا لہجہ، تمہارے لفظ بہت سکون پہنچاتے ہیں۔ چاندنی سی ٹھنڈک اور جھیلوں سا ٹھہراؤ ہے ان میں احد!" حرمین نے گہرائی میں اُتر کے کہا۔

"محبت لب و لہجے کی آبرو رکھنا سکھا دیتی ہے۔ یہ ٹھہراؤ، یہ ٹھنڈک محبت عطا کرتی ہے۔" احد اپنے گٹار کے تاروں کو چھوتے ہوئے بولا۔

"تمہیں کس سے محبت ہے احد؟....... کس سے؟....... بہت خوش نصیب ہو گی ناں وہ؟" حرمین کی آنکھوں میں اُداسی تھی۔ احد کو یہی وقت اظہار کے لئے بہترین لگا۔ وہ دل ہی دل میں الفاظ جوڑنے لگا۔ وہ کہنے ہی والا تھا کہ حرمین بول اُٹھی۔

"مجھے بھی کسی سے محبت ہے احد!" ایک ہتھوڑا تھا، جو احد کی سماعتوں پہ لگا۔

"شاہ میر سے۔" ایک دوسرا ہتھوڑا اور اُس کی سماعتوں کے پرخچے اُڑ گئے۔

"شوہر ہے میرا....... پانچ سال قبل نکاح ہوا تھا اور رخصتی سے قبل ہی وہ ملک چھوڑ گیا۔ میں آج تک اُس کا انتظار کر رہی ہوں۔" کمان سے نکلے بے رحم تیر کی طرح ذرا ذرا سے جملے احد کے دل میں چبھتے رہے۔ اُس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"کیسے....... کیسے کر سکتی ہو تم کسی سے محبت حرمین؟" وہ دیوانگی سے بولا۔ حرمین حیران رہ گئی۔ آنکھیں پھیلائے اُسے دیکھتی رہی۔

"کیا مطلب؟" وہ بولی۔

"مطلب یہ حرمین! کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ دل و جان سے۔ تمہیں صرف یہی کہنے کے لئے اتنی دُور آیا ہوں۔ اور تم کہتی ہو، تمہیں کسی اور سے محبت ہے؟" وہ وارفتگی کے عالم میں بولا اور اپنا گٹار سائیڈ پہ رکھ دیا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب شدت جھلک رہی تھی۔

"احد صدیقی! سنبھالو اپنے آپ کو....... پاگل ہو گئے ہو تم۔ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ بیوی ہوں کسی کی۔"

"بیوی، مائی فٹ۔ مجھے کچھ پتہ نہیں، سوائے اس کے کہ مجھے تم سے محبت ہے اور اب میں مجھے بھی تم سے محبت چاہئے۔ ورنہ میں تباہ و برباد کر دوں گا، سب کو اور خود کو۔"

وہ اُسے دونوں کندھوں سے تھام کے بولا۔ عجب جنون تھا اُس کے اندر۔

"میں نے تمہارے بارے میں اپنی رائے بدل لی تھی۔ مگر میں نے غلط کیا۔ تم ہی گھٹیا اور اوباش ہو، جیسا میں سمجھتی تھی۔ آئی ہیٹ یُو!" اپنا آپ چھڑاتی، نفرت سے ریسٹ ہاؤس کے کمرے سے نکل گئی۔



"آئی لو یُو...... اینڈ آئی ول لو یُو، فار ایور۔" وہ گھٹنوں کے بل زمین پہ بیٹھ گیا ا[ور] و قطار آنسو بہانے لگا۔ اکیلی، تنہا ویران محبت آنسو بہا رہی تھی۔ اپنی نارسائی پہ رو رہی تھ[ی]

"دو سال تین ماہ میں مسلسل تمہیں اشارتاً سمجھاتا رہا حرمین خان! کہ مجھے تم سے ہے۔ تمہاری آنکھیں، تمہاری ہنسی کی آواز میرا چین چرا گئی ہے، میری نیندیں حرام ہے۔ تمہیں شاید یقین نہیں آئے گا، یقین کرنا ہے تو یونیورسٹی کے سفید گلابوں والی سے پوچھو، جس پہ میرے بے قرار قدموں کے نشان ہیں...... اپنے ہاسٹل کی کھڑ سے پوچھو کہ چاند کے علاوہ اور کون رات رات بھر اُنہیں تکتا رہتا ہے...... جامشو ٹھنڈی اور ویران راتوں سے پوچھو کہ احد صدیقی کس کی یاد میں آنسو بہاتا ہے۔"

بے قرار آواز حرمین کے موبائل میں گونج رہی تھی اور وہ خاموشی سے اپنے ہونٹ رہی تھی۔

"لفظوں کا جوڑ توڑ کرنا تمہیں خوب آتا ہے احد صدیقی! آخر کو ہماری یونیورسٹی ٹاپ کے شاعر ہو۔" وہ طنزیہ بولی۔

"یہ الفاظ وہ نہیں ہیں حرمین! جو میں کسی مشاعرے کو جیتنے کی خاطر سناتا ہوں میرے کاغذ پہ بکھرنے والے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ میرے دل کی آواز ہیں۔ میری محبت اس محبت کا ایکسٹریم ہے۔" وہ روہانسے انداز میں بولا۔

"تم جیسے لڑکوں کی محبت کے ایکسٹریم ہر لڑکی کے لئے ہوتے ہیں۔ کیا میں نے تم کبھی نہیں دیکھا، فاطمہ شاہ کے ساتھ، ایمن عباس اور زرش آفریدی کے ساتھ؟...... میری آنکھیں گواہ ہیں احد! میں کسی اور سے گواہی کیا مانگوں؟" وہ چیخی۔

"تم نے دیکھا ہوگا...... میں مانتا ہوں، تم نے دیکھا ہوگا۔ لیکن مجھے اُن میں کسی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے دل کا نیوکلس تو صرف اور صرف تمہارے گرد ہی چکر ہے۔ مجھے صرف اور صرف تم سے محبت ہے۔" احد کی آنکھوں سے اِک گرم قطرہ گرا اور کے ٹھنڈے گال کو بھگو گیا۔

"مجھے یقین نہیں۔" وہ قطعی لاتعلقی سے بولا۔

"تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟" عجیب بے بسی تھی اُس کے اندر۔

"مجھے اس یقین کی کوئی ضرورت نہیں۔ دو ماہ بعد میرا شوہر واپس آئے گا اور میں اپنی ندگی کی نئی شروعات کروں گی۔ فائنل ٹرم کے بعد حیدر آباد سے میرا ناطہ ختم۔" وہ آرام سے بولی۔ "نہیں ختم ہو سکتا تمہارا ناطہ حیدر آباد سے۔ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ تمہاری تو روح اتوں کو بھٹکے گی میرے شہر کی گلیوں میں...... میرے دل کی شدت تمہیں سکون سے سونے ہی نہیں دے گی حرمین!" وہ جنون کی انتہا کو چھو رہا تھا۔

"نفرت ہے مجھے تم سے...... آئی ہیٹ یُو!" نفرت کی وہی گردان پھر سے شروع گئی اور فون بند ہو گیا۔

احد نے اُس کی نفرت کو بھی اپنے دل میں محبت بنا کے اُتار لیا۔



اگلے دن احد واپس حیدر آباد آ گیا۔ لیکن ایک خط اُس دشمن جاں کو پوسٹ کر آیا۔ خط کی تحریر حرمین کے سامنے تھی:

"بہت قابلِ احترام اور اچھی حرمین!

آج میں واپسی کا سفر اختیار کر رہا ہوں۔ نجانے کیوں، واپسی کا سفر ہمیشہ دُشوار ہوتا ہے، ہر کسی کے لئے۔ واپسی کے سفر میں دل بہت بوجھل، آنکھیں بہت نم اور رُوح بہت تھکی سی ہوتی ہے۔ سو میں بھی اسی طرح کے محسوسات میں گھرا ہوا ہوں۔ میرا بھی دل بہت بوجھل ہے، آنکھیں نم ہیں اور رُوح بہت تھکی ہوئی۔ میری رُوح کے لئے یہی دکھ کافی ہے کہ اسے اس کی چاہت نہیں مل سکی!

میں بہت اُمیدیں لے کے تمہارے شہر آیا تھا حرمین! خوابوں کی کتنی ہی ننھی ننھی کونپلوں کو اپنے جذبات کی بارش سے سبز کیا تھا۔ اپنے دل میں خوشیوں کا اس قدر سبزہ دیکھ کر میں بہت سرشار ہو جاتا تھا۔ محبت نے مجھے بہت سرشاری عطا کی تھی۔ پچھلے دو سال میرے اسی سرشاری میں گزرے۔ میں ہر ہر آن سنورتا تھا، ہر ہر گام گنگناتا تھا۔

میں روز تمہارے نام اِک خط لکھتا تھا اور روز پھاڑ دیتا تھا۔ ان خطوط میں میرے جذبات کی آگہی، میری محبت کی روشنی ہوتی تھی۔ مگر میں کبھی

ہمت نہ کر پایا ان میں سے ایک بھی خط تمہیں تھمانے کی۔ وجہ یہی تھی کہ میں ڈرتا تھا کہ محبت پانے کی چاہ میں، میں تمہاری دوستی سے بھی دستبردار نہ ہو جاؤں۔ تاج محل پانے کی چاہ میں، میں اپنے چھوٹے سے ریت گھروندے کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ گزرتے وقت نے مجھ میں یہ اُمید جگائی کہ تم خود ہی میرے احساسات کو سمجھ لوگی، میرے جذبات کی لو تم تک پہنچ جائے گی۔ اور پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ اس قدر گہری، تڑپتی محبت محبوب کے دل پہ دستک نہ دے سکے۔ لیکن شاید محبت کی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا کہ میری محبت تمہارے دل کے بند کواڑوں کو کھٹکھٹا ہی نہ سکی۔ میرے جذبے، میرے ہی دل کی دیواروں سے ٹکرا کے پاش پاش ہوتے رہے۔

میری چٹھیوں میں لکھے میرے تمام الفاظ اور سرنامے خزاں کے پتوں کی طرح ہوا کے دوش پہ اُڑتے اُڑتے تمہارے شہر تک آتے اور دوبارہ عذابِ دربدری سے گزر کے میرے ہی دروازے پہ تھک ٹوٹ کے گر جاتے!........ تم تک جذبات کی ایک بھی چٹھی نہ پہنچ سکی!

دو سال کی اس جنگ کے بعد میں نے ہمت کی کہ فقط ایک بار تمہیں بتا سکوں کہ میری نظموں، میرے لفظوں، میرے سازوں اور گیتوں میں جس کا چہرہ، جس کا تخیل بستا ہے، وہ تم ہو........ صرف تم........ نہ پہلے کوئی تھی اور نہ پھر کبھی ہو سکتی ہے۔ میں نے وہ راز تم تک پہنچا دیا۔ لیکن اس سے قبل تمہارے ہونٹوں سے نکلے فقط ایک جملے نے میری دنیا ہی تہس نہس کر دی۔ میری سماعتوں کے پرخچے اُڑا دیئے........ لیکن محبت انتقام نہیں ہوتی۔ محبت بدلہ، محبت نفرت نہیں ہوتی، محبت چھینتی نہیں۔ میں تم سے محبت کی بھیک نہیں مانگوں گا۔

میری محبت کی آنکھیں بھیگی ہوئی ہوں گی، اس کی روح بوجھل اور تھکی ہوئی ہو گی، لیکن اس کا سر ہمیشہ ہمیشہ اُٹھا رہے گا۔ مجھے میری آخری محبت مبارک اور تمہیں تمہاری خوشیاں!

محبت نے ہم دونوں کو کچھ نہ کچھ دیا ہے۔ تمہیں کامرانی اور بامرادی اور مجھے تنہائی اور نارسائی!

ہم میں سے کوئی ناکام نہیں! آخری خط کے اختتام میں فقط یہی لکھنا

چاہتا ہوں کہ تم میری پہلی خواہش ہو، اور تم میری آخری محبت ہو!........
اب یہ رُوح کسی کی تابع نہیں ہو سکتی۔ اب یہ دل کسی کا نہیں ہو سکے گا۔"

فقط
احد صدیقی

خط کے اختتام پر حرمین کا دل کچھ بوجھل اور کچھ خاموش تھا۔ اُس کے الفاظ میں اِک ملال تھی، جو اپنا آپ منوا رہی تھی۔ مگر حرمین خود اس سچائی کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی۔

"لفظوں کے جال بُننا تمہیں خوب اچھی طرح آتے ہیں احد صدیقی!"

اُس نے خط کو توڑ موڑ کے زمین پہ پھینک دیا۔ جذبات میں بھیگا وہ بیچارہ کاغذ تڑپ اُٹھا۔

◆◆○◆◆

حیدر آباد واپس آنے کے بعد بھی حرمین ذہنی طور پہ بہت پریشان تھی۔ اب اُس کا دل پڑھائی اور باقی ایکٹوٹیز میں بمشکل لگتا تھا۔ اور اُس کی عدم دلچسپی کی وجہ تھا، شاہ میر۔ صرف اور صرف شاہ میر۔

احد والے واقعے کے بعد وہ اشاروں کنائیوں میں شاہ میر کو بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ یہاں تنہا محفوظ نہیں سمجھتی خود کو۔ کسی چیز میں اُسے اس تحفظ کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ خود کو تنہا محسوس کرتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے، ہزاروں صفائیوں اور اظہارِ تنہائی کے، شاہ میر اسے ٹالتا رہا، یہ کہہ کے کہ اُس کے لئے پڑھائی اور ڈگری زیادہ ضروری ہونے چاہئیں۔ وہ جذبات کی رو میں بہک کے، جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ لے۔ شاہ میر کی اس طرح کی باتوں نے اُس کے دل کو بہت بوجھل کر دیا۔

◆◆○◆◆

آخری سمسٹر تھا۔ سبھی طلباء اور استاد ایگزام سے متعلق زیادہ سنجیدہ ہو گئے۔ احد اور حرمین کا جو تھوڑا سا بھی تعلق تھا، وہ ٹوٹ گیا۔ احد نے بھی اُسے دوبارہ کبھی تنگ نہیں کیا۔ وہ اس کے سامنے فارمل اور لیا دیا رہتا تھا۔ پھر اسی سمسٹر کے دوران یونیورسٹی میں سالانہ مشاعرہ ترتیب دیا گیا۔ گویا سالانہ مشاعرہ آل پاکستان مشاعرہ تھا، جہاں پورے ملک سے تمام یونیورسٹیز اپنے اپنے طالب علم بھیج رہی تھیں۔

حرمین، ہاسٹل کے کمرے میں بیٹھی پڑھائی کی کسی کتاب میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہی تھی، جب شاہ نے وہ کارڈ اُس کی کتاب کے اوپر رکھا اور پھر کچھ کہے بغیر ساتھ رکھے

بیڈ پر ڈھے گئی۔

"کیا ہے یہ؟" حرمین نے اُلٹ پلٹ کے دیکھا۔

"دعوت نامہ ہے۔" مختصر سا جواب آیا۔

"کس چیز کا دعوت نامہ؟"

"زرش اور احد کی شادی کا۔" ثناء کی بات نے اِک ہتھوڑا برسایا حرمین کے دماغ پہ

"کیا؟"

"کیوں، نہیں ہوسکتی اُن کی شادی؟" ثناء نے طنز سے پوچھا۔

"ہوسکتی ہے۔ لیکن میری حیرت کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح اچانک۔ کیا ان کا کو
افیئر تھا؟" حرمین نے اپنے تاثر کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ ثناء نے ایک ٹھنڈی سا
باہر نکالی۔

"فی الحال تو یہ کارڈ یونیورسٹی کے مشاعرے کا ہے، جو پرسوں ہو رہا ہے۔ لیکن
ابھی زرش سے سن کے آئی ہوں کہ اُس نے احد کو پرپوز کیا ہے اور احد نے ہامی بھر لی ہے
اور مجھے غصہ اس بات پہ آ رہا ہے کہ احد نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔" ثناء نے کہا۔

"تمہیں کیوں بتاتا وہ؟ تمہارا، اُس کا کیا رشتہ ہے؟" حرمین نے پوچھا۔

"اس کے اور میرے بیچ پہلے تو کوئی رشتہ نہیں تھا، لیکن اب ہے۔ اور وہ رشتہ تم
کوہاٹ سے واپس آنے کے بعد احد سیدھا میرے پاس آیا تھا۔ میرے کندھے پہ سر ر
وہ بلک بلک کے رویا تھا۔ مجھے ہر وہ بات بتائی، جو اُس کے اور تمہارے بیچ ہوئی تھی۔
ہفتہ شدید بخار کی حالت میں اُس نے صرف اور صرف مجھ سے تمہاری باتیں کیں۔ ا
کے اور میرے بیچ جو رشتہ ہے، وہ انسانیت کا ہے۔ تم نے اُسے جو درد دیا ہے، میں اُس
کو بانٹتی تھی۔" ثناء کی آنکھیں نمی چھلکانے لگی تھیں۔ لیکن وہ خاموش ہوگئی۔

"Stop this nonsense ثناء! تم جانتی ہو، میں اُس سے محبت نہیں کرتی۔" وہ بولی

"محبت نہیں کرتی تھیں تو اُس سے نفرت کا اظہار کرنے کا بھی تمہیں کوئی حق نہیں ا
چھوڑو یار! میں بھی پاگل ہوں، ایک پتھر سے کلام کر رہی ہوں۔ تم کہاں سمجھو گی کہ وا
مٹ چکا ہے تمہاری محبت میں اور مزید کتنا مٹا سکتا ہے خود کو۔ زرش سے شادی کا فیصلہ
فقط اِک انتقام ہے، اور کچھ نہیں۔" ثناء نے نفی میں اپنی گردن ہلائی۔

"حرمین خاموش رہی، کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی اور کچھ بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔

❖❖○❖❖

مشاعرے میں سبھی لوگ موجود تھے۔ بارہ سو افراد والا آڈیٹوریم کھچا کھچ لوگوں سے بھرا
تھا۔ نہ صرف یونیورسٹی، بلکہ پورے ملک کے لوگ وہاں موجود تھے۔ کئی شعراء آ چکے تھے۔
جو آ کے باری باری اپنی نظمیں سنا رہے تھے۔ ہر کسی کا اپنا انداز بیاں تھا۔ ہر کسی کے اپنے
احساسات تھے۔ داد و تحسین کا شور اُٹھتا اور شاعر مزید جوش و خروش سے آگے بڑھتا۔

احد صدیقی کے نام کی اناؤنس منٹ سے ہر طرف سے شور اُٹھا تھا۔ مقامی لوگ اور
یونیورسٹی فیلوز اس نام سے بخوبی واقف تھے، سبھی کے ہاتھ تالیوں کے لئے بلند ہوئے تھے،
سوائے حرمین کے ہاتھوں کے۔ وہ ثناء کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ احد کا نام آتے
ہی اُس نے تالیاں بجانی بند کر دیں اور خاموش بیٹھ گئی۔

احد اپنے گٹار کے ہمراہ اُٹھ کے آیا تھا اور ایک اسٹول پہ بیٹھ کے مائیک آگے رکھا۔
آڈیٹوریم میں سکوت چھا گیا۔

"معزز سامعین! اپنے مخصوص انداز میں، اپنے گٹار کے بیک گراؤنڈ میں نظم سنانا چاہتا
ہوں۔ اُمید ہے، پسند آئے گی۔" احد نے جوں ہی گٹار کے تاروں پہ ہاتھ رکھے، فضا میں
تالیوں کا ایک شور اُٹھا۔

گٹار کے میوزک کے بیک گراؤنڈ میں احد کی جذباتی آواز کا ایکو چاروں طرف
پھیلنے لگا۔ وہ نظم گنگنا نہیں رہا تھا، فقط اپنے الفاظ کے پیچھے اپنے گٹار کے تاروں کا احساس
دے رہا تھا۔

"دھڑکتے ہو میرے دل میں
روح میں سانس لیتے ہو
قلم میں آپ بولتے ہو
خوابوں کو پروتے ہو
کہ جتنا دور جاتے ہو
اتنا ہی پاس آتے ہو
کبھی تم بے وفا بن کے
بہت مجھ کو رُلاتے ہو
کبھی تم مجھ کو خط میں
کئے وعدے بھی لکھتے ہو
کبھی تم فون پہ بے حد ہی غصے میں

بہت ہی ترش سی کوئی بات کہتے ہو
اور پھر رات بھر تکیے بھگوتے ہو
کبھی تم مجھ سے کہتے ہو
کہ تم میرے نہیں ہو گے
کبھی تم ہاتھ پھیلائے مجھی کو مانگتے ہو
کبھی تم میرے خط کو پھاڑ دیتے ہو
کبھی تم ان کے ٹکڑے جوڑ کے
پھر پڑھتے رہتے ہو
کرو جو بھی ہمارے ساتھ
پر سُن لو......!
ہمارے تھے، ہمارے ہو......!
ہمارے نام پر ہی جیتے رہتے ہو
میری دھڑکن میں پہلے دن سے بسنے والی
اِک انجانی چاہت ہو
تم میری پہلی پہلی خواہش تھے
تم میری آخری محبت ہو......!

احد کا چہرہ اندرونی جذبات کا عکاس تھا۔ آنکھیں موہوم سی سرخی اور نمی سے جھلملا تھیں۔ الفاظ میں خود بخود ایک ماورائی کشش آ سمائی تھی۔ اور یہی کشش لوگوں کے دل بھی دستک دے چکی تھی۔ فضا میں تالیوں کا اِک شور تھا۔

حرمین کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئیں۔ ریڑھ کی ہڈی کے پاس بھی اِک لہر سی اُٹھ وہ عین یہی منظر اپنے خواب میں بھی دیکھ چکی تھی، احد اُسے اسی شدت، اسی محبت سے یق دلاتا ہے کہ تم میری آخری محبت ہو۔

ان جانے پہچانے، مانوس الفاظ کی گردان اُس کی روح کو بھی لرزا رہی تھی۔ تالیوں گونج کی آواز گویا دب گئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

وہ بوجھل قدموں سے ہاسٹل کی طرف جانے لگی۔ وہ محفل چھوڑ آئی تھی۔



''حرمین! رُک جاؤ۔'' احد کی آواز نے اُس کے چلتے قدم روک دیئے تھے۔ وہ اُ

کے سامنے آ گیا تھا۔ سیاہ رنگ کی شرٹ اور گرے پینٹ میں ملبوس، آنکھوں پر نظر کا چشمہ چڑھائے، احساسات اور جذبات سے تر آنکھیں۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

''کہیں بھی جاؤں، اس سے تمہیں مطلب؟'' وہ تپ گئی تھی۔

''محبت سے ڈرتی ہو ناں؟ نظریں چرا کے بھاگتی ہو؟ اپنے ہی اندر بھڑکتے الاؤ سے خوف کھاتی ہو ناں؟'' احد کے لہجے میں یقین تھا۔ وہ پہلی مرتبہ اُسے تم کہہ کے بلا رہا تھا۔

''میں کسی سے نہیں ڈرتی احد صدیقی! نہ میں تمہاری محبت کو مانتی ہوں......نفرت ہے مجھے اس محبت سے، جس کا تم پوری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے ہو۔ تمہیں کسی کی رسوائی، کسی کی بے عزتی کی بھی پروا نہیں۔'' وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی۔

''میں تمہیں اپنی عزت مانتا ہوں۔'' احد کے لہجے میں مان تھا۔

''تف ہے تم پر احد! نفرت ہے مجھے تم سے۔'' وہ بھڑک اُٹھی۔

احد بہت مطمئن سا کھڑا تھا۔ آنکھوں میں بدستور وہی جذبے اور چمک تھی۔ دُور سے کسی شاعر نے اپنا مصرعہ پڑھا تھا

یہ عشق تیرا پہنچا آج کس مقام پر
نفرت بھی مجھ کو تیری، بہت قیمتی لگی

احد نے اپنی شہادت کی اُنگلی اُٹھائی اور اُس کی طرف دیکھا۔

''اکائی کی طاقت، عشق کا جنون بہت انمول ہوتا ہے حرمین! اس پہ یقین کرو۔ شاید زندگی کے کسی موڑ پر تمہیں یہ احساس ہو جائے کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے، مجھے اس محبت کی صداقت پہ کتنا مان ہے، میں اپنی طرف سے کتنا سچا ہوں۔ ایک بار ہی سہی حرمین! تمہیں اس کا یقین ضرور آئے گا۔ اکائی کی طاقت کبھی ہار نہیں سکتی۔ اور جس دن تمہیں اس کا یقین آ گیا حرمین! اُس دن میری محبت کی جیت ہو گی۔ فتح ہو گی میری وفا کی۔'' نمی اُس کی آنکھوں میں گہری ہوتی گئی۔

''ایسا دن کبھی نہیں آئے گا احد!......ایسا دن میں کبھی آنے نہیں دوں گی۔'' وہ بہت سرد لہجے میں کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

آنکھ میں کتنی دیر سے اٹکی نمی بالآخر احد کی آنکھ سے پھسل گئی۔



وقت پَر لگا کے اُڑتا رہا۔ فائنل ایگزامز ہو گئے، چھٹیاں ہو گئیں۔

وہ کوہاٹ واپس آ گئی، ہمیشہ کے لئے۔ اور شاہ میر کے لوٹ آنے کے بعد اُس
رخصتی بھی ہو گئی۔ وہ اپنی زندگی سے بہت خوش رہنے لگی۔
احد صدیقی فقط ایک ٹھنڈی آہ اور انجانی یاد بن کے فضا میں پرواز کرتا رہا۔ ہاں
اُس کے خوابوں سے حرمین کا رشتہ کبھی بھی نہ ٹوٹ سکا۔



پانچ برس بعد کی اِک جگمگاتی صبح تھی۔
"نئے انٹرویوئز آ گئے ہیں؟" اُس نے ساتھ چلتے ہوئے ضیاء سے پوچھا تھا۔
"جی ہاں! ٹوٹل تیس لڑکے لڑکیاں ہیں۔ لاؤنج میں انتظار کر رہے ہیں۔ جب
کہیں، انٹرویو اسٹارٹ ہو جائے گا۔" ضیاء نے کہا۔
"او کے۔ تم ان تمام کی سی ویز اندر بھجوادو۔ میرا خیال ہے، کسی اور ممبر کا بیٹھنا ضر
نہیں۔ تم جا کے ٹریننگ ڈویژن کا جائزہ لے آؤ۔ یہ تیس بندے صرف ایک گھنٹے کا جھنجو
ہیں۔ دو جملوں سے ہی پتہ چل جائے گا، کون کسٹمر کالز لینے کے لائق ہے، کون نہیں"
گرے کوٹ کے بٹن بند کرتا "ایم۔اے۔ایس" اپنے دفتر کی جانب بڑھا۔
محمد احد صدیقی یہاں شارٹ میں ایم۔اے۔ایس کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ
الاقوامی کال سینٹر کا جدید دفتر تھا، جہاں احد ایچ۔آر آفیسر تھا۔ تین سال قبل اُس نے ہ
ریسورسز مینجمنٹ کی ڈگری لی اور یہاں اچھی پوسٹ پہ لگ گیا۔ اپنا ذاتی فلیٹ اور انسٹالم
پہ گاڑی لے لی۔ زندگی نے اِک نئی رفتار پکڑ لی۔ اپنے دفتر کے شیشے کے پارٹیشن کے
پار بیٹھا، وہ اس انوکھی کال سینٹر کی دُنیا کو دیکھا کرتا تھا۔
قطار میں بیٹھے لڑکے اور لڑکیاں کانوں پہ ہیڈ فون چڑھائے، دنیا بھر کے فون کے
پہ بیوقوف بنا رہے ہوتے۔ یہاں Rebuttals بھی ہوتے، کراس کوئچن ہوتے، کس
اُس کی کمزوریوں سے ٹریپ کیا جاتا، اُسے مکھن لگا کے اپنی پراڈکٹ یا سروسز بیچی جا
یو کے، یو ایس اے اور آسٹریلیا میں بیٹھے لوگ فقط فنگر ٹپس پہ بے وقوف بن جاتے او
سب کے لئے درکار ہوتا فقط اچھا انگریزی لہجہ، ذہانت اور وقت کا بہترین استعمال۔
آج بھی انہی ایجنٹس کے انٹرویوز کرنے تھے۔ احد کو اُن کے انٹرویوز کرنے میں
لئے بھی دلچسپی تھی کہ وہ فقط ایک ہی نظر میں پہچان لیتا تھا کہ کون سا لڑکا یا لڑکی اس کام
لئے بہتر ہے، کس میں صلاحیت ہے کہ وہ کام کر لے، کون نہیں کر سکتا۔ زیادہ تر اح
سلیکشن اچھی مانی جاتی تھی۔

احد اپنے آفس میں آ کے بیٹھا۔ گلاس پارٹیشن کی دوسری جانب کچھ کنفیوز، کچھ ریلیکس
لڑکے لڑکیوں کو دیکھا۔ کچھ انتہائی ماڈ اسکاڈ اور کچھ سادہ سے چہرے تھے۔ کچھ ڈری سہمی
مسکراہٹیں اور کچھ ایسے ڈھیٹ تاثرات، جن کی شکل دیکھ کے لگتا تھا کہ وہ کئی انٹرویوز دے
چکے ہیں۔ اور اُنہی پہ نظر ڈالتے ڈالتے احد کی آنکھیں ٹھہر گئیں........ سانس تھم سی گئی۔
سینے کے کونے میں دھڑکن تیزی سے دوڑنے لگی۔
سفید دوپٹہ، شلوار اور فیروزی قمیض میں وہ حرمین خان تھی۔ اور وہ کیسے نہ پہچانتا اُس
چہرے کو۔ وہ کھلتے پھولوں سی، جگمگاتی رنگت، وہ شراب اُنڈیلتی آنکھیں۔
وہ گود میں رکھی فائل پہ اپنے ہاتھ رکھے، غیر مرئی نقطے پہ آنکھیں ٹکائے، ہمیشہ کی طرح
خاموش بیٹھی تھی۔ وہ دُور سے ہی بہت دُبلی، بہت بیمار لگ رہی تھی۔
احد نے کھڑے ہو کے اُس کی جانب دیکھا۔ اور لوگ تو متوجہ ہوئے مگر اُس نے نہیں
دیکھا۔ احد نے انٹرکام اُٹھایا اور دفتر کے باہر بیٹھی ریسپشنسٹ سے بولا۔
"مس! لیفٹ رو میں بیٹھی تیسری لڑکی کی سی وی پہلے اندر بھجوا دیں۔ پہلے اُن کا انٹرویو
ہو گا۔"
"لیفٹ رو، سر! لیکن اُن کے ساتھ ایک پرابلم ہے۔" کرسچین سگرڈ نے حرمین کی
طرف دیکھ کے کہا۔
"پرابلم؟" احد کا دل دھڑکا۔
"اُنہوں نے اپنا سی وی بھی مجھے دے دیا ہے۔ وہ کام میں انٹرسٹڈ بھی ہیں........
ٹ سر! شی از بلائنڈ۔" سگرڈ نے کہا۔ احد کی حیرت سے آنکھیں پھٹ گئیں۔
"وہاٹ؟" وہ بولا۔
"آئی تھنک سر! وہ جاب کے لائق نہیں ہے۔ کیا میں اُسے ریفیوز کر دوں؟" سگرڈ
یادہ جلدی میں تھی۔
"مس سگرڈ! میں نے ایسا نہیں کہا۔ جسٹ سینڈ ہر ان۔" وہ سختی سے بول کے اُس کی
جانب دیکھنے لگا۔
دوسرے ہی لمحے وہ سایہ برگ گل، وہ جہان آب و گل سے ماورا لڑکی، وہ چاند نگر کی
الہڑ پری اُس کے سامنے تھی۔ وائٹ کین کی مدد سے چلتی وہ اندر آئی اور کرسی کو ہاتھ سے
ٹٹول کے اس کے سامنے براجمان ہو گئی۔
احد نے اِک محبت بھری نگاہ اُس پہ ڈالی۔ اُس کے ساتھ گزرا ایک ایک لمحہ، یونیورسٹی

کی چھیڑ چھاڑ اُس کی آنکھوں کے آگے جھلملا گئی۔

چلو چھاؤں پہنتے ہیں
چلو اودل میں چلتے ہیں
چلو کینٹین میں بالا جبار میں جا نکلتے ہیں
چلو ٹاور کے میں
چلو ہم روشنی کے قرمزی مینار کے لمحوں میں رُکتے ہیں
چلو ہم خواب بُنتے ہیں
چلو چھاؤں پہنتے ہیں
چلو ہم تتلیوں کو، جگنوؤں کو راستے دے کر
نئی سمتیں بناتے ہیں
چلو ہم ہاتھ میں شمعیں اُٹھا کر، زندگی کو راہ دکھاتے ہیں
چلو ہم مٹھیوں میں دھوپ کی کرنیں چھپاتے ہیں
چلو ہم چاند کے زینے پہ چڑھ کے، گیت گاتے ہیں
چلو ہم بادلوں کے دیس سے کچھ خواب لاتے ہیں
چلو ہم بارشوں کو اپنی آنکھوں میں پروتے ہیں
چلو اس چلچلاتی دھوپ پر اِک نظم لکھتے ہیں
چلو چھاؤں پہنتے ہیں......!!

وہ، جس کو دیکھ کر اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز رفتاری سے دوڑنے لگی تھیں، جو ا سے رنگوں، خوشبوؤں اور روشنیوں کو لے آئی تھی، جو ہاتھ میں مائیک تھامتی، تو اُ خوداعتماد آواز اپنا جادو دیکھنے والوں پہ پھونک دیتی۔ جو قلم تھامتی تو لفظ اُس کی اُنگلیو تابع ہو جاتے۔ وہی لڑکی، آج بجھی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اُس کے سامنے تھی۔ احم رشتہ تو فقط احد کے دل میں تھا۔ اور بصارت کا رشتہ بھی اب گویا ختم ہو گیا تھا۔

"مس حرمین خان، فرام کوہاٹ۔ کوالیفیکیشن ایم۔اے اُردو فرام سندھی یونیو ایج اُنیس سال۔" وہ اپنی ٹیبل پہ رکھی حرمین کی سی وی پڑھ رہا تھا۔ مانوس آواز نے کے دل کی دھڑکنیں تیز کر رکھی تھیں۔

"یہ جاب آپ کی ضرورت ہے یا پھر شوق؟" پہلا سوال آیا۔

"سر! گو کہ میں نے آج تک ہر کام اپنے شوق کو سامنے رکھ کے کیا ہے، لیکن یہ

میری ضرورت ہے اور مجبوری بھی۔" وہ بولی۔ آواز میں وہی برسوں پرانا اعتماد تھا۔

"وہ کیسے؟"

"میں دیکھ نہیں سکتی۔ بریل ایجوکیشن لینے اور لکھنا سیکھنے میں مجھے بہت وقت لگے گا۔ میرے لئے میری آواز ہی کارآمد ہے، کال سینٹر کی جاب میں کر سکتی ہوں۔" وہ بولی۔

"ذرا سا پرسنل سوال ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں، آپ نے اپنی آنکھیں کیسے کھوئیں؟" وہ بولا۔

"ایک حادثہ ہوا تھا، چار سال قبل۔" اُس نے مختصراً جواب دیا۔

"میں آپ کو اپوائنٹ کر لیتا ہوں۔ ہم ایک ماہ آپ کو ٹریننگ دیں گے۔ ٹیلی فون میکانزم اور باقی گُر سکھائیں گے، پھر کالز پہ آپ کو لگائیں گے۔ آپ کون سی شفٹ میں کام کرنا پسند کریں گی؟ صبح سات سے دن بارہ بجے تک آسٹریلین کمپین ہوتی ہے۔ دوپہر دو سے رات دس بجے تک یو کے کی شفٹ اور رات گیارہ سے صبح چھ تک امریکہ کی۔ آپ کو جو موزوں لگے۔" اُس نے پوچھا۔

"سر! کیا میں صبح اور دوپہر دونوں شفٹس میں کام کر سکتی ہوں؟"

"پوچھ سکتا ہوں، اس کی وجہ کیا ہے؟" اُسے تشویش ہوئی۔

"میں اکیلی رہتی ہوں۔ پانچ سال کا ایک بیٹا بھی ہے۔" اُس کے لہجے میں اُداسی سی در آئی۔

"اور آپ کے ہزبینڈ؟"

"اُنہوں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ ملک سے باہر رہتے ہیں۔" اُس نے مختصراً جواب دیا۔

"آپ کو اپائنٹ منٹ لیٹر مل جائے گا۔ آپ اگلے پیر کو جوائننگ دے سکتی ہیں۔" احد نے بغور اُس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تھینک یُو سر!" وہ بولی۔

"اور آپ کو دو شفٹس میں کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ یو کے کی کمپین میں آپ کی اچھی سیلری بن جائے گی۔" احد نے نرمی سے کہا۔ پھر وہ کچھ رسمی الفاظ کہہ کے چلی گئی۔

اس کے بعد کچھ اور انٹرویوز بھی ہوئے لیکن احد کا دھیان اب کام سے ہٹ گیا تھا۔ اس محبت کو اتنے سال کسی زخم کی طرح پالا تھا، جس کی پٹیاں تبدیل کی تھیں، جس پہ بدل بدل کے مرہم لگائے تھے، وہی محبت خود زخم خوردہ ہو کر آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ

جس نے زندگی میں روشنی بھری تھی، وہی اپنی آنکھوں کی روشنی گنوا بیٹھی تھی۔ نجانے
پر، نجانے کس طرح سے۔ نجانے حالات نے اُسے کیا کچھ دکھایا تھا۔ وہ دیر تک
کے دُھوئیں میں اپنے جواب تلاشتا رہا۔



وہ روزانہ آفس آنے جانے لگی تھی۔ آنکھوں کے سامنے رہنے لگی تھی۔ احد۔
بار کوشش کی کہ وہ اُسے اپنے بارے میں بتا دے لیکن پھر ہمت ہی نہ کر پایا۔ اکثر
کے دوران کینٹین میں یا لفٹ میں احد کی اُس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ اب اُن
میں ہلکی پھلکی گفتگو بھی ہونے لگ گئی تھی۔ لیکن احد چاہ کر بھی اُسے کبھی بتا نہیں پایا کہ
ہے؟ وہ اندر ہی اندر مضطرب سا تھا۔ کئی سوالات اُس کے اندر غل مچا رہے تھے
وجوہات تھیں کہ اُس کی شادی ختم ہوگئی؟ وہ کیا حادثہ تھا، جس نے اُس کی آنکھیں
لیں؟ اُس کے گھر والوں میں سے کوئی اُس کے ساتھ کیوں نہیں، وغیرہ وغیرہ۔

انہی اضطراب بھرے دنوں میں سے ایک دن تھا۔ وہ خود ہی اُس سے ملنے
آفس آئی تھی۔ سیکرٹری نے اُس کی آمد کی اطلاع دی اور اگلے ہی لمحے وہ اُس کے سا
تھی۔ لائٹ گرین کاٹن کے سوٹ میں ہمیشہ کی طرح منفرد اور جاذب نظر۔

''صدیقی صاحب! میں آپ کو انوائٹ کرنے آئی تھی۔'' وہ بولی۔ ''میرے بیٹے
کا برتھ ڈے ہے کل شام۔ زیادہ بڑا تو نہیں، بس کچھ دوستوں کو مدعو کیا ہے۔ آپ
آئیے گا۔ مجھے بہت خوشی ہوگی۔ اپنی فیملی کو بھی لے آئیے گا، اپنے بچوں کو بھی۔'' پ
کے لفافے میں لپٹا کارڈ اُس نے احد کی جانب بڑھایا۔

''میں خود تو آ جاؤں گا، مگر میری کوئی فیملی نہیں۔ شاید اسٹاف میں سے کسی نے
بتایا ہو کہ میں ابھی بیچلر ہوں۔ Eligible bachelor۔'' احد نے مسکرا کے کہا۔

''میری تو یہاں کسی سے زیادہ ہائے ہیلو نہیں اور آپ کے بارے میں تو یہاں
زیادہ علم ہی نہیں۔ آپ کے نام کے متعلق بھی کئی قیاس آرائیاں ہوتی ہیں۔ یا آپ
اے ایس بلایا جاتا ہے، یا پھر صدیقی صاحب۔ آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں سر؟''

''کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟ دنیا میں باپ کا نام، خاندان کا نام پہچان بنتا
آخرت میں ماں کا نام، شادی ہو جائے تو عورت اپنا نام کھو دیتی ہے، بچے بڑے ہو
باپ کو بچوں کے نام سے پہچانا جاتا ہے، دفتر میں Designation نام بن جاتا۔
محلے میں ذات۔ بیوی ''سنیے جی'' کہہ کے پکارتی ہے، بچے پاپا یا ڈیڈی، کوئی چچا،

وغیرہ وغیرہ۔ راستہ چلتے لوگ بھائی صاحب، بڑے میاں یا پھر ابے او۔ اپنی شناخت
پنا نام تو فقط اندر ہی کہیں رہ جاتا ہے۔ دنیا کی بھیڑ میں کہیں کھو سا جاتا ہے۔'' احد
کہا۔

''بہت دلچسپ باتیں کرتے ہیں آپ سر! آپ کی باتیں مجھے کسی کی یاد دلا دیتی
۔'' وہ اُداسی سے بولی۔

''کس کی؟'' احد کا دل دھڑکا۔

''تھا کوئی دوست، یونیورسٹی میں۔ وہ بھی لفظوں کو اپنا تابع بنا دیتا تھا۔'' اُس کی ویران
یں کہیں کھو گئیں۔ احد نے پیار بھری آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُسے خوشی ہوئی
ہ کم از کم اُسے یاد تو کرتی ہے، دوست کہہ کے بلاتی تو ہے۔ وہ اپنا بیگ تھامے اُٹھ
ی ہوئی۔

''اچھا سر! میں چلتی ہوں۔ ضرور آئیے گا۔''

''انشاء اللہ!'' وہ مسکرایا۔

اُس کے جانے کے بعد وہ دیر تک اُسی کی یادوں میں کھویا رہا۔



وہ چھوٹے سے تحفے کے ہمراہ پارٹی میں موجود تھا۔ حرمین اُسے باری باری سبھی
نوں سے ملوا رہی تھی۔ اُنہی مہمانوں میں ثناء بھی شامل تھی، جو کہ پہلے اپنے ساتھ کھڑی
ت سے محو گفتگو تھی لیکن حرمین کے متوجہ کرانے پر وہ مڑی اور اُس کی آنکھیں ٹھہری کی
ی رہ گئیں۔

''ثناء! یہ صدیقی صاحب ہیں۔ میرے باس۔ اور سر! یہ ثناء ہیں، میری بہت اچھی
ت اور کلاس فیلو۔'' حرمین نے تعارف کروایا۔

ثناء ہکا بکا اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے کے تاثرات پل پل بدل رہے تھے۔
مین کو کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن احد نے گردن کے اشارے سے اُسے منع کر دیا۔

''نقاش کہاں گیا؟...... نقاش!...... میں اُسے لے کر آتی ہوں۔'' حرمین نے
ں کے درمیان کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

''کیا حرمین کو پتہ ہے کہ اُس کے باس کا اصل نام کیا ہے؟'' ثناء اور احد ذرا کونے
کھڑے ہو گئے تھے۔ ثناء نے پوچھا۔

''نہیں، میں ہمت نہیں کر پایا اُسے بتانے کی کہ میں کون ہوں۔'' اُس نے کہا۔

"ہمیشہ کی طرح دیر سے بتائیں گے آپ۔ زرش کیسی ہے؟" ثناء نے پوچھا۔
"کون؟ زرش آفریدی؟" وہ تمسخرانہ ہنسا۔ "وہ محض افواہ تھی کہ میں اُس سے
کروں گا۔"
"اس کا مطلب، آپ نے شادی نہیں کی؟" ثناء نے حیرت سے اُسے دیکھا۔
"اس کے بغیر جینا اتنا مشکل تھا، شادی کیا خاک کرتا؟" وہ تاسف سے خا
گھورتے ہوئے بولا۔ کچھ پل دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔
"اس کے ساتھ بھی بہت برا ہوا تھا۔ جس کا اتنے سال اس نے انتظار کیا، وہ
نے اس سے شادی بھی کی اور شادی کے کچھ عرصے بعد اُس کی پہلی انگریز بیوی
اُسے اپنے ساتھ لے گئی۔" ثناء نے شاہ میر کے متعلق اطلاع دی۔
"کیا وہ پہلے سے......شادی؟" احمد حیرت میں مبتلا تھا۔
"ہاں......اُس نے بتایا ہی نہیں تھا، وہ چلا گیا۔ پھر نقاش اس دنیا میں آیا۔
نے اسے بہت بلایا، بہت رابطہ کیا، وہ تو نہیں آیا، اُس کی طرف سے طلاق نامہ آ گیا
کی شادی تھی۔ گھر والے پہلے ہی حرمین سے خفا تھے۔ اپنا بچہ لے کر کہاں جاتی؟
اسی کشمکش میں تھی کہ اپنی آنکھیں بھی کھو بیٹھی۔" ثناء نے اُسے تفصیل بتائی۔
"لیکن کس طرح؟" احمد بہت دُکھ سے اُس کی کہانی سن رہا تھا۔
"خود ڈرائیو کر کے جا رہی تھی۔ کچھ تو خود بھی اس میں زندہ رہنے کی تمنا نہ تھی
وقت بھی بہت ظالم تھا۔ ایکسیڈنٹ ہو گیا، کھو دی اپنی بصارت اُس نے۔" ثناء کی
میں نمی آ گئی تھی۔
"پھر کراچی آ گئی۔ چھوٹی موٹی نوکریاں کرنے کے بعد اسے آپ کے یہاں
ملی۔ اب کچھ ذہنی طور پر سیٹل ہے۔"
"لیکن اتنا سب ہو گیا اور مجھے بتایا بھی نہیں۔ کیا میں دوست کی حیثیت بھی
تھا؟" احمد نے نرمی سے کہا۔
"کہاں سے ڈھونڈتی وہ اور کہاں سے ڈھونڈتی میں؟ آپ حیدر آباد میں تھے
اور وہ اس قدر خوددار ہے کہ وہ کسی سے بھی مدد مانگنا نہیں چاہتی۔ مجھ سے بھی نہیں۔"
"لیکن آنکھوں کا علاج تو کروا سکتی تھیں ناں تم اُس کا۔ آپریشن یا پھر ٹرانسپلانٹ"
"ہو سکتا ہے اُس کا آپریشن......دکھایا تھا میں نے ڈاکٹر کو۔ لیکن کہاں سے
پیسہ۔ مجھ سے یہ کچھ بھی لینے کو تیار نہ تھی۔ میرے ہزبینڈ خود ڈاکٹر ہیں، ان کی مدد

د کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے کوئی چیز معنی نہیں رکھتی۔" ثناء نے افسوس سے کہا۔
"میری ایک مدد کر سکتی ہو ثناء؟...... میں حرمین کی آنکھیں اُسے واپس دینا چاہتا
ہوں، میں اُس کا آپریشن کروانا چاہتا ہوں۔ اُسے منانا تمہارا کام ہے، باقی میں سب کر
لوں گا۔" احمد نے ملتجی انداز میں کہا۔ ثناء مسکرا دی۔
"واقعی احمد بھائی! آپ ایسا کریں گے؟"
"اُس کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں ثناء! وہ اور اُس کی محبت میرے لئے، میری
اپنی زندگی سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔" احمد کے لہجے میں یقین تھا۔ ثناء نے کچھ حیرت
اور کچھ پیار سے اس لڑکے کی جانب دیکھا، جس کے اندر کتابوں اور کہانیوں میں سے اُٹھ
کر محبت آ بسی تھی۔ وہ مٹ جانے کی حد تک محبت کرتا تھا۔ گو کہ اُسے محبت نے کچھ نہیں دیا
تھا لیکن پھر بھی اُس کا اوڑھنا بچھونا فقط اُس کی محبت ہی تھی۔



کہا اُس نے، میرے ہونے کا یہ احساس تم ہو ناں
کہا اُس نے کہ جیون کی حسیں اِک آس تم ہو ناں
کہا اُس نے، تمہارے بن کوئی بھاتا نہیں مجھ کو
کہا میں نے، مجھے بھی تو جہاں میں راس تم ہو ناں
کہا اُس نے، ہمیں یہ فاصلے دُور نہ کر دیں
کہا میں نے، تمہارے شک تمہیں ہی چور نہ کر دیں
کہا اُس نے، تصور میں ترے میں کھوئی رہتی ہوں
کہا میں نے، تیرے جذبے تجھے مشہور نہ کر دیں
کہا اُس نے دُعائیں زندگی کی مانگتے کیوں ہو
کہا میں نے، میری اس ذات سے منسوب تم ہو ناں
کہا اُس نے کہ جنت میں خدا سے کس کو مانگو گے
کہا میں نے، میرے ہمدم، میرے محبوب تم ہو ناں
کہا اُس نے کہ تم کو زیست کیا محسوس ہوتی ہے
کہا میں نے، تمہارے بن سزا محسوس ہوتی ہے
کہا اُس نے کہ آنکھوں میں لکھی تحریر کیسی ہے
کہا میں نے کہ جذبوں کی دُعا محسوس ہوتی ہے

کہا اُس نے، مجھے گرداب سے باہر نکالو تم
کہا میں نے، کرو کچھ حوصلہ، خود کو سنبھالو تم
کہا اُس نے، کوئی ایسا نہیں، اپنا جسے مانوں
کہا میں نے، میرے شانوں پہ آنسو سب بہالو تم
کہا اُس نے، محبت زندگی میں درد لاتی ہے
کہا میں نے کہ معجزے بھی تو محبت ہی دکھاتی ہے
کہا اُس نے، محبت میں فقط آنسو ہی آنسو ہیں
کہا میں نے کہ ہنسنا بھی محبت ہی سکھاتی ہے

کامیاب آپریشن کے چند روز بعد آج اُس کی پٹی کھلنی تھی اور اُس نے رنگ و بُو دُنیا میں واپس لوٹنا تھا۔ نظاروں اور روشنی کو دوبارہ اپنی آنکھوں کی پُتلیوں میں مقید کرنا تھا اندھیروں کے ساتھ کو چھوڑنا تھا، ستاروں کو دوبارہ مٹھیوں میں بھرنا تھا۔

ہاسپٹل کے اس چھوٹے سے پرائیویٹ رُوم میں ثناء اور حرمین کی بہن موجود تھے۔ نقاش اپنی خالہ کی گود میں تھا اور احد کمرے کے باہر کھڑا یہ تمام منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نئی زندگی پانے والی آنکھوں کو کوئی صدمہ پہنچے، یا وہ کوئی ایسی چیز دیکھیں، جو دیکھنا نہیں چاہتیں۔ وہ اس لئے منظر عام سے ہٹ گیا تھا۔

ڈاکٹر آہستہ آہستہ اُس کی آنکھوں پہ بندھی پٹی کی گرہیں کھولتا جا رہا تھا۔ گرہیں مکمل طور پر کھول کے ڈاکٹر نے شفاف رُوئی ہٹائی۔

''کس کا چہرہ آپ سب سے پہلے دیکھنا چاہیں گی؟ میرا خیال ہے، اپنے بیٹے کا۔'' ڈاکٹر زیدی نے پوچھا۔

''میں سب سے پہلے اپنے محسن کا چہرہ دیکھنا چاہوں گی ڈاکٹر صاحب! جس کی بدولت یہ روشنی آج مجھے واپس ملی ہے۔'' وہ بند آنکھوں سے بولی۔ عجب تجسس تھا۔ آنکھیں کھلنے کو مچل رہی تھیں۔ روشنی دیکھنے کو تڑپ رہی تھیں۔

''اندر آجایئے صدیقی صاحب! ان آنکھوں کو آپ کی ضرورت ہے۔'' ثناء نے مسکرا کے اُسے بلایا۔ وہ بدستور ڈرا ہوا تھا۔

''نہیں ثناء! وہ مجھے دیکھنا نہیں چاہے گی۔'' وہ مسلسل نفی میں گردن ہلا رہا تھا۔

''وہ تمہیں ہی دیکھنا چاہ رہی ہے۔ آجاؤ اندر۔'' ثناء اُس کا ہاتھ پکڑ کے اُسے اندر لائی۔

وہ عین اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

''اب آپ اپنی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولیں۔'' ڈاکٹر کی آواز سنائی دی۔

اُس نے دھیرے سے اپنی پلکوں کو جنبش دی۔ برسوں سے اندھیرے میں بھٹکتی آنکھیں روشنی میں آ کے چندھیانے لگیں۔ کئی بار آنکھیں جھپکنے کے بعد آنکھیں روشنی کی تیز رفتار سے ذرا مانوس ہوئیں اور آنکھ کھلنے کے بعد بھی اُس نے سب سے پہلے اُسی چہرے کو دیکھا......احد کے چہرے کو......اُسی چہرے کو جو بھی آنکھوں میں بھی ستاروں کی طرح جگمگایا کرتا تھا۔ جو اندھیرے کی دبیز چادر کو چیر کے اپنے دمکتے چہرے اور چمکتی مسکان کے ساتھ اُس کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔ وہی چہرہ، جو پانچ برسوں تک خوابوں میں زندہ رہا تھا، لور کی کوئی وحی بن کے رُوح پہ نازل ہوتا تھا، روشنی کی واحد کرن بن کر آتا تھا، محبت کی معراج بن کے لمحہ لمحہ ساتھ رہا تھا۔ وہ، جس کی وجہ سے زندگی ابھی باقی تھی۔

''احد صدیقی!'' مکمل طور پہ آنکھیں کھلنے کے بعد اُس نے پہلا نام یہی لیا تھا اور احد وہاں زیادہ دیر رُک نہ سکا۔ یہ لمحہ اُس کے لئے فیصلہ کن تھا۔ وہ ان آنکھوں میں اپنے لئے نفرت دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کے لئے یہی بہت تھا کہ لحظہ بھر کے لئے ہی سہی، ان آنکھوں نے اُسے دیکھا تو۔ وہ کمرہ چھوڑ کے چلا گیا۔ حرمین کی آنکھیں گویا وہاں منجمد سی ہو گئی تھیں۔



وہ ثناء کے ہمراہ کتنی دیر سے خاموش بیٹھی تھی۔ نقاش اُس کی گود میں سو گیا تھا۔ ننھے فرشتوں سے اُس کے نقوش دیکھ کر ماں کے کلیجے میں راحت سی آ گئی تھی۔ اتنے سال اُس کے خال و خد کو فقط ہاتھ لگا کے محسوس کیا تھا، انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنا ایک سرشاری کی سی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ ثناء جو چائے بنا کر لائی تھی، وہ ان دونوں کے درمیان بیڈ پہ رکھی تھی۔ اس میں سے گرم بھاپ اُٹھ رہی تھی۔

''کم از کم ایک بار......ایک بار تم ہی بتا دیتیں کہ احد ہی صدیقی صاحب ہیں۔'' حرمین نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔

''تو اس سے کیا ہوتا؟ تم آپریشن نہ کرواتیں؟ ساری عمر اندھیروں میں رہتیں۔ اور تم جانتی ہو کہ احد نے کوئی خرچہ اپنی طرف سے نہیں کیا۔ کمپنی نے میڈیکل دیا ہے تمہیں، ایک ایمپلائی کی حیثیت سے۔'' ثناء نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔

''لیکن پھر بھی، واسطہ تو احد صدیقی ہی بنا ناں۔ ایک اور احسان اُس کا میری ذات

پہ۔" حرمین نے ٹھنڈی آہ بھری۔ کپ لے کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھا۔

"کیا احسان کیا ہے اُس نے تم پہ؟" ثناء نے پوچھا۔

حرمین نے نقاش کو بیڈ پہ لٹایا اور خود اُٹھ کے کھڑکی تک آئی۔ باہر سرما کی ہ
کھڑکی سے ٹکرا کے شائیں شائیں کر رہی تھیں۔ اِکا دُکا گاڑیوں کے ہارن سماعتوں ۔
رہے تھے۔

"چاہے جانے کا احساس، بہت انمول ہوتا ہے۔ احد نے مجھے ہمیشہ چاہا،
خواہش کی، مجھے اپنا مانا۔ حالانکہ اُسے جواب میں میری طرف سے صرف انکار ا
نارسائی ملی۔ لیکن پھر بھی وہ مجھے چاہے گیا۔ یہ احسان تھا اُس کا مجھ پہ۔ اس انمو
ماوری محبت نے شاہ میر کی بے وفائی کے احساس کو اوور لیپ کیا۔ اُس کی بے وفائی مج
نہیں پائی۔ اُس کے جانے کے بعد میں ٹوٹی نہیں، بکھری نہیں، مری نہیں۔ بس اِک اح
تلے جیتی رہی کہ احد نے مجھے چاہا ہے۔ اُس کے الفاظ، اُس کے گیت، اُس کے واکم
دُھنیں، اُس کی یادیں میری زندگی رہیں۔ میں جیتی رہی، اُس کے خوابوں میں کھوئی
زندگی کو برتتی رہی۔ اُس کے ہونے کا احساس ہمیشہ آس پاس ہوتا۔ میں کسی کو بھی دیکھ
سکتی تھی، لیکن اُس کا چہرہ میری آنکھوں میں ہمیشہ جگمگاتا رہا۔ وہ ٹھیک کہتا تھا کہ اُس کی
کبھی نہیں ہار سکتی۔ اکائی کی طاقت ہمیشہ جیتتی ہے۔ میرے دل کے پور پور نے،
شریانوں کے روم روم نے لمحہ لمحہ مجھے احساس دلایا کہ اُس کی محبت سچی تھی۔ وہ جیت گ
سے۔ وہ مسیحا ہے میرا۔ وہ محسن ہے میرا۔" حرمین کی آنکھوں میں نمی سی جھلملا رہی تھی۔
اپنی دوست کی آنکھوں میں پہلی بار احد کے لئے لفظ محبت پڑھ رہی تھی۔

"مجھے یہ جان کے حیرت ہوئی کہ احد نے تمہارے بعد تنہائی کو ہی اپنا جیون بنا
اُس نے آج تک شادی نہیں کی، بقول اُس کے، وہ تمہارے بنا جی نہیں سکتا تو شادی
خاک کرے گا۔" ثناء کی بات پر وہ مزید حیرت میں مبتلا ہو گئی۔

"تو پھر......وہ......زرش آفریدی؟" حرمین نے پوچھا۔

"افواہ تھی وہ۔ انتقامی افواہ۔ تمہاری محبت میں فنا ہوتے احد نے انتقامی افواہ اُ
تھی، تمہاری اور شاہ میر کی شادی کی اطلاع پا کے۔"

حرمین کی آنکھ سے اِک آنسو پھسل آیا تھا۔

"اُس نے مجھ سے اتنی محبت کی ثناء! اور میں اس کے جواب میں اسے کچھ نہیں دے
سکی۔ وہ مجھ پہ ہر آن احسان کرتا گیا اور میں اس کا بدلہ بھی نہیں چکا پائی۔ شاید اُس کا ا

ل، اُس کی لافانی محبت میری ذات سے بھی بڑی ہے۔ کائنات سے بھی گہری ہے........
میں چاہ کر بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتی، اس کا بدلہ نہیں اُتار سکتی، اس کی تنہائیوں کے بدلے
اسے چاہت نہیں دے سکتی۔" وہ صوفے پہ بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ محبت اُس کے روم روم
سے محسوس کی جا سکتی تھی۔

ثناء اُٹھ کے اُس کے پاس آئی، اُس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی، اُس کی گود میں
رکھے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھ کے پیار سے بولی۔

"میں اُسے بھی جانتی ہوں، میں تمہیں بھی جانتی ہوں۔ میں نے اُس کی محبت اور
تڑپ بھی دیکھی ہے اور آج میں وہ تمہاری آنکھوں سے بھی دیکھ رہی ہوں۔ میں نے اُسے
بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ اپنے احساسات بے کم و کاست تم تک پہنچائے، اور تمہیں بھی یہی
کہوں گی۔ تحفے کا بدلہ تحفہ، پیار کا بدلہ پیار، نیکی کا بدلہ نیکی۔ ہمارے مذہب نے بھی ہمیں
یہی سکھایا ہے ناں؟ تو پھر وہ شخص جس نے ہر دھڑکن پہ تمہارا نام لکھا ہے، جس نے اپنی
پوری زندگی تمہیں دان دی ہے، کیا وہ تمہاری محبت اور تمہاری قربت کا اہل نہیں؟ کیا وہ
مستحق نہیں کہ اسے چاہت ملے، قربت اور ساتھ ملے؟"

ثناء کی بات پہ اُس کے آنسو اور شدت سے بہہ رہے تھے۔ کارنر ٹیبل پہ رکھی شمع بھی
آنسو بہا رہی تھی۔ اُس کی موم ٹیبل پہ پھیل کے کسی پرانے یونانی مجسمے کی عورت سے مشابہہ
لگ رہی تھی۔

"کیا وہ اپنی لازوال محبت کے بدلے میں، میری محبت قبول کر لے گا؟" آنسوؤں
سے تر بتر چہرے پہ اِک سوال بدستور تھا۔

"وہ آج بھی تمہارا منتظر ہے، فقط تمہارا۔" ثناء نے مسکرا کے اُس کے ہاتھ پہ بوسہ دیا
اور وہ اپنی ہمدرد اور غمگسار دوست کے سینے سے لپٹ کے دیر تک روتی رہی۔



احد نے آفس سے چھٹی کی ہوئی تھی اور ثناء نے حرمین کو بتا دیا تھا کہ وہ کہاں ہوگا۔
لہٰذا حرمین، حیدر آباد پہنچنے کے بعد سیدھی المنظر کے کنارے آ گئی تھی۔ سورج کے غروب
ہونے میں ابھی تھوڑا ہی وقت تھا۔ وہ دُور سے ہی احد کو پہچان گئی تھی۔ سرمئی رنگ کی شلوار
قمیص میں وہ احد ہی تھا اور اُس کے ہاتھ میں وہ رومال تھا، جو اُس کے زخموں کے اوپر
اپنے دوپٹے سے پھاڑ کے حرمین نے باندھا تھا۔

وہ کسی غیر محسوس طاقت سے چلتی ہوئی، پتھر پھلانگتی اُس کے برابر میں جا بیٹھی تھی۔ احد

نے اُس کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا۔ وہ تو اس رومال کی لازوال خوشبو میں کہیں کھ
حرمین نے اُس کے کندھے پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ اُس نے چونک کے اُسے دیکھا اور ا
آنکھیں اُس کے چہرے پہ ٹھہری گئیں۔

''آ.......آپ؟''

''میں آج تمہیں یہ بتانے یہاں آئی ہوں، کہ اکائی کی طاقت اور محبت کبھی
سکتیں۔ چاہے انہیں جتنا بھی روندا، مسلا اور کچلا جائے، ان سے جتنا بھی انکار کیا ج
تمہاری محبت جیت گئی ہے احد! تمہاری فتح ہوئی ہے۔'' حرمین نے اس کے ہاتھ پہ ا
رکھ دیا۔

''کیا واقعی؟'' وہ نم آنکھوں میں بے یقینی بھرے اُسے دیکھ رہا تھا۔ حرمین کی
آنکھوں میں بھی شفاف پانی جھلملایا۔ اُس نے احد کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اُس
کندھے پہ اپنا سر ٹکا دیا۔

''آج تمہیں تمہاری ہی وہ نظم سنانے کا دل کر رہا ہے۔ تم میری آخری محبت ہو۔
جس پہ تم نے مشاعرے میں ایوارڈ جیتا تھا۔'' حرمین نے دھیرے سے کہا۔

''وہ فقط نظم نہیں، میرے احساس تھے۔'' احد نے اُس کے ہاتھ پہ اپنی گرفت
کی۔

''اور یہ کیا ہے؟'' حرمین نے رومال لے کر اسے دیکھا۔ سوکھے خون کے دھبے ا
آج بھی موجود تھے۔

''یہ میری محبت کی چھوٹی سی دنیا ہے۔ المنظر کا کنارہ، میری محبت اور غروب
سورج۔'' احد نے ہوا کے سامنے اس رومال کو رکھا۔ تیز ہوا میں وہ پھڑ پھڑانے لگا او
کے ہاتھ سے چھوٹ کر پانی میں گر پڑا۔ احد اُسے پکڑنے کے لئے اُٹھا مگر حرمین نے
روک دیا۔

''اب اس کی ضرورت نہیں ہے.......اب میں آ گئی ہوں، کبھی نہ جانے کے
وہ مسکرائی۔

''تم تو کہیں گئی ہی نہیں تھیں۔ تم تو ہمیشہ میرے پاس تھیں۔ میری آنکھوں، م
دل اور میری روح میں، میری آخری محبت بن کر۔'' احد نے اُس کی پیشانی پہ مہر
ثبت کی۔

سفید رومال نیالے پانی میں تیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ خون کے دھبے ڈھل

تھے۔ چھوٹی چھوٹی لہریں اسے آگے بڑھا رہی تھیں۔ لازوال محبت کی نشانی اپنے کندھوں پہ
رکھے وہ کسی نئے ستارے کے دیس کو جا رہا تھا، جہاں وعدے ٹوٹتے نہیں، نغمے بکھرتے
نہیں اور محبتیں کبھی زوال نہیں پاتیں۔

بہت دیر تک وہ دونوں اُس ننھے رومال کو لہروں پر تیرتے ہوئے اپنے سے دُور، بہت
دُور جاتا دیکھتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ پانی کی سطح پر سے معدوم ہو گیا۔ المنظر کی سطح پر ایک اور
لازوال محبت نے زندگی پائی تھی۔ لہروں نے اپنے سینے پہ اِک اور پریم کتھا تحریر کی تھی۔



دُھوپ کا رنگ گلابی

رات گئے ریڈیو سے پرانے فلمی گانے بج رہے تھے۔

ماہا محویت سے گانے بھی سن رہی تھی اور ساتھ ساتھ تکیے کے غلاف پر رنگ ب
دھاگے سے کڑھائی بھی کر رہی تھی۔ یوں تو اُس کے کئی شوق تھے، لیکن گھر کی مصروفیت
وقت کہاں ہوتا تھا اُس کے پاس کسی مشغلے کے لئے۔ صبح کے برتن، ناشتے کی تیاری،
کا کھانا، شام کی چائے، ہفتہ وار صفائی، کپڑے دھونا، کسی کی کوئی پسند، تو کسی کا کوئی آ
اور وہ چابی کی گڑیا کی مانند اِدھر اُدھر بھاگتی پھرتی۔ بس اِک رات کا یہی وقت تو
اُسے اپنے لئے۔ پھر ریڈیو پر پرانے گانے سننا اور ساتھ ساتھ کوئی کام کرنا اُسے
پسند تھا۔ یہ غلاف بھی اُس نے ہفتہ پہلے اُٹھایا تھا۔ اس سے پہلے عمارہ کی قمیض کاڑھ
ابھی اس جیسا ایک اور غلاف اس کا منتظر تھا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس کی حد درجہ محویت اور ریڈیو کی اُونچی آو
باوجود اُس نے وہ ہلکی سی دستک سن لی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دروازے پر عاشر ہو گا۔ عا
اُس کا کزن تھا۔ چاچی سکینہ اور چاچا انور کا بیٹا، اُس کی بہترین دوست عمارہ کا بھائی
کے دل کی دھڑکن، اُس کی آنکھوں کا قرار عاشر۔ وہ عاشر، جس سے وہ نہ جانے کب
محبت کرنے لگی تھی۔ بچپن ساتھ ساتھ گزارتے دونوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم ر
اور دونوں نہ جانے کب ان راستوں میں بھٹک پڑے تھے، جنہیں محبت کہتے ہیں
صرف یہ تھا کہ ماہا کو عاشر سے محبت تھی اور عاشر کو کسی اور سے۔ وہ کون تھی؟ اس سے
خبر تھی اور اس بے خبری کے پیچھے عاشر تھا، جس نے کہا تھا کہ وہ ایک دن خود ماہا کو ا
کو اس کے بارے میں بتائے گا۔ لیکن ماہا کو اِک انجانا سا یقین تھا کہ وہ ''ہستی'' خو
ہے۔ کیونکہ بقول عاشر، وہ جس سے محبت کرتا ہے، وہ ہر لمحہ اُس کی آنکھوں کے سام

ہے، اور وہ ماہا کے سوا اور کون ہو سکتی تھی؟ گھر میں تین ہی تو لڑکیاں تھیں۔ ماہا، عمارہ اور ماہا
کی چھوٹی بہن ردا۔ لیکن ردا بہت ہی کم سن تھی۔ پندرہ سولہ سال کی ایک شریر اور دیوانی سی
لڑکی، جس کا اوڑھنا بچھونا خواب تھے۔ جو ہر وقت منتظر رہتی تھی، خوابوں کے سوداگر کی،
جو کہ مشکی گھوڑے پہ سوار اُسے لینے کے لئے ایک دن ضرور آئے گا۔ عاشر اور ردا میں
سالوں کا فاصلہ تھا۔ لہٰذا ردا سے ماہا کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ اور پھر سارے ثبوت بھی تو اُسی
کے حق میں تھے۔ اس لئے وہ خوش تھی کہ وہ خاص ہستی اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

وہ اُٹھی، اپنا کام چھوڑا اور دروازہ کھولنے کے لئے صحن میں آئی۔ گرمیوں کی مختصر
راتیں تھیں، آسمان جگمگ کرتے ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ آنگن میں پیپل کا درخت ساکت
و جامد کھڑا تھا۔ لگتا تھا، رات کے اس پہر کسی گہری نیند کے جھونکے میں ہو۔ وہ چلتی چلتی
دروازے تک آئی اور پوچھا۔

''کون؟''

''ماہا! میں ہوں، عاشر۔'' عاشر نے باہر سے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

ماہا نے دروازہ کھولا اور وہ اندر آ گیا۔

''ابا تو نہیں جاگ رہے؟'' اُس نے حسب معمول گھر آتے ہی پہلا سوال یہی کیا
تھا۔ ماہا مسکرا دی۔

''پہلے یہ بتاؤ، اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہو؟'' ماہا بولی۔

''سوال کے جواب میں سوال نہیں کرتے۔ لیکن پھر بھی تمہارے اطمینان کے لئے بتا
دیتا ہوں کہ دوستوں کے ساتھ کھانا کھانے گیا تھا۔ اب بتا دو، ابا سوئے ہوئے ہیں؟'' وہ عجلت
میں بولا۔ ماہا نے گردن اثبات میں ہلا دی۔

''کھانا تو نہیں کھاؤ گے۔'' وہ اُس کے آگے آگے چلنے لگی۔

''نہیں...... ہاں، اگر چائے بنا دو تو احسان ہو گا تمہارا۔'' اُس کی جادوئی مسکراہٹ
اُس کے چہرے پہ سجی تھی۔

''ابھی لاتی ہوں۔'' وہ بھی مسکرا کر کچن کی جانب بڑھی اور چائے کا پانی رکھ دیا۔ فریج
سے دودھ نکالنے کے لئے گئی تو اپنے کمرے کا دروازہ کھلا پایا۔ نیچے فلور کشن پر عاشر کو بیٹھے
پایا۔ اُس نے عاشر کے مخصوص مگ میں چائے ڈالی، ساتھ میں بادام کے حلوے کو کٹوری
میں ڈالا اور دونوں چیزیں ٹرے میں سجا کر اپنے کمرے میں آئی۔

''اس وقت تمہیں اپنے کمرے میں ہونا چاہئے عاشر!'' وہ ٹرے اُس کی جانب

بڑھاتے بولی۔

"ڈیئر کزن! ایسا دلچسپ ماحول میرے کمرے میں کہاں۔ یہ نفاست سے سجا کمرہ، مدھم روشنی، گلاب کے تازہ پھولوں کی مہک، جن کی پتیوں کو روزانہ تم پانی میں ڈال کر کمرہ مہکاتی ہو، یہ نرم سے فلور کشن اور اُوپر سے مزیدار چائے کے ہمراہ بادام کا حلوہ۔" بہت تعریفی انداز میں بولا۔ "سچ ماہا! تم نے اپنی زندگی کو کتنا مختلف، کتنا دلچسپ بنایا ہے۔ کپڑوں کے ڈھیر پر استری کرتی ہو لیکن ساتھ میں اتنے خوب صورت گیت لگا لیتی ہو۔ کچن کی گرمی میں کھڑی پورے گھر کا کھانا بناتی ہو، لیکن ساتھ ساتھ خواتین کا پروگرام سنتی ہو۔ سالن اور روٹی پکانے کے درمیانی وقفے میں اپنی بی اے کے کورس کی کتاب پڑھتی ہو۔ دوپہر کو ایک گھنٹہ سونے کے بعد دوبارہ مشین کی طرح کام پر لگ جاتی ہو۔ رات کے اس پہر اتنے پُرسکون ماحول میں اپنا یہ کام کرتی ہو۔ بابا کے پرہیز کے کھانے، ان کی اسپیشل چائے، ردا کی سویٹ ڈشز، تائی امی کی سبزیاں۔ تم ہر کسی کا خیال رکھ کے تھکتی نہیں ہو ماہا؟" وہ عجیب دوستانہ لہجے میں بولا اور ماہا مسکرا دی تھی۔

"عاشر! میں کسی کی قید میں نہیں ہوں اور نہ مجھ پر کوئی ظلم کر کے یہ کام مجھ سے کرایا جاتا ہے۔ میں اپنی مرضی، اپنی خوشی سے یہ کام کرتی ہوں اور مجھ پر اس طرح رحم کھانے کی ضرورت نہیں۔ میرے جیسی بے غرض ملازمہ کوئی ڈھونڈ کے تو دکھاؤ تم لوگ۔"

"خبردار، جو خود کو ملازمہ کہا تو۔ تم بہت اسپیشل جگہ رکھتی ہو، سمجھیں؟" پتہ نہیں کس جذبے کے تحت عاشر نے یہ بات کہی تھی۔ مگر ماہا نے اسے بہت گہرائی سے لیا تھا۔

"اچھا، اب تم جاؤ اپنے کمرے میں۔" وہ فوراً بولی۔ عاشر نے چائے کا کپ خالی کر کے سائیڈ میں رکھا اور چلا گیا اور ماہا دیر تک اس خالی کپ کو ہاتھوں میں اُٹھائے اُس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرتی رہی۔



چھٹی کا دن تھا۔ گھر کے تقریباً سبھی افراد سو رہے تھے، سوائے سلمیٰ بیگم اور ماہا کے۔ سلمیٰ بیگم حسب معمول نماز پڑھ کر تلاوتِ قرآن میں مصروف تھیں اور ماہا ناشتے کی تیاری کر رہی تھی۔

"امی! ناشتے کے لئے کچھ چیزیں منگوانی ہیں۔ عاشر رات دیر سے آیا تھا، وہ تو دیر سے اُٹھے گا۔ کیا کروں؟"

سلمیٰ بیگم نے سنہری عینک کے پیچھے سے اُسے دیکھا۔

"ارے تو ردا کو اُٹھا دو۔ یہ بھی بھلا کوئی مسئلہ ہے؟" امی نے کہا اور اُس نے شکر ادا کیا کہ امی نے اُسے خود چلے جانے کو نہیں کہا۔ وہ فوراً ردا کے سر پہ پہنچ گئی، جو اپنے بستر پر بے ڈھنگی سے لیٹی تھی۔ تکیے کے اوپر فزکس کی کھلی کتاب اُلٹی پڑی تھی اور ردا کا سر تکیے سے نیچے تھا۔

"ردا! اُٹھو........ اُٹھ جاؤ۔ کچھ منگوانا ہے۔" وہ ردا کے کٹے ہوئے سلکی بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔

"چھوڑو ناں باجی! آج سنڈے ہے۔" وہ نیند سے پُر لہجے میں بولی۔

"واپس آ کر سو جانا جانو!" ماہا نے فزکس کی کتاب اُٹھائی اور اُس کے نیچے سے ایک موٹا ڈائجسٹ برآمد ہوا۔ ماہا مسکرا دی۔

"اُٹھو ردا! ورنہ ابھی امی کو بتاتی ہوں کہ تم کورس کی کتاب میں ڈائجسٹ چھپا کر پڑھتی ہو۔" ماہا کے یہ الفاظ کہنے کی دیر تھی کہ ردا جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی اور شکایتی نظروں سے بہن کو دیکھا۔

"نہیں بتائیں گی نا باجی!" وہ بولی اور ماہا مسکرا دی۔

"چلو، مجھے ایک ڈبل روٹی کا پیکٹ، چھ انڈے اور ایک کلو آلو لا دو۔ سب کے الگ الگ ناشتے بنتے ہیں، دیر لگے گی۔" اُس کے کہنے پر ردا فوراً اُٹھی، باتھ روم میں جا کر اپنا منہ دھویا اور دوپٹہ اُٹھا کے گلے میں ڈالا۔

"ردا! دوپٹہ سر پہ اوڑھو۔" ماہا کے کہنے پر اُس نے منہ بنا کر اپنا سر دوپٹے سے ڈھانپ لیا اور جانے لگی۔

"یاد ہے ناں، کیا لانا ہے؟" ماہا عقب سے چیخی تھی۔

"ہاں ہاں، یاد ہے۔ ایک پیکٹ آلو، چھ عدد ڈبل روٹیاں اور ایک کلو انڈے۔" وہ غصے میں اُلٹا سیدھا بول گئی۔ ماہا نے بھی اطمینان سے گردن ہلائی، پھر دوبارہ سوچ کے مسکرا دی۔ وہ اسے بھی ردا کی شرارت ہی سمجھی تھی، لیکن ردا تو غصے میں تھی۔

"یہ بھلا کوئی عمر ہے دوپٹہ اوڑھنے کی، ماسیوں کی طرح؟ بالوں کی اتنی اچھی کٹنگ کا خراب ہو جاتا تھا اور دُور سے لگتا تھا کہ کوئی تیس سالہ عورت چلی آ رہی ہو۔" وہ بڑبڑائی گلی میں آتے ہی دوپٹہ اُتارا اور گلے میں ڈال لیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ امجد جنرل اسٹور کے سامنے تھی۔ اس جنرل اسٹور کے باہر ہی چاچا کی سبزی کی دُکان تھی، جس کی وجہ سے وہ جنرل اسٹور کے اوباش لڑکے امجد

کے ذومعنی فقروں سے بچی رہتی تھی۔ فاضل چاچا ایک انتہائی شریف، باریش انسان تھے ردا کو بیٹیوں کی طرح سمجھتے تھے۔

"ایک بڑی ڈبل روٹی اور چھ انڈے دے دو۔" وہ دُکان کے باہر کھڑی ہو بولی۔ امجد اپنے چہرے پہ ہر طرح کی خباثت سجا کے مسکرایا، انڈے اور ڈبل روٹی کا اُٹھا کر اُس نے پیسے اُس کو دیئے اور امجد نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح ردا کے ہاتھ کو سکے، لیکن وہ بھی اُس کی ہر چالا کی سمجھتی تھی، اس لئے فوراً ہاتھ پیچھے کر لیا۔ فاضل چاچا آلو لئے اور امجد کو غصے سے گھورتی ہوئی بولی۔

"فاضل چاچا! اس ساتھ والے دکاندار کو بتا دینا کہ آئندہ اگر کوئی بدتمیزی کر کوشش کی تو عاشر بھائی سے ایسا پٹواؤں گی کہ زندگی بھر نہیں بھولے گا۔"

اُس کی بلند آواز امجد نے سن لی اور دوسری طرف رُخ پھیر لیا۔ جبکہ فاضل چاچا اُسے غصے سے گھورا۔

وہ اپنا سامان پکڑے سڑک کے بیچوں بیچ بڑی شان سے چل رہی تھی کہ اچانک گاڑی کے بریک لگنے سے چرچرانے کی آواز پیدا ہوئی۔ اُس نے مڑ کے دیکھا۔ ماڈل کی انتہائی خوب صورت گاڑی کھڑی تھی، جس کے اندر ایک خوبرو نوجوان ڈرائ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نوجوان نے شیشہ کھول کر اپنی گردن باہر نکالی۔

"محترمہ! سڑک کے بیچ سے ذرا ہٹ جایئے۔ گاڑی لگ جاتی تو سزا مجھے ہی پھانسی دینے والے یہ تھوڑی دیکھتے ہیں کہ غلطی مرنے والے کی ہوتی ہے یا مارنے کی۔" اُس کی آواز سن کر ردا کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ بالکل اس ریڈیو کمپیئر جیسی آوا جسے وہ دیوانوں کی حد تک پسند کرتی تھی۔ اُس کی باتیں، اُس کی نظمیں، اُس کے جملے ڈائری میں لکھتی تھی۔ وہ اُس سے پیار کرتی تھی۔ اعزاز حسن کی آواز اُس کی جان تھی کی رُوح کی صدا تھی۔ روزانہ مقامی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والا اس کا پر باقاعدگی سے سنتی تھی۔ اس شخص اور اعزاز حسن کی آواز کی مماثلت حیران کن تھی۔ پہلی مرتبہ اُسے احساس ہوا کہ چہروں کی ہی نہیں، آوازوں کی بھی ایک صورت ہوتی اور جس طرح کچھ لوگوں کے چہرے ایک دوسرے سے ملتے ہیں، اسی طرح آواز ملتی جلتی ہو سکتی ہیں۔

وہ گاڑی سے اُتر آیا تھا اور اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن قریب آتے ہی جیسے غصہ اُڑ گیا تھا۔ شاید اُس کی موہنی صورت کے سحر کا نتیجہ تھا۔ وہ تھی بھی کسی ایسی کلی کی

مہکن، باغ میں علی الصبح کسی ڈالی پہ تنہا جھومتی ہے۔ اپنے حُسن کے جادو سے بے خبر۔ اُس کے تیکھے نقش، سندر ماتھا، کٹے ہوئے بال گالوں پہ مسکراتے۔ وہ اُسے دیکھتا رہ گیا۔

"کہیں تو میں گھر چھوڑ دوں؟" اُس نے پیش کش کی۔

ردا کے دل کی دھڑکنوں میں اتھل پتھل مچ گئی۔

"نہیں شکریہ! میرا گھر پاس ہی ہے۔ چلی جاؤں گی۔" اُس نے خود کو سنبھال کر کہا اور تیزی سے گھر کے اندر چلی گئی۔ باہر صحن میں رکھی چارپائی پہ چیزیں رکھیں اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔



"آواز کی دنیا کے دوستوں کو اعزاز حسن کا پیار بھرا سلام۔"

اُس کی آواز اُبھرتے ہی ردا کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور اُسے وہ کل والا لڑکا یاد آ گیا، جس کی آواز ہو بہو اعزاز جیسی تھی۔ اُس نے تصور اور تخیل کی مدد سے اعزاز حسن کو وہ چہرہ، وہ قالب دے دیا تھا۔

"ہاں تو سامعین! بات ہو رہی تھی چہروں کی۔ کچھ چہرے کتنے جادوگر ہوتے ہیں۔ ہنستے ہیں تو جادو کرتے ہیں، روتے ہیں تو جادو کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ خاموش ہوتے ہیں، تب بھی جادو کرتے ہیں۔ ایسے ہی چہرے تخیلات کی دنیا آباد کرتے ہیں، گلوں میں رنگ بھرتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی ان چہروں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے؟" پورے کمرے میں اعزاز حسن کی جادوئی آواز گونج رہی تھی۔

"دوستو! ان چہروں کو ڈھونڈنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ چہرے آپ ہی آپ ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اب جیسے میں ایک چھوٹا سا واقعہ آپ کے گوش گزار کرنا چاہوں گا۔ تو جناب! بات اتنی سی ہے کہ کل میں اپنی نئی گاڑی میں، اپنی دھن میں مگن گھر کی طرف رواں دواں تھا تو راستے میں میری ملاقات ایک ایسے ہی چہرے سے ہوئی۔ ملاقات تو نہ کہیۓ اسے، ٹکر کہیۓ تو ٹھیک ہو گا۔ تو ہم غصے میں بھرپور گاڑی سے اترے اُس دیوانی لڑکی کو ڈانٹنے۔ لیکن پتہ نہیں، اُس کے سادہ سے، معصوم سے چہرے پہ ایسا کیا تھا کہ ہم کچھ نہ کہہ سکے۔ ہم چپ چاپ اُس کی شکل دیکھتے رہ گئے۔"

اعزاز حسن کے بتائے ہوئے اس واقعے پر وہ چونک اُٹھی۔ تو وہ اُس کا گمان نہ تھا۔ وہ واقعی اعزاز حسن تھا۔ اور جس جادوئی چہرے کا وہ ذکر کر رہا تھا، وہ چہرہ اس کا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔ کھلکھلا دی تھی۔

وہ پھر اپنی سحر انگیز آواز کا جادو ہر سُو بکھیرنے لگا۔

"تو جناب! اسی طرح کے چہروں کے لئے پیش ہے میری یہ نئی نظم۔

کیا تم میرے خوابوں جیسی ہو
تم کیسی ہو؟
رنگ اُڑاتی، پھول سجاتی
جگمگ کرتی، ہنستی گاتی
آوازوں کے چہرے بنتی
چہروں کی آوازیں بنتی
میرے تخیل کے صحرا میں بہنے والے
اِک جھرنے کے جیسی ہو
تم کیسی ہو؟
کل میں نے جس کو دیکھا
وہ چنچل البیلی لڑکی
اُس کی آنکھوں، اُس کے چہرے
اُس کی باتوں جیسی ہو
تم کیسی ہو؟

اُسے یقین سا ہو گیا کہ اعزاز حسن نے وہ نظم اسی کے لئے کہی ہے۔ وہ جھوم اُٹھی تھی پروگرام ختم ہوتے ہی وہ اُٹھی۔ آئینے کے سامنے آئی اور اس کے سامنے آتے ہی اس آئینے میں اس کا سولہواں سال آ کے بیٹھ گیا۔ جس سے وہ چھپ چھپ کر ملا کرتی تھی۔ یہ سولہواں سال ہی تو زندگی کی ہموار سڑک میں نشیب و فراز لایا تھا۔ اسی نے تو خوابوں سے آشنائی دی تھی۔ پلکوں کی جھالر پہ خواب ٹانکے تھے۔

وہ میز پہ رکھی اپنے میک اپ کی اشیاء میں سے چیزیں اُٹھا اُٹھا کر اپنا چہرہ سجانے لگی اعزاز حسن کی نظم کی بازگشت اُس کی سماعتوں میں گونج رہی تھی۔

"ماما! ردا کہاں ہے؟ اس کا رزلٹ آ گیا ہے۔ وہ فرسٹ ایئر میں پاس ہو گئی ہے" عاشر ہاتھ میں اخبار لہراتا اندر آیا۔ ماما خوشی سے مسکرا دی۔

"اپنے کمرے میں ہے۔ اعزاز حسن کا پروگرام آئے تو اُسے کچھ یاد رہتا ہے بھلا لاؤ، میں اُسے دکھاتی ہوں۔" ماما اُس کے کمرے کی جانب بڑھنے لگی۔

"رُکو ماما! اُسے یہ خوشخبری میں دوں گا۔" خوشی سے چھلانگیں لگاتا عاشر اخبار اُٹھائے ردا کے کمرے کی جانب بڑھا اور ماما حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر اپنے ذہن سے ہر اِس خدشے کو جھٹک کے کام میں مصروف ہو گئی۔ عاشر نے جیسے ہی ردا کے کمرے کا دروازہ کھولا تو حیران رہ گیا۔

ڈریسنگ ٹیبل کے چھوٹے سے شیشے میں اِک چاند جھلملا رہا تھا۔ دودھیا رنگت، سرخی لگے ہونٹ، آئی شیڈ اور کاجل سے سجی ساحر آنکھیں، کانوں میں لٹکتے جھمکے اور ماتھے پہ سجا ٹیکا چاند، اور اس چاند کے اوپر سبز چنری۔ یہ ردا کا روپ تو نہ تھا۔ یہ تو کسی دُلہن کا رُوپ تھا۔ کیا وہ جوان ہو کے اتنی خوب صورت، اتنی سندر ہو گئی تھی؟ یہ تو کسی چاند نگر کی اُجلی اپسرا کی طرح تھی۔ آکاش پر چمکتے کسی ستارے کی مانند۔

ردا نے شیشے میں عاشر کو دیکھا تو ٹھٹک گئی اور چنری اُتار کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور عاشر بھی اپنے آپ پر قابو پاتا اندر کمرے میں اُسے خبر سنانے چلا آیا تھا۔



"ردا!..... او ردا! ذرا میری بات تو سننا۔" دیوار پر کھڑی نبیلہ، ردا کو آوازیں دیئے جا رہی تھی۔

"ابھی تو آئی ہو تم دونوں کالج سے۔ کیا بات ہے؟" ماما نے کچن سے منہ نکال کر نبیلہ کو گھورا۔ نبیلہ، ردا کی بچپن کی سہیلی تھی اور پڑوسن بھی۔ دونوں نے اسکول ساتھ پڑھا اور اب کالج میں بھی دونوں ہم قدم تھیں۔

"ماما جی! بلا دیں نا اُسے۔ ضروری کام ہے۔ وہ..... وہ کچھ نوٹس لینے تھے اُس سے۔" نبیلہ نے بہانہ بنانا چاہا۔

"اچھا ٹھہرو، میں بلا دیتی ہوں۔" ماما مسکرا کر ردا کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اور کچھ ہی دیر میں ردا ٹہلتی مٹکتی باہر آئی۔

"ردا! تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ ذرا گھر آ جاؤ۔" نبیلہ نے اُسے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

"کیا بات کرنی ہے؟" وہ ادائے بے نیازی سے بولی۔

"ارے تم آؤ تو بتاؤں۔" وہ چیخی۔

"اتنی دھوپ میں؟ میں ایک آدھا گھنٹہ سو لوں، پھر آؤں گی۔" ردا نے منع کیا۔ نبیلہ مایوس ہو کر دیوار سے اُتر گئی۔ ردا کو اپنی گہری دوست کی ناراضگی کا خیال آیا تو نیند کا ارادہ

ترک کر کے اس کے گھر چلی آئی۔

"اب بولو، کیا ضروری بات کرنی تھی؟" ردا اُس کے کمرے میں آ کے کشن اُ
ریلیکس ہو کے بیٹھ گئی۔

نبیلہ فوراً اُٹھی، دروازہ بند کیا، بیڈ کے ساتھ رکھے ٹیبل کی دراز سے ایک تہہ کیا ہوا
نکالا اور اُس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" ردا نے وہ کاغذ تھاما۔

"پڑھو اسے۔" نبیلہ کے چہرے پر شرم کی سرخی آ کے ٹھہر گئی۔ ردا نے وہ کاغذ
اس پر چند سطروں کی ایک تحریر تھی۔

"میری پیاری نبیلہ!

تمہیں دیکھ کر جی رہا تھا، سوچتا تھا میری محبت ہمیشہ یک طرفہ ہی رہے
گی۔ مگر اس دن تم مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔ سچ پوچھو دل کھل اُٹھا۔ اسی لئے خط
لکھنے کی ہمت کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ اس خط کا جواب دے کر میری محبت کو
اپناؤ گی۔"

تمہارا امجد

خط پڑھ کر ردا کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور نبیلہ مسلسل مسکرائے اور شرمائے جا رہی

"یہ امجد کون ہے؟" ردا نے پوچھا۔

"ارے وہی تو، باہر جنرل اسٹور والا۔ اُسی نے تو دیا ہے یہ خط۔" نبیلہ نے شرما

"کیا؟...... اُس کی اتنی ہمت ہو گئی کہ شریف لڑکیوں کو لو لیٹر بھی لکھنے لگ گیا
ہے، اُسے عاشر بھائی سے پٹوانا ہی پڑے گا۔" ردا نے غصے میں کاغذ تہہ کر دیا۔

"ارے نہیں، نہیں۔ کسی کو مت بتانا۔ اصل میں......" نبیلہ کچھ کہتے کہتے رُک

"اصل میں کیا؟...... بتاؤ۔ کہیں تم بھی اُس سے محبت تو نہیں کرنے لگی؟"
روانی سے کہا اور نبیلہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"کیا نبیلہ! تم اُس اُلو سے، اُس لفنگے سے، اُس...... اُس......" ردا
پھنکاری۔

"کچھ مت کہو اُسے ردا! اچھا لگتا ہے وہ مجھے۔" نبیلہ نے اُسے ٹوکا۔

"پاگل ہو گئی ہو تم؟...... گولی مار دیں گے تمہارے ابا اُسے بھی اور تم کو بھی۔
اور محبت کا کوئی معیار، کوئی اسٹینڈرڈ تو ہوتا ہے۔ کہاں نبیلہ اور کہاں وہ کریانے والا

لہجے میں نفرت در آئی تھی۔

"چپ ہو جاؤ ردا! محبت کا کوئی معیار، کوئی اسٹینڈرڈ نہیں ہوتا۔ محبت کرنے کے لئے
ی ڈگری، کسی ایکسپیرئینس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ محبت تو بس ہو جاتی ہے۔ بنا پوچھے، بنا
ئے۔ اُسے میں پسند کر چکی ہوں، مجھے وہ پسند ہے۔ یہی کافی ہے۔ کریانے والا ہوا تو کیا
ا۔ بزنس ہے اُس کا، نوکری کرنے والوں سے زیادہ کماتا ہے وہ۔" نبیلہ نے فخریہ انداز
ں کہا۔

یہ تو وہ بھی جانتی تھی کہ محبت بہت چپکے سے، بہت دھیرے سے دل کے دروازے پر
تک دیتی ہے۔ بنا پوچھے کہ مکین کون ہے، مکان کس کا ہے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے
ایک اعزاز حسن کا چہرہ لہرایا اور اُس کی آواز، اُس کی نظمیں۔ میرے تخیل کے صحرا میں
والے، اِک جھرنے جیسی ہو۔ تم کیسی ہو...... وہ مسکرا دی۔ اب وہ نبیلہ کو کچھ کہنا نہ
اتی تھی۔ کچھ بھی سمجھانا نہ چاہتی تھی۔ اُسے کسی بات پہ قائل کرنے، کسی بات سے روکنے
کوئی سکت نہ تھی اس میں۔ اور پھر یہ عمر تھی بھی بھٹکنے کی۔ لڑکھڑانے کی۔ اور اگر نبیلہ لڑکھڑا
گی تو کیا غلط ہوا تھا؟ اور پھر جس سے نبیلہ محبت کرتی تھی، اسے اس کا کیا لینا دینا تھا۔

"ردا! میرا ایک کام تو کرو۔ میری طرف سے اُسے ایک خط تو لکھ دو۔ میری رائٹنگ
اری طرح اچھی کہاں۔ مجھے تو ایک لکیر کے اوپر حروف لکھنے آتے ہی نہیں۔ پلیز!" نبیلہ
ے التجا کی۔

"مرواؤ گی مجھے۔ خود لکھو۔ اور مجھے کیا پتہ، کس طرح لکھتے ہیں یہ چیزیں۔" وہ صاف
مکر گئی۔

"دیکھو! میری پیاری دوست ہو ناں۔ پلیز!" اُس کی التجاؤں سے وہ بھی مان گئی اور
کاغذ قلم اُٹھا کر نبیلہ کی طرف سے لکھنے لگی۔

"اچھے سے امجد!

آپ کا خط ملا، مسرت کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ یقیناً آپ کی
تحریر بہت اچھی ہے۔ میں لفظوں میں کیا اقرار کروں کہ محبت بھلا لفظوں کی
محتاج ہوتی ہے کیا...... آپ نے جو رشتہ جوڑا ہے، اسے میں دل سے قبول
کرتی ہوں۔

صرف آپ کی......"

نبیلہ نے جو کہا، ردا نے لکھ دیا۔ ہاں، اُس نے اپنا نام لکھنے سے منع کیا۔ اس کاغذ کو تہہ

کر کے نبیلہ نے اپنے کالج بیگ میں رکھ دیا۔

اگلی صبح جب وہ دونوں کالج روانہ ہو رہی تھیں تو نبیلہ نے دُکان کے سامنے رُک
کو کہا کہ وہ فاضل چچا سے نظر بچا کر امجد کو خط دے آئے۔ ردا کے منع کرنے کے با
نہ مانی اور ضد کرتی رہی۔ بالآخر وہ مجبور ہو کر جنرل اسٹور کے اندر گئی اور امجد کو نبی
پہنچا دیا۔ امجد اور نبیلہ کے مابین ذومعنی مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا اور پھر وہ دونوں اپنی کا
کی طرف بڑھ گئیں۔



"عمارہ! دیکھو، یہ کبوتر مجھے کچھ کمزور سا دکھائی دے رہا ہے۔ کہیں اس نے کھا
تو نہیں کر دیا؟"

سکینہ چچی کو پرندوں سے پیار تھا، اسی لئے وہ کبوتر اور طوطے گھر میں رکھتی تھیں
ان سبھی کبوتروں، رنگ برنگے طوطوں کا گھر کے باقی افراد کی طرح خیال رکھتی تھی۔
پنجرہ صحن کے پرلی طرف تھا۔ کشادہ سا۔

"مجھے کیا پتہ؟........ اس گھر کی فوڈ منسٹر تم ہو ماہا! کس کو کیا کھانا ہے، کب کھ
کتنی مقدار میں کھانا ہے، یہ تمہارا سر درد ہے۔ اب اس کبوتر بے چارے نے بھی کم
کھانے کی اتنی فکر نہ کی ہوگی، جتنی تمہیں اس کی ہے۔" عمارہ اپنے لمبے بالوں
بناتے ہوئے بولی۔ ماہا اور عمارہ کی دوستی مثالی تھی۔ دُکھ سکھ، خوشی غم، دونوں کے
تھے۔ وہ دونوں سلجھی ہوئی سمجھ دار لڑکیاں تھیں۔ عمارہ اس سے عمر میں ایک سال چھوٹی
ذہنوں کے زاویوں کی میچنگ نے ان دونوں کو دوست بنا دیا تھا۔

"ہر وقت میری ٹانگ کھینچنا۔ عمارہ! تمہیں سکون ملتا ہے، میرا مذاق اُڑانے سے
ناراض ہوگئی۔

"نہیں نہیں۔ تم تو ناراض ہوگئی۔ میں تو اپنی پیاری سی دوست کی اس خوبی کی
کر رہی تھی کہ وہ ہر کسی کا کتنے عمدہ طریقے سے خیال رکھتی ہے۔" عمارہ اُس کے قری
اور پیار سے بولی۔

"شام کی چائے کا وقت ہو رہا ہے۔ جاؤ دیکھ کر آؤ۔ عاشر، ردا، چچی سب جاگ
ہیں۔ میں جا کے چائے کی تیاری کرتی ہوں۔" کبوتروں کے کھانے سے فارغ
چائے کا وقت آ گیا۔ وہ چائے چڑھا کر عصر کی نماز ادا کرنے چلی گئی۔ واپس آئی تو
کچن میں دیکھا جو چائے میں پوا چلا رہی تھی۔

"ارے........ تم نے تو بنا بھی لی چائے۔ میرا انتظار بھی نہیں کیا۔" وہ دوپٹہ کھولتے
ئے بولی۔

"میں سوچتی ہوں ماہا! کہ تم نے اس گھر کے لوگوں کو اپنے ذائقوں، اپنی خدمت
ر تیز رفتاری کا اتنا عادی بنا دیا ہے کہ مجھے نہیں لگتا کہ یہ تمہارے جانے کے بعد تمہیں
ول پائیں گے۔ میرا مطلب، جب تم پیا گھر جاؤ گی تو ان کا کیا بنے گا؟" عمارہ نے پوا
را کے کہا۔

"ارے جائیں یہاں سے میرے دشمن۔ میں نہیں جاتی کہیں۔ زیادہ ہوا تو پپا کو ادھر
شفٹ کرالیں گے۔" وہ دل کے نازک جذبوں کے زیر اثر بولی اور کچن کی درازوں سے
کپ نکال کر ٹرے میں سجانے لگی۔

"لو بھئی، چائے تو میں نے بنالی۔ اب سرو تمہیں کرنی ہے۔ میں ذرا بسکٹ کے پیکٹ
لے آؤں، میری الماری میں رکھے ہیں۔" عمارہ نے پوا اُسے تھمایا اور جانے لگی۔

"ارے ہاں ماہا! میں کہنا بھول گئی۔ عاشر بھائی باتھ روم میں ہے۔ اُنہوں نے شرٹ
نکال کر دی ہے۔ پلیز! اس پر استری پھیر دو۔ میرا بالکل موڈ نہیں ہے۔ پریس نہ ہوئی تو مار
ڈالیں گے۔ بلکہ ایسا کرو، چائے میں نکالتی ہوں، تم فٹافٹ اسے استری کر آؤ۔" عمارہ
واپس کچن میں آئی اور چائے کپوں میں ڈالنے لگی۔ اور اُس نے بنا کچھ کہے، عاشر کے
کمرے کا رُخ کیا۔ کوریڈور نما برآمدے میں عاشر کا کمرہ سب سے آخری تھا۔ اس سے
پہلے کے تین کمرے چچا، چچی، عمارہ کے اور ایک کمرہ بطور ڈرائنگ روم استعمال ہوتا تھا۔
یوں تو گھر ایک تھا مگر پورشن دو تھے۔ پورے گھر کی ڈیزائننگ ایک طرح کی تھی۔ چار بیڈ
روم اِدھر تھے تو چار اُدھر تھے۔ صحن اور باہر کا دروازہ مشترکہ تھا۔ گھر کے بھی لوگ پیار محبت
سے رہتے تھے۔

ماہا اور ردا کا ایک ہی بھائی تھا، عمیر۔ جو کہ ایبٹ آباد میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھا۔ ماہا
سے چھوٹا اور ردا سے بڑا تھا۔

ماہا، عاشر کے کمرے میں آئی تو اے سی کی ٹھنڈک نے راحت کا احساس دلایا اور اسے
در و دیوار میں عاشر کی مخصوص مہک کا احساس ہوا۔ وہ جہاں جاتا، یہ خوشبو چھوڑ جاتا۔ یہ اُس
کے سراپے کی خوشبو تھی۔ بے ترتیب بیڈ پہ ایک سرخ رنگ کی چیک شرٹ پڑی تھی۔ اندر
باتھ روم میں شاور چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ماہا نے فوراً شرٹ اُٹھائی اور استری کرنے لگی۔
استری پہلے سے گرم تھی۔ شاید عاشر نے پہلے خود پریس کرنے کا ارادہ کیا ہو، پھر کام چھوڑ

عمارہ کو دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا ہو۔

اس نے کچھ ہی دیر میں شرٹ پریس کی اور ہینگر میں ٹانگ دی۔ بیڈ کی چادر د
کے لحاف لپیٹ دیا۔ کونے میں وارڈروب کے پاس عاشر نے غالباً جوتے نکا
تھے۔ یہ ایزی چپل وہ شام کو دوستوں کے پاس جانے سے قبل پہنتا تھا۔ وہ اے
کرنے کی غرض سے اس کی طرف گئی اور کپڑا اٹھا کر اسے چمکانے لگی۔ اچانک با
دروازہ کھلا اور عاشر باہر آ گیا۔

''اچھا، تو یہ آپ ہیں۔ میں بھی کہوں، عمارہ اتنی سگھڑ کب سے ہو گئی کہ ا
شرٹ پریس کرے اور بونس میں بستر بھی درست کر دے۔ ماہا! تم کتنی اچھی ہو۔'' و
پہننے لگا۔ دُھلا دُھلا، نکھرا نکھرا وہ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں تعریف کرنے کی۔ اپنا کام تو ہر کوئی کرتا ہے، دوسروں
کرنے میں جو سکون ملتا ہے، اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔'' وہ مسکرا اُٹھی۔

''اگر تمہیں کام کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو ایک کام اور کرو۔'' وہ بولا۔

''کیا؟''

''یہ شرٹ کا بٹن نکل گیا ہے، اسے تو لگا دو۔'' وہ اپنے ہاتھ میں بٹن تھامے مسکرا
''لاؤ دو شرٹ۔'' وہ دروازہ کھول کر ہم رنگ دھاگہ ڈھونڈنے لگی۔

''اتنا وقت نہیں ہے ماہا! یونہی کھڑے کھڑے لگا دو۔'' وہ بولا۔ ماہا بھاگتی ہوئی
سکینہ چچی کی مشین سے ہم رنگ دھاگہ ڈھونڈ لائی۔

ماہا کے دل کی دھڑکنیں شور مچا رہی تھیں۔ عاشر اتنے قریب تھا اس کے کہ وہ ا
آنکھوں میں، اُس کے دل میں جھانک سکتی تھی۔ بٹن لگ گیا۔ وہ منہ سے دھاگہ کھینچ
ہوئی۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور عمارہ چائے تھامے ان کی جانب بڑھی۔

سب نے مل بیٹھ کر چائے پی۔ پھر عاشر ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتا باہر چلا گیا ا
نے چپکے سے وہ استعمال شدہ ٹشو اُٹھا لیا۔ اپنے کمرے میں آ کر اُس نے الماری
سنہرے رنگ کا ڈبہ نکال لیا، جس میں اُس کی سالوں کی محبت قید تھی۔ اُس ڈبے میں
کی چیزیں تھیں۔ امانتیں۔ ایک رومال جس پر امی نے ''اے'' کاڑھا ہوا تھا، ایک ٹو
چشمہ، ایک بنا سیاہی والا فاؤنٹین پین، اُس کی کچھ تصویریں، ایک پھٹی ہوئی جراب،
پرانی کنگھی، اور اب یہ استعمال شدہ گلابی ٹشو پیپر۔ اُس نے احتیاط سے وہ ٹشو پیپر تہہ کر
رکھ دیا۔

رات کا وقت تھا۔ ابھی سب لوگ رات کا کھانا کھا کر کمروں کی طرف گئے تھے۔ ماہا
نے استری کے کپڑوں کا ڈھیر اُٹھا لیا اور عمارہ کے ساتھ اُن کے پورشن کا رخ کیا تھا۔ امی
کی طبیعت بہتر نہ تھی لہٰذا وہ سو رہی تھیں۔ ابو بھی گھر سے باہر تھے اور ردا اپنے کمرے کی
تنہائیوں میں اعزاز حسن کی آواز کے ہمراہ تھی۔

''ہاں تو سامعین! آج کے ہمارے پروگرام میں لائیو کالز کا سلسلہ بھی چلے گا۔ ہمارا
نمبر ہے......'' وہ اپنا نمبر بار بار دہرا رہا تھا۔

''آپ ہم سے بات کر سکتے ہیں۔ فرمائش کر سکتے ہیں۔ ہم آپ کی کالز کے منتظر
رہیں گے۔''

''ہیلو......'' اچانک ریڈیو میں فون کی گھنٹی کی آواز آئی اور اعزاز حسن نے اپنی پیاری
آواز میں ہیلو کہا۔

''آپ اعزاز حسن بات کر رہے ہیں؟'' کسی عورت کی آواز اُبھری۔

''جی ہاں! میں اعزاز حسن ہوں۔ آپ کون ہیں؟'' وہ بولا۔

''میرا نام راحت ہے۔ ہم سبھی آپ کا پروگرام شوق سے سنتے ہیں۔ پسند کرتے ہیں۔
آپ بہت اچھی کمپیئرنگ کرتے ہیں۔'' وہ عورت رسمی کلمات ادا کرنے لگی اور پھر اپنی
فرمائش کا نغمہ بتا کر فون بند کر دیا اور اُس کی فرمائش کا گانا بجنے لگا۔

ردا کے دل میں جانے کیا آئی کہ وہ باہر کوریڈور میں جا کے ٹیلی فون سیٹ اُٹھا لائی۔
اعزاز حسن کا بتایا ہوا نمبر اُسے زبانی یاد ہو چکا تھا۔ اُس نے وہ نمبر ملایا۔ خوش قسمتی سے وہ
نمبر فوراً مل گیا۔ کسی آدمی کی آواز آئی۔

''ہم ابھی آپ کی آن ایئر لائیو بات کرواتے ہیں۔ تیار رہیے۔'' ریڈیو پر نغمہ ختم ہوا
اور اعزاز حسن کی آواز آئی۔

''دیکھتے ہیں ہمارے ساتھ لائن پہ کون ہے۔ ہیلو!'' اُس کا فون کنکٹ ہو چکا تھا۔
اعزاز حسن کی آواز فون کے ایئر پیس میں بھی گونجی تھی۔ ''ہیلو!......کون ہے ہمارے
ساتھ؟''

ردا نے اپنی پوری ہمت مجتمع کر کے ہیلو کہا۔

''میرا نام ردا ہے۔''

''کہاں سے بول رہی ہیں ردا، آپ؟'' وہ بولا۔

''آپ ہی کے شہر سے۔''

"کیا کہنا چاہیں گی ردا؟" اس سوال نے اُسے اُلجھا دیا۔ "آپ سن رہی ہیں نا
"مجھے آپ کی نظمیں بہت پسند ہیں۔" وہ بولی۔ اُس کے دل میں اِک تھر
تھی۔

"کون سی نظم زیادہ پسند ہے آپ کو؟" وہ گفتگو کو طول دینے لگا۔

"وہ، جو آپ نے اُس دن پروگرام میں کہی تھی۔ جس سے ایک دن پہلے ا
گاڑی کسی لڑکی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔"

اُس کی بات پہ وہ مسکرایا تھا۔

"ایک بات بتاؤں اعزاز حسن!" وہ اب کچھ سنبھل چکی تھی۔

"جی بولیں ردا!"

"میں وہی لڑکی ہوں، جس کے پیچھے آپ کی گاڑی رُکی تھی۔" نجانے اُس نے کیوں کہہ دیا۔ وہ یقیناً یہ کہنا نہ چاہتی تھی لیکن بہرحال کہہ چکی تھی۔ پھر اُس کے دھڑکنیں ایسی منتشر ہوئیں کہ اُس نے فون بند کر دیا۔

"ہیلو........ ہیلو........ ردا!" ریڈیو میں اعزاز حسن کی آواز گونجی۔ اسٹوڈیو انچارج فوراً ایک گانا آن ایئر دے دیا۔

"ظفر! ابھی جس نمبر سے فون آیا، یہ نمبر مجھے چاہئے۔" اعزاز حسن نے فوراً آپ روم میں بیٹھے لڑکے کو کہا۔ یہ اُس لڑکی کا فون تھا، جس نے اُسے اتنے دنوں سے بے رکھا تھا۔ جس کی صورت نگاہوں میں اُترتی تو اُس کی نیندیں دامن چھوڑ جاتیں۔ وہ اپنی ہر نظم میں مسکراتا پاتا تھا۔ ہر پل، ہر لمحہ، فقط وہی چہرہ آنکھوں کے دائرے جھلملانے لگا تھا۔ سوچ کے کئی در وا کئے تھے۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ اس لڑکی کو فقط عام لڑکی سمجھ کے فراموش نہیں کرے گا۔ وہ اسے اپنی زندگی میں لے کر آئے گا۔ وہ اُ بنا کے رہے گا۔

پروگرام کے اختتام پر اُس نے ظفر سے وہ نمبر لیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا پہنچتے پہنچتے اُسے بارہ بج چکے تھے۔ اُس نے کھانا کھا کر سونے کی کوشش کی مگر سو نہ سکا بار وہ آواز سماعتوں میں شور مچا رہی تھی۔ وہ لہجہ، وہ چہرہ اُسے پریشان کر رہا تھا۔ اُس نے کارڈلیس اُٹھایا اور اپنے گھر کی ٹیرس میں آ گیا۔ باہر آسمان پہ ستارے جگمگا رہے اور ان ستاروں کی چھاؤں میں اُس کی عجیب محبت پنپ رہی تھی۔ اُس نے وہ نمبر والی نکالی اور نمبرز پش کرنے لگا۔

وہ ابھی تک اسی حالت میں تھی۔ منتشر تھی۔ ڈانواڈول، بکھری بکھری سی۔ جب سے اُس نے اعزاز حسن سے بات کی تھی، وہ عجیب اضطراب کا شکار تھی۔ اُس سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اُس کی قربت کو کچھ لمحے سونپنا چاہتی تھی۔

فون کی گھنٹی سکوت میں چلا اُٹھی تھی۔ ٹرن........ ٹرن........ ٹرن........ وہ فون واپس ریسیور میں رکھنا بھول گئی تھی۔ اس گھنٹی نے اُسے سوچوں کی بھول بھلیوں سے گھسیٹ لیا۔ اُس نے کسی اور کے سن لینے کے ڈر سے لپک کر فون اُٹھا لیا۔

"ہیلو!" دل کی دھڑکنوں کے ہمراہ آواز بھی کانپ اُٹھی تھی۔

"ردا بول رہی ہو؟" اعزاز حسن کی مانوس آواز نے اُسے ڈرا دیا تھا۔ اُسے یوں لگا تھا جیسے کسی آسیب زدہ مکان میں ہو اور آسیب بہروپ بن کر اُسے ڈرا رہا ہو۔

"ہیلو ردا! میں اعزاز بات کر رہا ہوں۔" وہ شدتِ جذبات میں تھا۔

"آپ کو میرا نمبر کیسے ملا؟" وہ گھبرا گئی تھی۔

"بس دیکھ لو۔ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل ہی جاتا ہے۔ ویسے ڈھونڈا میں نے نہیں، تم نے ہے۔ ردا! اگر آج تم مجھے فون نہیں کرتیں تو کس طرح میں ڈھونڈتا تمہیں؟ اس لئے بہت شکرگزار ہوں۔ کچھ بولو گی نہیں تم؟" وہ اپنے لہجے میں پیار سمیٹ کر بولا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ اعزاز حسن ہیں........ وہ اعزاز حسن، جسے میں پچھلے ایک سال سے سن رہی ہوں، پسند کر رہی ہوں۔ جس کی نظموں کو ہر روز اپنی ڈائری میں لکھتی ہوں۔ آپ وہی ہیں۔" اُس کا لہجہ انتہائی جذباتی ہو گیا تھا۔ یقیناً وہ آج کچھ اور بھی ...تی تو پورا ہو جاتا۔

"تو یقین کر لو، میں اعزاز حسن ہی ہوں۔ تمہارا اعزاز۔ بے قرار تو تمہاری ایک جھلک نے ہی کر دیا تھا مجھے۔ لیکن آج تمہاری اس فون کال نے میرے ہوش و حواس مجھ سے چھین لئے ہیں۔ میں پروگرام آن ایئر نہیں دے پا رہا تھا۔ مجھ میں بات کرنے کی سکت نہ رہی تھی۔ ردا! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ بات کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اعزاز حسن کے والہانہ اظہار نے اُسے حیران کر دیا تھا۔ وہ اپنی قسمت پہ حیران تھی۔

وہ پوری رات اُن دونوں نے باتیں کیں۔ کئی طرح کی باتیں۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے محبت کا دامن تھامتے ہی ہر چیز فراموش ہو گئی ہو۔ دنیا کا خوف، رات کی نیند، تعلیم۔

پھر تو جیسے ان دونوں کا یہ معمول بن گیا۔ رات کے بارہ بجے کے بعد ردا فون اپنے کمرے میں لے آتی اور رات گئے تک اُس سے بات کرتی، اُس کی نظمیں سنتی۔ وہ تھا بھی

تو لفظوں کا سوداگر۔ نظموں کا جادوگر۔ محبت نے دو انسانوں کی آنکھوں پہ پٹی باندھ
اور ایک ایسی راہ پہ دھکا دے دیا تھا، جو تاریک تھی، مگر راستہ تو تھا۔ سو وہ دونوں اس
پر بے خوف و خطر چل پڑے تھے۔

اُس نے نبیلہ کو اپنا راز دار بنا لیا تھا۔ وہ خود بھی نبیلہ کے راز کی حفاظت کر رہی
نبیلہ اور امجد کی خط و کتابت اسی طرح جاری تھی اور پہلے ہی کی طرح نبیلہ کا خط ردا
تھی۔



آج ردا نے اعزاز حسن کو ملاقات کے لئے بلایا تھا، اپنے کالج کے باہر۔ وہ
اتنی کر رہا تھا ملنے کی۔ پھر وہ بھی تو اُسے دیکھنا چاہتی تھی، اس سے ملنا چاہتی تھی۔ پلان
مطابق وہ کالج وین سے اُتری اور کالج کے اندر جانے کے بجائے اُس بس اسٹاپ
گئی، جہاں اعزاز حسن کو آنا تھا۔ بس اسٹاپ ایک گھنے پرانے پیڑ کے نیچے بنایا گیا تھا
کی چھاؤں تلے وہ کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ انتظار کٹھن ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کتنے لوگ
نظروں میں تھی۔ راہ گیر، بس والے، رکشے والے، کالج کے اندر آنے جانے والے
آشنا چہرے....... اعزاز حسن نے اتنی دیر لگا دی تھی۔

ایک گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد اُس نے جب کالج جانے کا ارادہ کیا تو ا
گاڑی کو رُکتے دیکھا۔ وہ تیز رفتاری سے اُس کی جانب بڑھی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔
نے بھی خاموشی سے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

گاڑی کے اندر کسی بہترین ایئر فریشنر کی مہک تھی اور اے سی کی دلفریب ٹھنڈک
دونوں خاموش تھے۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''کہو تو گاڑی روک کے کسی سے پوچھ لوں کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔'' اعزاز حسن
بسورا ہوا منہ دیکھ کر ناراضگی کی وجہ بھانپ گیا تھا۔ وہ اس اوٹ پٹانگ بات پہ مسکرا
تھی۔ اور پھر اس کا مان جانا کون سا مشکل کام تھا۔ سفید رنگ کے کالج یونیفارم میں
شانوں پہ پھیلائے، اس کی گلابی رنگت کتنی روشنی بکھیر رہی تھی۔

''آپ بہت برے ہیں اعزاز! پورا ایک گھنٹہ میں نے دھوپ میں کھڑے ہو
ہے۔ کس طرح گھور گھور کر دیکھ رہے تھے لوگ مجھے۔'' وہ رُوٹھی تھی۔

''اب اچھا ہوں یا برا، تمہارا ہی ہوں۔ لیکن لیٹ ہونے کی اصل وجہ بھی تم ہو

پہر تک رات تم سے بات کی تھی تو صبح جلدی کیسے اُٹھتا؟''

''میں بھی تو روز کالج آتی ہوں۔ رات کو آپ سے بات بھی کرتی ہوں۔'' وہ حق
بجانب تھی۔

''اچھا بابا! سوری۔ آئندہ نہیں کروں گا دیر۔ ویسے تمہارے انتظار کو کم دردناک بنانے
کا ایک حل ہے میرے پاس۔'' وہ بولا۔

''وہ کیا؟''

اعزاز حسن نے اپنی شرٹ کی جیب سے ایک موبائل فون نکالا۔

''یہ سیل فون ہے۔ یہ تمہارے لئے ہے۔ رات کو اب ہم اسی پر بات کیا کریں گے۔
اور صبح میں جب بھی لیٹ ہوں، تم مجھے فون کر کے جگا سکتی ہو۔''

اُس نے وہ موبائل فون جھپٹ لیا۔ ''ہائے اللہ....... اعزاز! یہ میرے لئے ہے،
سچ مچ میں؟''

''سچ مچ میں۔'' وہ اُسی کے انداز میں مسکرایا تھا۔ اُس کی تمنا ہی تو تھی موبائل فون۔
کالج میں کتنی ساری لڑکیاں رکھتی تھیں موبائل فون۔ اور تو اور اُس کنگال کریانے والے امجد
نے نبیلہ کو بھی موبائل فون لے کر دیا تھا۔ وہ بڑی خوشی سے موبائل فون کے بٹن پش کر رہی
تھی۔ اسے دیکھ رہی تھی۔

''تم اسی طرح مسکراتی رہا کرو ردا! تم پہ یہ مسکراہٹ بہت جچتی ہے۔ دیکھنا، میں تمہارا
ہر خواب کس طرح پورا کروں گا۔ بس تمہارا ساتھ چاہئے مجھے۔ اور کچھ نہیں۔'' وہ اُسے
مسکراتا دیکھ رہا تھا۔

گاڑی ریڈ سگنل پہ رُکی ہوئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ اِک گدگداتا
سا احساس من میں جاگا۔ سگنل گرین ہوا۔ اعزاز حسن نے کلچ پر پاؤں رکھا۔ گیئر لگانے
سے پہلے ردا کے دوپٹے کو ہاتھوں میں لیا اور گیئر کے اوپر رکھ کے پہلا گیئر لگایا۔ اُس کے
دوپٹے کے ملائم لمس نے اُسے محسوس کیا۔



اندھی محبت نے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی شروع کروا دیا۔

تعلیم تو پھر جیسے ایک معمولی سی چیز بن گئی تھی۔ اُس کے لئے غیر معمولی تھا تو صرف
اعزاز۔ اُس کی باتیں، اُس کے لباس سے پھوٹتی نت نئی خوشبوئیں، بات بات پہ بکھرتے
اُس کے وہ شعر، اُس کے وہ جادوئی قہقہے، اُس کی آنکھوں سے پھوٹتی محبتیں....... وہ دیوانی

ہو گئی تھی اُن دنوں۔

روز رات کو اُس سے بات کرتی۔ بستر کے اندر لیٹے موبائل فون پر ضرور
ضروری باتیں ہوتیں۔ اکثر و بیشتر ملاقاتیں ہوتیں۔ اپنے لئے لکھی اعزاز حسن
اُس کی سانسیں بن چکی تھیں۔ اُس کے دیئے وہ قیمتی تحفے، وہ کارڈ سنبھال سنبھا
تھی۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے بالکل بے خبر ہو چکی تھی۔ خبر تھی تو بس اُس
کہ جس پہ چلنے سے پہلے وہ اپنی تمام تر کشتیوں کو آگ لگا آئی تھی اور جو راستہ
صرف اعزاز حسن کے گھر تک جاتا تھا۔

اعزاز حسن کے والد پانچ سال قبل فوت ہو چکے تھے اور پانچ سال قبل اعزاز
بزنس میں انوالو ہو گیا تھا۔ شہر کا ایک مشہور ریستوران اور پٹرول پمپ اعزاز
تھے۔ ایک پرائیویٹ اسکول اُس نے کھلوایا تھا اور ریڈیو اُس کا شوق تھا۔ وہ جا
اُس کی آواز ایک انمول تحفہ ہے خدا کی جانب سے اور وہ اس آواز سے لوگوں
میں اُترنا چاہتا تھا۔ گھر میں ایک بوڑھی ملازمہ اور اُس کا بیٹا بطور باورچی تھا۔ ایک
جس کی شادی ہو چکی تھی۔ یہی تھی اُس کی اردگرد کی کل کائنات۔ وہ تنہا رہتے رہ
تھا۔ تنہائی سے اُسے اب خوف سا آنے لگا تھا لیکن بہرحال اُسے ابھی اور کچھ د
تھا۔ تب تک جب تک ردا کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی۔ اُسے یقین تھا کہ اس کم
کے والدین اس رشتے کو قبول نہیں کریں گے۔ محبت نے اُس کی زندگی میں رنگ
اور وہ اس رنگ میں رنگ کر از حد خوش تھا۔

پھر ان دنوں ساون کے بادلوں نے پورے شہر پر اپنا سایہ پھیلا دیا تھا۔

ماہا کچن میں پکوڑے بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ردا اور عمارہ صحن میں بار
رہی تھیں۔ صحن میں لگے پنجرے کے پرندے باہر نکلنے کو مچل رہے تھے۔ اِدھر اُدھر
بھی خوشی منا رہے تھے۔

ردا کبھی بارش کے کھڑے پانی میں اپنے نازک پاؤں مارتی تو کبھی اپنا تن م
پتہ نہیں اُس کا رواں رواں بارش کی مستی میں جھوم رہا تھا، یا اعزاز حسن کی محبت
آپ بھگونے میں خوش تھی۔ ماہا اُسے دیکھ کر مسکرا دی۔ اچانک اُس کی نظر کو
ستون کے اُس طرف کھڑے عاشر پہ پڑی۔ وہ بڑی محویت سے صحن میں چہ
اُڑتی ردا کو دیکھ تھا، جو کمسن کلی کی طرح بھیگ بھیگ کر جھوم رہی تھی۔ اُس کے
نے اُس کے جسم کے نشیب و فراز کو نمایاں کر دیا تھا۔ وہ اور عمارہ ہاتھوں میں ہا

ے میں گھوم رہی تھیں۔

ماہا کے دل میں ایک بدترین خدشہ سر اُٹھا چکا تھا، عاشر کی محبت وہ نہیں، ردا ہے۔ لیکن
کیوں؟ کس طرح؟ کیا عاشر کی نظرِ انتخاب مجھ پہ نہیں ٹھہری؟ کیا اسے ردا سے پہلے میں
نہ آئی؟ اُس نے ہمیشہ کی طرح آج بھی اس خیال کو دماغ سے جھٹکنا چاہا لیکن وہ
لی بھی تو کیسے؟ عاشر کی پُرشوق نگاہیں اُس کے سامنے تھیں، جن کا ہدف اس وقت ردا
ل۔ اور وہی ہو سکتی تھی۔ اس وارفتہ برستی بارش میں اپنی آنکھوں کے اندر ہر طرح کا
ہ پن سجائے وہ اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

"چائے پیو گے عاشر؟" ماہا کسی چھلاوے کی مانند ستون سے نکلی تھی اور ہاتھ میں
پ چھوڑتی چائے کا مگ تھامے تھی۔ اُس کی پیش کش کو اُس نے رد نہیں کیا اور چائے کا
لے لیا۔ وہ تصدیق چاہتی تھی۔ وہ عاشر کی زبانی اقرار سننے آئی تھی۔ اس خدشے کے
ل جو اُس کا دل دھڑکائے جا رہا تھا۔

"میں نے تمہاری اِک چوری پکڑ لی ہے عاشر!" وہ اُس کے پاس ہی ستون سے ٹیک
لگے کھڑی ہو گئی۔

"وہ کیا؟" وہ مسکرایا تھا۔

"میں نے تمہاری آنکھوں میں ردا کے لئے پسندیدگی دیکھی ہے۔ کیا میرا اندازہ صحیح
؟" وہ کمال ضبط سے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی اور عاشر کو حیرانی ہوئی کہ
ا اور چہرہ پڑھ لینے میں کوئی اتنا ماہر بھی ہوتا ہے۔ وہ چپ رہا۔

"تمہارے انکار کی کوئی گنجائش میں نے نہیں چھوڑی عاشر! میرے سوال کا جواب
"اُس پہ انتظار کٹھن سا تھا۔

"اس سوال کو جواب بنا دو ناں ماہا!" وہ مدھم، ٹھہرے، مطمئن لہجے میں بولا۔ ماہا کے
میں اِک چھناکا سا ہوا۔

"اس میں کوئی شک نہیں ماہا! کہ تم میری بے حد اچھی دوست ہو اور پھر دوست تو وہی
ا ہے جو دوست کو پہچانے، اس کے مزاج سے آشنا ہو۔" وہ چائے کی ہلکی پھلکی چسکیاں
رہا تھا۔

ماہا کے گلے میں گولا سا اٹک رہا تھا۔ وہ فوری ردِعمل سے قاصر تھی۔

"تو کیا ردا بھی.......؟" اِک ادھورا سا سوال اُبھرا۔

"اُسے تو پتہ بھی نہیں کہ کوئی اُسے اتنی دیوانگی سے چاہتا ہے، دیکھتا ہے۔ اور میں

اُسے بتانا بھی نہیں چاہتا۔ اُس کی کم سنی اور انجانے پن کے اس بھرم کو ایسے ہی رہنے دینا
چاہتا ہوں۔ اُسے چپکے سے اپنا بنا لینا چاہتا ہوں۔ میری مشکل آسان کر دو ناں ماما!
میرا بنا دو ناں۔"

عاشر نے اُس سے مانگا بھی تھا تو کیا۔ اُس سے اُس کا دل مانگتا، اُس کی جان
لیتا۔ وہ اپنے دل کے اوپر چھری پھیر کے اُسے ردا کا ساتھ کس طرح دے سکتی تھی؟

کتنی بے خبر تھی ماما۔ بے خبری میں ہی ماری گئی تھی۔ اعتبار نے ہی اُسے بے ا
بخشی تھی۔ اعتماد کی زیادتی نے اُسے دھوکا دیا تھا۔ بھلا اتنی کم سن کہاں ہے ردا۔ اور پھر
چہرہ، اُس کی معصومیت۔ عاشر اندھا تو نہیں تھا کہ اُسے ردا نظر نہ آتی اور نہ ہی وہ بہرہ
جس کی سماعتوں میں ردا کے نقرئی قہقہوں کی بازگشت نہ سنائی دیتی۔ کہاں ردا کے کو
ہاتھ پاؤں اور کہاں ماما کے کھردرے سخت ہاتھ جو کام کر کر کے اپنی رنگت کھو چکے
کہاں ردا کی ریشمی زلفیں اور کہاں ماما کی عجلت میں بنائی ہوئی بے ترتیب چوٹی۔
صورت تو پیتل بھی ہوتا ہے، لیکن سونے کی سی چمک کہاں ہوتی ہے اس میں۔ اچ
خوب صورت ماما بھی تھی لیکن ردا کی سی ادائیں اور کم سنی کہاں تھی اُس میں۔

"کہاں جا رہی ہو؟" وہ گم صم سی، بنا کچھ بولے جانے کے لئے مڑی تو وہ بولا۔

"بارش نے کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر لی ہے۔ پانی دہلیز پار کرنے کو چل رہا
میں ذرا دروازہ بند کر آؤں۔" بظاہر عام سی کہی بات اپنے اندر ایک معنی رکھتی تھی۔ اور
دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی اور بستر پہ گر کے آنسو بہانے لگی۔ ہر دروازہ کھول کر
کے پانی کو بہہ جانے دیا۔



وہ اعزاز سے مل کر آئی تھی۔ اُس کا روم روم اعزاز کے قرب کی خوشبو سے مہ
ابھی تک اُسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خواب کے عالم میں ہے۔ اِک ایسا خواب کہ
تعبیر اعزاز ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں۔ کالج کی چھٹی ابھی کچھ ہی لمحے پہلے ہوئی
سفید پوش لڑکیاں گیٹ میں پھنسی ہوئی تھیں، کچھ اس طرح کہ جیسے ان کے پیچھے کو
خور بلا لگی ہو اور وہ اپنی جان چھڑانے کے لئے بھاگ رہی ہیں۔ کئی لڑکیاں دھکے
لڑکھڑائے جا رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر اس دھکم پیل کو دیکھ کر مسکرائی اور پھر اچانک نظ
میں کسی کو کھوجتے عاشر پہ پڑی۔ وہ نظریں اِدھر اُدھر دوڑا کے کسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اُ
چہرے سے پریشانی صاف واضح تھی۔ اُس کا دل بے طرح دھڑکا۔ کہیں عاشر بھا

اعزاز حسن کی گاڑی میں تو نہیں دیکھ لیا؟ وہ سوچنے لگی۔
گھبراہٹ اور خوف دل کے گداز احساسات پہ حاوی آ گیا وہ ڈری سہمی سی پہلے کھڑی
رہی پھر کچھ ہمت کر کے آگے بڑھی اور عاشر کے سامنے آ گئی۔ اُسے دیکھ کر عاشر کے
چہرے پر ایک رنگ سا آیا۔ وہ سمجھ گئی کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔

"عاشر بھائی! آپ کیوں لینے آئے ہیں مجھے؟" وہ ڈر کے پوچھ بیٹھی۔

"مجھ سے کوئی سوال مت کرو ردا! چپ چاپ جا کے بائیک پہ بیٹھو۔" وہ اپنے لہجے کی
درشتگی کو نرمی کا رُوپ دے کے بولا۔

"ہوا کیا ہے عاشر بھائی؟ کچھ تو بتائیں۔" وہ بولی۔

"سب پتہ لگ جائے گا گھر چل کے۔ چپ ہو کر چلو میرے ساتھ۔" وہ اُسے لیتا ہوا
بائیک تک آیا۔ وہ بھی چپ چاپ بیٹھ گئی۔ وہ یقیناً یہی سمجھی تھی کہ راز فاش ہو گیا ہے۔ سب
کو اعزاز کے بارے میں علم ہو چکا ہے۔

وہ گھر پہنچی۔ گھر میں اِک عجیب غصے بھری خاموشی طاری تھی۔ اُسے دیکھتے ہی ماما اُس
کے پاس آئی۔

"چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی جاؤ ردا! اور خدا کے لئے بابا یا چچا کے سامنے مت
آنا۔" ماما کے لہجے میں اُلجھن سی تھی۔

راز تو اُس کا فاش ہو چکا تھا لیکن اس راز سے اعزاز کا کوئی تعلق نہ تھا۔ پتہ تو اُسے تب
چلا جب ماما اُس کے کمرے میں آئی اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

"امجد کریانے والے سے تمہارا کیا تعلق ہے ردا؟" سوال تھا کہ کوئی بم کا گولا۔ ردا
کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔

"کیا مطلب ماما باجی؟" وہ سخت اُلجھن کا شکار تھی۔

"مطلب یہ کہ آج اُس امجد نے اپنا رشتہ بھیجا ہے تمہارے لئے۔ اپنی آوارہ، بدکار
ماں کو بھیجا تھا اُس نے۔ پتہ ہے تمہیں امی، بابا، چچا کس ذہنی اذیت سے گزر رہے ہیں۔
ہم میں سے کسی کو تم سے ایسی توقع نہ تھی ردا!" ماما اُس پہ چیخ رہی تھی۔

"لیکن میں نے کیا، کیا ہے ماما باجی؟" آنسو اُس کے رخساروں سے پھسل کے گرنے
لگے۔

"تم نے وہ کیا ہے ردا! جو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس ان پڑھ، جاہل لڑکے
سے عشق کر کے تم نے اس خاندان کے رُتبے کو ٹھیس پہنچائی ہے۔" ماما کا لہجہ غم زدہ ہو گیا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ماہا باجی!" وہ منمنائی تھی۔

"تم نے جو کیا ہے، اس کا ثبوت یہ خط ہیں ردا! کہہ دو، یہ تم نے نہیں لکھے۔ ہزاروں لاکھوں میں تمہاری تحریر پہچان سکتی ہوں۔" ماہا نے دس بارہ عدد کاغذ اُس کی ط اُچھالے تھے اور اُس کا ذہن ماؤف سا ہو گیا۔ یہ وہی خط تھے، جو نبیلہ نے اُس لکھوائے تھے۔ یہ یقیناً اُسی کی تحریر تھی اور اس میں نبیلہ کا نام بھی نہیں تھا۔ لیکن یہ یہاں طرح پہنچے تھے؟ اس سوال کا جواب فوراً ہی ماہا نے دے دیا۔

"یہ اُس کی والدہ لائی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ آپ ضرور اس رشتے سے انکار کریں۔ اس لئے یہ ثبوت لائی ہوں کہ آپ کی لڑکی بھی میرے لڑکے سے محبت کرتی ہے اور جان اس کا ایک ایک حرف بابا پہ کتنا بھاری گزرا ہے۔"

"یہ خط میرے نہیں ہیں ماہا باجی! خدا کے لئے یقین کریں ماہا باجی! میرا اس سے تعلق نہیں ہے۔" وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ اُس نے یہ خط لکھتے وقت سوچا بھی کہ یہ تحریریں اس طرح آفت بن کر برسیں گی اُس پر۔ نبیلہ پہ بھی غصہ آیا۔

"امی نے نبیلہ سے پوچھا۔ اُس نے بھی تسلیم کرلیا ہے کہ یہ خط تم نے لکھے ہیں او سبزی والا فاضل چاچا۔ عاشر کو اُس نے بتایا کہ تم بذاتِ خود جا کر یہ خط اُس لڑکے کو د آتی تھیں۔" ماہا کے انکشافات جان لیوا تھے۔ الزامات اور بہتانوں کا نہ رُکنے والا سل تھا۔ وہ سچی تھی مگر سارے ثبوت اُس کے خلاف تھے۔ اُس کے سچ کو ماننے والا کوئی نہ تھا

"بابا تو تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ کالج جانے سے بھی وہ منع کر رہے ہیں اور امی، رو رو کر برا حال ہے اُن کا۔ تم کچھ ان لوگوں کی عمر کا ہی خیال کر لیتی ردا!" ما کہتی ہوئی کمرے سے چلی گئی اور وہ قسمت کے اس امتحان پر رونے لگ گئی۔

کیا سوچا تھا اُس نے اور کیا ہو گیا تھا۔ ابھی تو وہ اعزاز حسن کے دکھائے خوا راستوں پہ دو قدم ہی چلی تھی۔ ابھی تو کتنا سارا راستہ باقی تھا۔ انسان سوچتا کیا ہے اور ہو جاتا ہے۔ زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں، جب انسان کی ساری فہم و فراست ساری دلیری و بہادری، اُس کے سارے آدرش، اُس کا تمام رعب و دبدبہ دھرے کا دھر جاتا ہے۔ وہ حالات کی بلند و بالا لہروں کے سامنے ایک حقیر تنکے کی مانند بہنے پر مجبور جاتا ہے۔

کاش وہ نبیلہ پہ اعتبار نہ کرتی۔ کاش وہ اُس کی بات نہ مانتی۔ کاش وہ دوست کی خا اپنے اصولوں کی دیوار نہ پھلانگتی۔

گھر کے تمام لوگ اس سے ناراض تھے۔ اسے ناکردہ گناہوں کی سزا دے رہے تھے۔ سب کی آنکھوں میں لعنت و ملامت تھی۔ وہ اپنے لئے بھی قابل نفرت بن گئی تھی۔ وہ پورا دن روتی رہی۔ اسی ایک کمرے کے بندی خانے میں قید رہی۔ ایسے میں غمگسار اور ساتھی ہمیشہ کی طرح فقط اعزاز حسن کی آواز تھی، جو کسی برقی رو کے ذریعے ریڈیو پر نہیں، اس موبائل فون میں گونج رہی تھی۔

"تم فکر مت کرنا ردا! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ وہاں پہ کوئی شخص تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ الزام بے کار ہے، بے وجہ ہے تو تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ تم کیا ہو۔ اعتماد ہے مجھے تم پر۔ تم اس طرح کا کوئی کام نہیں کر سکتی۔"

اعزاز حسن کی باتیں، ڈھارس اُس کا سہارا تھیں۔ وہ پوری دنیا سے مقابلہ کرنے کو تیار تھی۔ خدا کے بعد سب سے زیادہ بھروسہ اعزاز پر تھا۔ کبھی کبھی کسی مشکل گھڑی، کسی جان لیوا لمحے میں انسان کے ستائشی جذبات اس نہج پر پہنچ جاتے ہیں کہ وہ اپنے چاہنے والے کی پرستش کرنے لگتا ہے۔

ردا بھی گھر والوں کے رویوں سے اُکتا چکی تھی اور ایسے میں وہ اعزاز حسن کو الف لیلوی کہانیوں کا شہزادہ سمجھتی تھی۔ وہ ہر طوفان سے ٹکرا سکتا ہے اور ہر مرحلے سے سرخرو نکل سکتا ہے۔

اس بندی خانے میں زندان کے قیدی کی طرح بند یہ اُس کا ساتواں دن تھا۔ ایسے میں اعزاز حسن سے وہ اکثر و بیشتر بات کرتی تھی۔ ماہا کے علاوہ اور کسی کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ سمجھا سمجھا کے تھک چکی تھی کہ وہ بے قصور ہے مگر کوئی اُس کی بات ماننے کو تیار نہ تھا۔

آخر اس بات کا انجام ایک فیصلے پر ہوا۔ ایک سفاک فیصلے پر۔ عاشر اور ردا کی شادی کے فیصلے پر۔

بابا اور چاچا نے اس مسئلے کا فقط ایک ہی حل سمجھا۔ اگر عاشر کے علاوہ کوئی بھی دوسرا لڑکا ہوتا تو شاید پسند یا چناؤ کا مسئلہ سامنے آتا۔ لیکن عاشر اکیلا تھا۔ اور موزوں بھی۔

عاشر کی سماعتوں سے جب یہ خبر ٹکرائی تو اُس کی تو جیسے دنیا ہی بدل گئی۔ نارسائی، رسائی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ انہونی، ہونی ہو رہی تھی۔ خدا نے اس طرح اچانک اُسے اس کی من پسند چیز عطا کر دی تھی، اُسے کسی کی منت سماجت کرنے کی، کسی کو سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ رہی بات ردا کے اس معاشقے کی، تو وہ جانتا تھا کہ وہ کمسن

ہے۔ عمر کے کسی کچے حصے میں وہ لڑکھڑا گئی تھی۔ اور وہ تہہ دل سے اسے معاف کرنے
تھا۔ من چپکے چپکے جھوم رہا تھا، روح کی اتھاہ گہرائیوں تک اطمینان کی ٹھنڈی میٹھی
پیوست ہو رہی تھی۔ اُس کی ہر ہر شریان میں دوڑتا لہو اطمینان کی ٹھنڈک پہنچا رہا تھا۔ آ
ہائے..... کچھ ایسا ہی نشہ ہوتا ہے جیت کا۔ کسی من چاہے کو پا لینے کا۔ گدگداتی سی کئی
کی خواہشیں بیدار ہو گئی تھیں۔ اردگرد نغمے بکھر رہے تھے۔

اور ماہا، پل ہی میں اُس کا سبھی کچھ برباد ہو گیا تھا۔ وہ ریت کے گھروندے، جو
اُس نے سالوں سے سینچا تھا، ہوا برد ہو گئے تھے۔

یہ خبر سن کر وہ مٹی کے ڈھیر کی طرح بستر پہ گر گئی تھی۔ اُس مردہ ڈھیر میں ایک دل
تھا، جس کا زیر بم دھک دھک کیے جا رہا تھا، یا پھر اس کا دماغ زندہ تھا، جس میں کئی
تیزی سے دائرے میں سفر کر رہی تھیں۔ یہ درد و کرب میں ڈوبی ہوئی یادیں تھیں اور
سفر ایک طویل سفر تھا۔ یہ کوئی دو تین ماہ یا برس کی بات نہ تھی، قریباً بارہ سال ہو چکے تھے
خاموش، یک طرفہ محبت کے ناطے کو۔ یہ بچپن کی محبت تھی۔ بہار کے ایک خوشگوار موسم
میں یہ محبت کسی کونپل کی طرح پھوٹی تھی۔ ساون کی بے شمار بارشیں برسی تھیں اُس پر
گنت چاندنی راتوں نے اُسے چھوا تھا۔ صبحوں کے دودھیا اُجالے اور شاموں کی
دوپہر کے رنگ اُسے سینچتے آئے تھے اور مرمریں ہونٹوں سے چومتے رہے تھے۔ اب
اس محبت کی جڑیں ماہا کی ہستی میں بہت دُور تک پھیل گئی تھیں اور ایک مضبوط تناور درخت
بن چکی تھیں۔ لیکن اس درخت کی قسمت میں باقی رہنا نہیں لکھا تھا۔ اُسے کٹنا تھا۔ آج
تو کل۔ اور وہ کٹ رہا تھا۔

اور روا...... وہ عجیب دوراہے پر کھڑی تھی۔ ایک طرف پورا گھر تھا اور دوسری
اعزاز حسن کی بے مثال محبت تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ حالات کا کوئی بے رحم
اُسے اعزاز کی ابدی جدائی کی جھلک دکھا دے۔ وہ حالات کی ستم ظریف آندھیوں
بے سمت اُڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اور اُس کا گھر، اُس کے اپنے؟ جان چھڑکنے والی ماں
سے بڑھ کر لاڈ کرنے والے بابا، اور ہتھیلی کا چھالا سمجھنے والی غمگسار بہن۔ کیا وہ اُن
کے بغیر رہ سکتی تھی؟

لیکن وہ محبت، وہ وعدے، وہ مان، وہ بھرم؟

یہ سچ تھا کہ اُس پر بے گناہ ایک تہمت لگی تھی اور گھر والوں نے اس تہمت کو سچ
آناً فاناً ایک فیصلہ صادر کر دیا تھا اور اس فیصلے نے اُسے گھر والوں کے خلاف کر دیا

ں کی محبت پل میں دُھندلانے لگی اور اعزاز، اُس نے تو اتنے نازک لمحوں میں بھی اُس
بار کیا تھا، اُس کا بھرم، اُس کا مان نہیں توڑا تھا، اُس کی عزت کی تھی۔

اور یقیناً عزت محبت پر حاوی ہوتی ہے۔ خونی رشتوں پہ حاوی ہوتی ہے۔ بے عزتی کا
غ اپنی پیشانی پر لگا کر اسی گھر میں عاشر کی بیوی بن کر رہنے سے بہتر تھا کہ وہ باعزت
قے سے اعزاز کا ساتھ قبول کرے اور ان لوگوں سے بہت دُور چلی جائے۔ گھر والوں
یادتیوں نے اُسے احتجاج پر مجبور کر دیا تھا اور وہ سرتاپا بغاوت بنی ہوئی تھی۔

"نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں کروں گی۔ کسی قیمت پر عاشر بھائی سے شادی نہیں کروں
گی۔" وہ چلا چلا کر ماہا سے کہہ رہی تھی اور ماہا سرتاپا حیرت کا پہاڑ بنی کھڑی تھی۔

"اعزاز حسن سے محبت کرتی ہوں میں۔ اور اُسی سے شادی کروں گی۔" وہ بلک بلک
ر رو دی۔ یقیناً اس بات کو ماہا عام حالات میں مذاق ہی سمجھتی، لیکن روا کی حد درجہ سنجیدگی
اُسے حیران کر دیا۔

"کون سا اعزاز حسن؟ اور تم اُس سے کہاں ملیں؟" ماہا بولی

"مجھ پر آپ سب نے بلاوجہ ہی اتنے الزامات لگا دیئے ہیں ماہا باجی! کہ اب اپنی
ت کا اقرار کرنے کے بعد یہ محبت بھی میرے لئے تہمت بن جائے گی۔ لیکن چاہے جو بھی
ائے، چاہے جتنی صعوبتیں، تہمتیں، الزام، ملامتیں میرا مقدر بنیں، میں اعزاز حسن کو نہیں
وں گی۔ چاہے مجھے کچھ بھی کیوں نہ کر گزرنا پڑے۔ مجھے اب بدنامی اور بربادی کا
ر نہیں۔" اُس کے اندر شور مچاتی باغی محبت واقعی نڈر تھی۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے ہونے کا
اس دلا رہی تھی اور ماہا ششدر و دنگ کی کیفیت میں گھری یہ نئی داستان سن رہی تھی۔ اُسے
ھی تھا کہ کہیں روا کی آواز دیوار کے باہر نہ چلی جائے لیکن عشق تو پھر عشق ہے۔ پتھر کی
وں اور ٹھوس لوہے کی سلاخوں سے بھی اپنے راستے نکال لیتا ہے۔

ماہا، روا کے کمرے سے باہر آئی تو اندھیری رات میں ستون کے پاس اُسے ایک ہیولا
ر آیا۔ وہ ٹھٹک گئی۔ پورے چاند کی راتیں تھیں اور ہر چیز چاند کی روشنی میں منقش لگتی تھی۔
نے اسی مدھم روشنی میں اُس سائے پر نظر ڈالی۔ وہ عاشر تھا۔ جو کچھ لمحے پہلے گھر میں
ل ہوا تھا اور روا کے کمرے کے آگے سے آوازیں سن کر رک گیا تھا۔ یقیناً وہ سب کچھ
کا تھا۔ وہ الفاظ تھے یا بم، جنہوں نے اُس کی سماعت کے پرخچے اُڑا دیئے تھے اور اپنی
جلتے کی حالت میں کھڑا ہو گیا تھا اور ایک پل میں صدیوں کا کرب اُس پر وارد ہوا تھا

اور اُسے روندتا چلا گیا تھا۔

"عاشر! تم یہاں؟" ماما نے آ کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔ ماما کی آو...
سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"کس وقت سے کھڑے ہو تم یہاں؟" ماما کا بدترین خدشہ سچ ہو چکا تھا۔

"اس وقت سے کہ جب میرے تمام خواب وقت کی ٹھوکر سے کرچی کرچ...
دیکھو ناں ماما! کتنے سارے ٹکڑے ہوئے ہیں میرے ارمانوں کے۔" عاشر کی
ہو چکی تھی۔ یقیناً وہ رو رہا تھا۔ چاند کی نازک چمک میں اُس کی آنکھیں کسی ٹم ٹم...
کی مانند چمک رہی تھیں۔

یہ کہہ کر وہ رُکا نہیں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ تمام
اضطراب کی حالت میں رہا۔ ردا کا غم ایک آتشیں سیال مادے کی مانند اُس کی...
میں پھیلتا جا رہا تھا اور اُس کے انگ انگ کو جلائے جا رہا تھا۔ کبھی وہ بے بسی ک...
کر رونے لگتا تو کبھی غصے کی انتہا تک پہنچ کر ردا کو ملامت کرنے لگا۔

"تو کیا سمجھتی ہے خود کو؟...... تو ہے کیا چیز؟...... تیرا خیال ہے کہ تیری...
میں آنسو بہاؤں گا۔ کسی نوخیز عاشق کی طرح کپڑے پھاڑ کر گلیوں میں ماتم کرو...
رڈیوں پر پچھتاؤں گا اور تمام عمر تنہا رہنے کی قسم کھاؤں گا۔ تھوکتا ہوں میں تجھ...
بھیجتا ہوں تیرے غم پر۔ مجھے کبھی تیری پروا تھی، نہ ہوگی۔"

وہ رونا نہیں چاہتا تھا مگر رو رہا تھا۔ وہ غم و یاس سے ہم کلام نہیں ہونا چاہ رہا
کلام ہو رہا تھا۔ وہ مایوسی کی تکلیف سے گزرنا نہیں چاہتا تھا مگر گزر رہا تھا۔ وہ سب
تھا، جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اور یہ ایک ایسا مقام تھا جہاں گریز ناممکن تھا اور جہاں
حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا تھا۔

وہ جب تک جاگتا رہا، اذیت سے گزرتا رہا۔ پھر اُس نے اُٹھ کر سلیپنگ ٹا...
اور نیند کی گہری وادی میں چلا گیا۔

رات بھر اُسے شدید ٹمپریچر سا محسوس ہوا۔ پسلیوں کے نیچے ہلکا ہلکا درد کبھی تیز
کبھی مدھم۔ وہ خوابوں میں ردا کے ہمراہ مختلف جگہوں پر گھومتا رہا۔ کبھی پارکوں...
سڑکوں پہ۔ وہ اُس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے تھی۔ کبھی اُس کا کاسنی آنچل لہرا کر
چہرے کو چھو رہا تھا، کبھی وہ عاشر کی کسی بات پر ہنس ہنس کر دُہری ہو جاتی۔ اُس...
پھلواری سے پھول چنتے بھی دیکھا۔ پھر کسی نہر میں پاؤں ڈبوتے ہوئے بھی۔ بے

...اور ہر منظر میں ردا ہوتی۔ وہی شروعات تو وہی اختتام۔ پر اُس کا خواب اپنے ہی گھر
...میں پرندوں کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔ ردا پاس کھڑی تھی اور اُداس آنکھوں سے اُس
...طلب تھی۔

"میں اعزاز حسن سے محبت کرتی ہوں۔ میں اُسی کی ہوں۔ میں آپ کی نہیں بن...
..." ایک جھٹکے سے اُس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ سر تا پا پسینے میں بھیگا تھا۔ کمرے کا اے سی
...تھا مگر پھر بھی اُسے لگا کہ جیسے اُس کا دم گھٹ رہا ہو۔



"السلام علیکم! میں اعزاز حسن ہوں۔" بڑے پُر وقار انداز میں اعزاز نے ہاتھ بڑھایا
...گرے پینٹ، آف وائٹ ڈریس شرٹ کے ساتھ دھوپ کا چشمہ آنکھوں پر چڑھائے
...منفرد لگ رہا تھا۔

"مجھے عاشر بیگ کہتے ہیں۔" عاشر نے اُس کا ہاتھ تھام کر مصافحہ کیا۔ یقیناً عاشر کے
...میں اعزاز کے لئے رقابت کے جذبات تھے لیکن وہ اپنے احساسات چھپانے میں ماہر
...عاشر کے چہرے پر سنجیدگی اور متانت کے سوا کچھ نہ تھا۔

"ردا نے ہمیشہ آپ کا ذکر اچھے لفظوں میں کیا ہے۔ وہ کہتی ہے، آپ اُس کے سب
...اچھے کزن ہیں۔" اعزاز کی بات کے جواب میں اُس نے کچھ نہ کہا۔

"آپ نے اس طرح اچانک مجھے یہاں بلایا۔ خیریت تو ہے؟" اعزاز واقعی حیران
...ردا سے نمبر لے کر عاشر نے اُسے فوراً ملنے کا کہا تھا اور وہ شہر کے مشہور ریستوران میں
...سے ملاقات کے لئے چلا آیا تھا۔

"ردا نے نہیں بتایا آپ کو؟" عاشر کے لہجے میں ایک چھپا چھپا طنز تھا۔

"بالکل نہیں۔" وہ فوراً بولا۔

"مسٹر اعزاز حسن! آپ ردا کو پسند کرتے ہیں؟"

"جی!" جتنا اچانک سوال تھا، اتنا ہی اچانک جواب۔ اعزاز پُر اعتماد تھا اور اُس کا
...ہی تو اُس کی پہچان تھا۔

"اور اُس سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

"ارادہ تو یہی ہے۔ لیکن کتنا اچھا ہو، اگر شادی ردا کی مکمل ہو جانے کے بعد ہو۔"
اعزاز اسی اطمینان سے بولا۔

"دیکھیں اعزاز صاحب! آپ ریڈیو کمپیئر ہیں۔ کسی بھی عام سے جملے کو لفظوں کے

اُتار چڑھاؤ کے ذریعے خاص بنا لینا اور ایک مختلف تاثر پیش کرنے میں آپ کا کو
نہیں۔ رہی بات میری تو میں ایک عام سا بندہ ہوں، سیدھی سیدھی بات کروں گا،
اُلجھانا بالکل نہیں چاہتا۔" عاشر نے شروعات کی۔ "آپ سن رہے ہیں ناں؟"
"میں ہمہ تن گوش ہوں جناب!" اعزاز حسن نے تصدیق کی۔
"آپ ردا سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی آپ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔
اس شادی میں جتنی تاخیر ہوگی، برا ہوگا۔ دیکھیں، مجھے سخت نفرت ہے کسی بھی فلمی
سے۔ لڑکی کا افیئر ایکسپوز ہونا، ماں باپ کی لڑائی، ناراضگی، جھگڑے، فساد، ہنگامے،
شادی کی رضامندی۔ یہ ایک بہت بڑا پروسس ہے۔" عاشر بڑے ڈرامائی انداز میں
"تو آپ کیا کہنا چاہتے ہیں مسٹر عاشر؟" وہ بھی اُسی کے سے انداز میں بولا۔
"میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ ڈرامہ...... ڈرامہ کرنا چاہتا ہوں میں۔ اور اس میں
کو بھی ایک کردار ادا کرنا ہوگا۔"
"کس طرح کا کردار؟" اعزاز یقیناً اُس کی گول مول باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔
"دیکھیں اعزاز صاحب! میں دل سے چاہتا ہوں کہ ردا اور آپ کی شادی جلد
ہو جائے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ ردا کے اور میرے والدین کے سامنے م
دوست کی حیثیت سے آئیں۔ باقی کام سیٹ کرنے کی ذمہ داری میری۔ بس آپ ا
ڈیٹا فراہم کر دیں مجھے۔ میرا مطلب ہے، آپ کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے، آپ کا کام
وغیرہ وغیرہ۔"
عاشر کی اس بات پر اعزاز کو حیرانی کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ کوئی اُس کا
خواہ تھا۔ وہ اپنے ہر احساس پر قابو پاتے ہوئے بولا۔
"اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا، عاشر صاحب؟"
"آپ نہیں جانتے مسٹر اعزاز! لیکن اس کا سب سے زیادہ فائدہ مجھے ہی ہوگا۔
ہے ناں۔ گھر میں کوئی پرابلم چلی تھی ردا کے رشتے کے متعلق اور اس پرابلم سے نمٹنے
لئے ایک اچانک فیصلہ ہوا۔ اور وہ فیصلہ ردا سے میری شادی کا تھا۔ دیکھیں اعزاز صا
میں اس چیز کے بالکل حق میں نہیں ہوں کہ محبت کسی سے کی جائے اور شادی کسی سے
زیادتی ہوتی ہے، محبوب سے بھی اور شوہر سے بھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ گناہ ہوتا
آپ نے وہ کہاوت تو سنی ہوگی۔ جس کے من میں پیا کا پیار، وہ کیا بنائے گھر اور ہا
میں نہیں چاہتا کہ ردا میرے نکاح نامے پر دستخط تو کرے لیکن تاعمر میری صورت میں

کو کھوجتی رہے اور ایسے میں اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ مجھے بھی برباد کرے۔ اس لئے میں
چاہتا ہوں کہ اسے آپ شادی کر کے لے جائیں۔" عاشر لمبی چوڑی تمہید باندھ کر بتانے
لگا۔ اُس کے چہرے کے بدلتے زاویوں اور اُونچ نیچ نے اعزاز کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یقیناً
وہ ایک جہاں دیدہ شخص تھا اور چہرے پڑھنا جانتا تھا۔
"عاشر صاحب! ایک بات پوچھوں...... سچ بتائیں گے؟" ملاقات کے اختتام پر
اعزاز اُسے کار پارکنگ تک چھوڑنے آیا تھا۔ "کیا آپ بھی ردا سے محبت کرتے ہیں؟"
اُس کے اچانک سوال پر عاشر مسکرا دیا تھا۔ "تب تک، جب تک اُس نے آپ سے
محبت نہیں کی۔" بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں کہی گئی یہ بات اپنے اندر ایک معنی رکھتی تھی۔ یہ
کہہ کر وہ فوراً اپنی گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی ریورس گیئر میں چلنے لگی۔
وہ ردا سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اپنے آپ کو ٹھکرانے کا۔ لیکن یہ بدلہ انتقام قطعاً نہیں
تھا۔ وہ ردا کو برباد ہرگز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تو اُس سے شادی کر کے اُسے سزا دے
سکتا تھا۔ لیکن اُس نے ایک الگ ہی راہ اختیار کی تھی۔ ایک الگ ہی ارادہ باندھا تھا۔ اور
وہ ارادہ تھا، اعزاز حسن سے ردا کی شادی کا۔ وہ اپنی پہلی محبت کی خوشی کو موت دے کر ہرگز
خوش نہیں رہ سکتا تھا۔ اُس نے تو پل پل اُس کی ہنسی، اُس کی آرزوؤں کی زندگی چاہی تھی
اور یہ حقیقت وہ جان چکا تھا کہ ردا کی ہنسی، خوشی اور آرزوئیں صرف اور صرف اعزاز حسن
سے ہی منسلک ہیں اور اسے کھو کے وہ یہ سب کچھ گنوا دے گی۔ وہ کسی بھی دوسرے مرد سے
یکسر مختلف تھا، تبھی تو یہ کر رہا تھا۔ وہ جلد از جلد ردا کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے دُور کر دینا
چاہتا تھا تاکہ اُس کا چہرہ اُسے اپنی ناکام محبت، اپنے لاحاصل عشق کی یاد نہ دلائے اور وہ
ایسا کر رہا تھا۔ اعزاز حسن سے ملاقات کے کچھ دنوں بعد اُس نے فوراً ایک لائحہ عمل تیار کیا
اور اُس پہ عملاً کام کرنے کے لئے وہ کچھ دنوں بعد اپنے والد کے پاس آیا۔
"ابا جی! میں ردا سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔" صاف گوئی اُس کی شخصیت کا حصہ تھی۔
انوار بیگ کو کرنٹ لگا۔
"کیا کہہ رہے ہو تم عاشر؟"
"ٹھیک کہہ رہا ہوں میں ابا جی!" وہ مصر تھا۔
"وجہ پوچھ سکتا ہوں میں اس انکار کی؟" ابا جی دھاڑے۔
"ابا جی! آپ چاہتے ہیں کہ میں آنکھوں دیکھی مکھی نگل لوں؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ
ردا نے پچھلے دنوں کیا حرکت کی ہے، اُس سے شادی کر لوں؟ میں مرد ہوں ابا جی! اور

غیرت میرے وجود کا بھی حصہ ہے۔" وہ اپنے چہرے پہ کمال کی سنجیدگی سجا کر بولا۔

"تم جانتے ہو عاشر! کہ میں اور بھائی جان مل کے یہ فیصلہ کر چکے ہیں اور پھر مسائل کے حل نکالے جاتے ہیں، نہ کہ ان مسائل کو وبال جان بنایا جاتا ہے۔" ابا جی کا لہجہ قدرے مدھم تھا۔

"ابا جی! کبھی کبھی ہم جو سوچتے ہیں، مسئلوں کے حل اس سے بہتر نکل آتے ہیں۔ آپ کا اکلوتا بیٹا ہوں ابا جی! میری خواہش کا خیال رکھنا بھی آپ کا فرض ہے۔ میں..... میں اور کچھ نہیں چاہتا ابا جی! بس یہ کہ آپ کسی طرح تایا ابا کو سمجھائیں۔ اور رہی بات ردا کی شادی کی تو اُس کی شادی کی ذمہ داری میں اُٹھاتا ہوں۔"

"کیا مطلب، ذمہ داری تم اُٹھاؤ گے؟" ابا جی اب بالکل نرم پڑ گئے تھے۔

"ابا جی! میرا ایک گہرا دوست ہے، اعزاز حسن۔ اچھا لڑکا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ ایک عدد ریستوران اور پٹرول پمپ کا مالک ہے۔ شاید کوئی اسکول بھی چلاتا ہے۔ ڈیفنس میں بنگلہ ہے، گاڑی ہے۔ اور تو اور اکیلا بھی ہے۔ نہ کوئی آگے، نہ پیچھے۔ وہ شادی کرنا چاہتا ہے کسی بھی اچھی لڑکی سے۔ کیوں نہ آپ اُس سے مل کر دیکھ لیں۔ باقی کام میں سیٹ کر لوں گا۔" عاشر نے کمال اداکاری سے جھوٹ بولا۔

انوار بیگ کچھ دیر سوچ میں پڑ گئے، پھر بولے۔

"بات تو تمہاری غلط نہیں ہے عاشر! لیکن بھائی جان ہی صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں۔ رہی بات تمہارے انکار کی تو وہ میں بتا دوں گا۔ بس تم اپنے دوست کو لے آؤ ملوانے کے لئے۔" ابا نے نرم لہجے میں کہا۔ عاشر مطمئن ہو چکا تھا۔

اور پھر اعزاز حسن انتہائی رازداری سے ردا کے والد اور چچا سے ملا۔ اچھا لڑکا تھا۔ چھان بین کرنے سے خاندان کا پتہ بھی چل گیا۔ پتہ چلا کہ وہ مشہور بزنس مین اعجاز حسن کا اکلوتا بیٹا ہے، جو اپنے والد کی موت کے بعد تمام پراپرٹی کا اکیلا وارث ہے۔ بظاہر انکار کی کوئی وجہ نہ تھی، لیکن پھر بھی سب کچھ اتنا آسان نہ تھا، جتنا عاشر نے سوچا تھا۔ وہ اتنی آسانی سے ردا کو اس گھر سے دُور نہیں کر سکتا تھا۔ اس کام کے لئے اُسے اور کڑی آزمائشوں کے ساتھ ایک شرط کو بھی قبول کرنا تھا۔

عاشر کے تایا اور تائی کی خواہش تھی کہ اگر عاشر، ماہا سے شادی کرتا ہے تو ہی ردا، اعزاز کی بنے گی، ورنہ نہیں۔

شرط مشکل تھی، آزمائش کڑی تھی، لیکن ناممکن نہیں تھی۔ پل بھر تو عاشر صم بکم سا کھڑا

ات کے اس رُخ پر سوچتا رہا، پھر اُس نے رضامندی کے الفاظ ادا کئے اور ردا کو از کا ساتھ دینے کے لئے ماہا کا ساتھ قبول کر لیا۔

ماہا یہ سن کر سکتے میں ہی تو رہ گئی تھی۔

دل میں شدت سے ایک احساس جاگا، کوئی سنے نہ سنے رب العالمین سنتا ہے ہر کی۔ کوئی جانے نہ جانے، وہ جانتا ہے سب کو۔ کوئی ساتھ ہو نہ ہو، وہ ساتھ ہوتا ہے کے۔ انسان اپنی بے یقینی کے خول میں بند پہاڑوں کی چوٹیوں سے چیخ چیخ کر اُسے از دیتا ہے مگر جب رب تعالیٰ کا جواب انتہائی قرب سے آتا ہے تو انسان کو اپنی صدا کی یقینی پہ ندامت ہونے لگتی ہے۔ ماہا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

انتہائی سادگی سے دو نکاح ہو گئے تھے۔ ماہا، عاشر سے منسلک ہو گئی تھی اور ردا، اعزاز سے۔ اُن کے آنگن میں دو خوشیاں اُتری تھیں لیکن ان خوشیوں نے دو دلوں کو آباد کیا تھا۔ عاشر مصلحت کوشی کی چادر اوڑھے زندگی کے بدلتے راستوں کا تعین کر رہا تھا۔ زندگی نے اُسے یوں اچانک کہاں سے کہاں لا کھڑا کیا تھا!

ماہا کے لئے سکینہ چچی نے اپنی پسند سے شاکنگ پنک کلر پسند کیا اور اُس کا عروسی لباس بھی اُسی رنگ کا بنایا گیا۔ ردا نے اپنی پسند سے اعزاز کے ساتھ جا کر سرخ رنگ کی کامدار چولی خریدی۔ رخصتی میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا، لیکن لگتا تھا زندگی ابھی سے خود کو خوشیوں کا عادی بنا رہی ہے۔ ابھی سے زندگی اپنے لئے وہ راستے چن رہی تھی، جو فقط مسکراہٹوں کی طرف جاتے ہوں۔

اُس دن اعزاز اور ردا نے مل کر شادی کی شاپنگ کی۔ یوں تو اعزاز کا گھر ہر طرح کی زیب و آرائش سے مزین تھا، مگر ردا کچھ تبدیلیاں اپنی پسند کی چاہتی تھی۔ خاص طور پر اپنے اور اعزاز کے بیڈروم میں۔

پہلے اُن لوگوں نے اپنے لئے فرنیچر پسند کیا۔ گولڈن رنگ کا خوب صورت ڈیزائن کا فرنیچر، پھر اس کے بعد گلابی رنگ کے دبیز قالین کو سلیکٹ کیا اور گلابی اور گولڈن کے کمبی نیشن کے پردے۔ زندگی کتنے خوب صورت رنگ لے کر آئی تھی۔ ہر چیز نکھری نکھری، بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ شاپنگ کرنے کے بعد وہ اُسی پارک کی طرف آ گئے، جہاں وہ پہلے ملتے تھے۔

انہی مانوس راستوں پر، وہ دونوں ایک بار پھر سے ہم قدم ہو کر چل رہے تھے، مگر اس بار دنیا کا کوئی خوف دل میں نہ تھا۔ کسی سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہ تھی، کسی سے ہچکچانے

کی ضرورت نہ تھی۔ بس وہ تھے اور اُن کے خواب اور چند قدم کی دُوری پر ان خوابوں کی
تعبیر تھی۔ مسکراتے دن تھے، مہکتی راتیں تھیں۔ زندگی کی وہ سمت تھی، جس کا تعین اُنہوں
نے خود ہی کیا۔

"مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا ردا! کہ واقعی ہم ایک ہونے والے ہیں۔ کیا واقعی
جلدی، اس طرح اچانک؟" اُس کے نازک ہاتھوں کو تھامے کسی غیر مرئی نقطے پر آنکھیں
ٹکائے وہ بولا تھا۔

"سچ اعزاز! میں خود اپنے رب کی اس نوازش، اس احسان پہ حیران ہوں۔ نہ ہماری
محبت کا کسی کو علم ہوا، نہ کوئی مشکل آڑے آئی۔ بس سب کچھ اتنی خاموشی، اتنی رازداری
انجام پا گیا۔"

"اس سب میں عاشر بھائی کا بہت بڑا رول ہے۔ سچ، وہ نہ ہوتے تو اتنا آسان
تمہاری فیملی کو منانا۔ اُس دن جتنی اچانک اُنہوں نے مجھے ملنے کے لئے بلایا، میں تو ڈر
گیا تھا۔"

"ہاں اعزاز! عاشر بھائی واقعی ہمارے محسن ہیں اور اُن کا احسان ہم زندگی بھر نہیں
سکتے۔ اُنہی کی بدولت ہم آج یہاں اس جگہ میاں بیوی کے روپ میں بیٹھے ہیں۔" م
خوشیاں تو ردا کے لہجے میں ہی پنہاں تھیں۔

"جب عاشر بھائی سے میری شادی کا حکم بابا نے سنایا تو سچ، میں سرتا پا لرز اُٹھی
لیکن عاشر بھائی نے سبھی کچھ اتنے اچھے طریقے سے ہینڈل کر لیا۔ یہ تو مجھے پتہ تھا کہ
عاشر بھائی کو پسند کرتی ہیں، لیکن یہ علم نہ تھا کہ عاشر بھائی بھی ماہا میں انٹرسٹڈ ہیں۔ تب
اُنہوں نے ہماری بات بنائی تا کہ وہ ماہا باجی کو پا سکیں۔" وہ بڑے وثوق سے بولی۔

"اچھا" اعزاز کو حیرانی ہوئی۔

"ہاں، مجھے تو یہی لگتا ہے۔" ردا نے آنکھیں پھاڑ کے بتایا۔

"پھر تو واقعی گننا پڑے گا۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ۔" اعزاز نے اُنگلیوں پہ
شروع کیا۔

"کیا گن رہے ہو اعزاز؟" وہ حیران ہوئی۔

"بھئی یہ گن رہا ہوں کہ دو محبت کرنے والے جوڑوں کی جدائی کے مزید کتنے دن
ہیں۔" اعزاز کی شرارت نے ردا کے رخسار سرخ ہو گئے تھے۔ اُس نے شرما کے اپنا
دُور ہٹا لیا۔



ماہر میک اپ آرٹسٹ کے ہاتھوں نے دونوں دُلہنوں کے خدوخال کو قدرتی روپ سے
زیادہ خوب صورت بنا دیا تھا۔ ماہا تو یوں بھی سادگی میں ہی پریوں کے سے حُسن کی مالک
تھی، پہلی بار اُس پہ میک اپ نے پھول کھلا دیئے تھے۔ اور ردا، اُس پہ تو جوانی کی پہلی بہار
کا جو رُوپ لائی تھی، وہ رُوپ دُلہن کا رُوپ تھا۔ ننھے منے معصوم خدوخال پہ سجنے والی
سرخیاں اور رنگ۔ وہ تو کسی چاند نگر کی اپسرا کا پرتو لگ رہی تھی۔ روشنی میں نہائی ہوئی،
دُودھیا دمکتی رنگت، ماتھے پہ سجا ٹیکے کا چاند، ننھی سی ناک میں دمکتی نتھ کا موتی اور گلاب
ہونٹوں پر کبھی آتی اور کبھی جاتی مسکان۔ شرم کو چھپاتے اپنے آپ سے اُلجھتے دو نین۔ دل
کے نہاں خانوں میں آنے والے کتنے ہی شریر لمحوں کا انتظار۔

اور ماہا، وہ بظاہر ہر طرح کے احساس سے دُور تھی۔ حالات کے دھارے میں بہہ رہی
تھی، مگر پھر بھی عاشر کا ساتھ ملنے کی اُسے بھی بہت خوشی تھی۔ زندگی نے اُسے تحفہ ہی تو دیا
تھا، مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ عاشر نے اُسے فقط مصلحت کوشی کی بنیاد پر اپنایا ہے۔ اُسے محبت
تو ردا سے تھی، مگر نجانے کیوں اُس نے ماہا سے شادی کر لی اور ردا کی شادی خود اعزاز سے
کرا دی۔

بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر دونوں دُلہنیں گھر جانے والی تھیں۔ ماہا کو اپنے چچا کی گاڑی
میں جانا تھا اور ردا کو اعزاز کی سجی سجائی کرولا میں۔

ماہا کے جانے کے چند منٹ بعد ردا، پارلر سے نکلی۔ پارلر کے دروازے سے گاڑی تک
کا فاصلہ فقط دس پندرہ قدم تھا۔ لیکن ابھی بمشکل دو تین قدم ہی چلی ہوگی کہ دو آدمی دوڑتے
ہوئے آئے اور ردا کو پکڑ لیا۔ اُن دونوں نے چہرے کو مفلر سے چھپایا ہوا تھا۔ دونوں کے
پاس اسلحہ تھا۔ ایک نے تو اپنا ریوالور نکال کر ردا کی پیٹھ پر رکھ دیا، اور دوسرے نے ڈرائیور
پر اپنا پستول تان لیا۔

"خبردار...... جو آگے بڑھا، وہ اپنی موت کا خود ذمہ دار ہوگا۔" ایک آدمی نے سب
کو تنبیہہ کی۔ وہ دونوں ردا کو کھینچتے ہوئے ایک کونے میں کھڑی ایک اسٹیشن ویگن میں لے
گئے۔ وہ خوف سے رونے لگ گئی تھی اور اُس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں بھی برآمد ہو رہی
تھیں۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اُن دونوں کے تیسرے ساتھی نے، جو گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ
پر بیٹھا تھا، گاڑی آگے کی طرف دوڑا دی۔ اُن دونوں میں سے ایک نے ردا کے ہاتھ پشت
پر نائیلون کی رسّی سے باندھ دیئے اور اُس کے منہ کو کپڑے سے باندھ دیا۔ اب وہ فقط

آنسو ہی بہا سکتی تھی۔ وہاں شادی ہال میں سب کے سب ردا کے منتظر تھے۔ امی، بابا، اعزاز۔

جس کا انتظار فقط چند لمحوں پہ نہیں، سالوں پہ محیط تھا۔ اور لگتا تھا کہ یہ سال کبھی ختم ہوں گے۔

گاڑی ایک انجانے راستے کی طرف رواں دواں تھی۔ اور پھر تقریباً بیس منٹ کے بعد ایک چھوٹی سی بستی کے ایک پرانے مکان کے باہر گاڑی رُکی۔ اُن دونوں میں۔ ایک شخص نیچے اُترا اور ردا کو گھسیٹتا ہوا اُس گھر کے اندر لے گیا۔ اندر ایک کمرے میں لے کر اُسے ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پہ دے مارا۔ وہ کسی بے جان چیز کی طرح چارپائی پہ گئی۔ چوڑیاں اور ہزاروں طرح کے زیور شور مچا اُٹھے۔ وہ بھی سراپا احتجاج تھے۔ اس دُلہن کو تو سجی سجائی، مہکتی سیج پہ ہونا چاہئے تھا، نہ کہ اس بوسیدہ چارپائی پہ۔ چہرے کی رونق بنا میک اپ آنسو بہہ بہہ کر ٹپکنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ایک قدرے فربہ عورت اندر داخل ہوئی۔ وہ شکل سے ہی خطرناک لگ رہی تھی۔ وہ دو مردوں سے اکیلی مقابلہ کرنے کے لئے کافی تھی۔ وہ ردا کے قریب آئی اُس کے نرم و نازک چوڑیوں والے بازو کو گھسیٹا۔ کتنی ساری چوڑیاں چھنک اُٹھی تھیں۔ اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا انجکشن اُس کے بازو میں لگا دیا اور پھر اُس کے پشت بندھے ہاتھ کھول دیئے اور اُس کے منہ پہ بندھا کپڑا بھی۔ وہ کراہ کے رہ گئی تھی۔ انجکشن کے درد کا تو اُسے احساس ہی نہ ہوا۔ دل کا درد اتنا زیادہ تھا کہ آنسو اُمڈ اُمڈ کے اُس کے رخساروں پر گر رہے تھے۔

میرا اعزاز...... میرے دل کی دھڑکن، میرا انتظار کر رہا ہوگا...... نہ جانے خواب سجا رکھے ہوں گے اُس نے اس رات کے متعلق...... کتنی باتیں اپنے دل میں سنبھال رکھی ہوں گی، آج کی رات کرنے کو...... جب اُسے پتہ چلے گا کہ اُس کے خواب بکھر چکے ہیں تو کیا سوچے گا وہ؟ اس سیج کے پھولوں کا کیا ہوگا، جسے اُس نے خود تھا۔ وہ پھول اُس کے دل کے ارمان تھے، اُس کی آنکھوں کی پتلیوں پہ سجے خواب تھے۔

وہ رو رہی تھی۔ روتے روتے اُس پہ غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اُسے لگا جیسے وہ نشے کے عالم میں ہو۔ یقیناً وہ انجکشن نیند کا تھا۔ بے ہوشی کی دبیز گہرائی میں اُترنے اُس کی آنکھوں میں جس چہرے کا تصور آیا، وہ اعزاز حسن کا چہرہ تھا۔

"اُٹھ جا...... اری او نواب زادی! اُٹھ جا۔"

ردا کی آنکھ کھلی تو اُس کے سامنے وہی عورت تھی، جسے اُس نے کل یہاں اس جگہ پر دیکھا تھا۔

تو کیا وہ حقیقت تھی؟...... اُس کا اغواء ہونا اور یہاں بندی خانے میں قید ہونا؟ کاش! یہ سب خواب ہوتا۔ کوئی بھیانک خواب۔

اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔ لیکن وہ خواب نہ تھا، حقیقت تھی۔ اور وہ انتہائی خطرناک عورت اُس کے اوپر جھکی اُسے اُٹھا رہی تھی۔

"اُٹھتی ہے یا لگاؤں دو ہاتھ۔" اُس عورت نے اُسے جھنجھوڑ کر چارپائی پہ بٹھا دیا۔

"کون ہو تم لوگ؟...... کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟" وہ چلا اُٹھی۔

"ابھی پتہ لگ جاتا ہے، شہزادی کو کہ ہم کون ہیں۔ ذرا چھری تلے دم تو لے لو...... میرا نام شنو ہے۔ شہناز۔ امجد کی ماں ہوں میں۔ وہی امجد کریانے والا، جس کا رشتہ لائی تھی میں تمہارے لئے۔"

اُس کے کانوں میں ایک شور سا گونجنے لگا۔ تو کیا اُسے واقعی امجد کریانے والے نے اس طرح اغواء کروایا ہے؟...... بظاہر وہ ایک معمولی سا لوفر لگنے والا شخص اس قدر خطرناک ہو سکتا ہے؟

"ہم بے شک زمانے میں بدنام ہیں، لیکن تجھے بڑی شرافت سے بیاہنے آئے تھے۔ مگر ہماری شرافت کسی کو راس نہیں آئی اور پھر مجبور ہو کے ہمیں بے ایمانی پر اُترنا پڑا ہے۔" وہ عورت بڑے ناز سے بولی۔

"کیوں لائے ہو مجھے یہاں پہ؟...... کیا مقصد ہے تم لوگوں کا؟" وہ اچانک ہی بہت بہادر ہو گئی تھی۔

"تجھے اُٹھوایا ہے۔ حاصل تو تیرے ذریعے بہت کچھ کر سکتے ہیں ہم۔ لیکن یہاں بات اور ہے۔ تیری قسمت ہے شہزادی! کہ تُو میرے بیٹے کو پسند آ گئی ہے۔ اور میں اپنے بیٹے کو روتا ہوا کبھی نہیں دیکھ سکتی۔ اس لئے تجھے اُٹھوا لیا۔ ویسے شہزادی! تمہارے زیور ڈھائی تین لاکھ سے کم کے نہیں ہوں گے۔ امجد ابھی لاتا ہوگا اُن کی قیمت۔"

ردا نے اپنے ہاتھوں، گلے اور کانوں کو چھوا۔ کل جو زیور اُس کے سراپے پہ روشنیوں کی طرح جگمگا رہے تھے، آج کچھ بھی نہ تھا۔

"تم لوگوں کو جتنے پیسے چاہئیں، میرے بابا تمہیں دے دیں گے۔ خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔" ردا نے روہانسے لہجے میں التجا کی۔

''چھوڑ دیں۔ ارے ایسے کیسے چھوڑ دیں؟ اتنی مشکل سے تو لائے ہیں ادھر تمہیں
تمہیں تو میری بہو بننا ہے۔ ابھی ایک دو دن کے اندر اندر شادی کرنی ہے تمہیں ا
سے۔'' اُس عورت نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''میری شادی ہو چکی ہے۔ پڑھوا چکی ہوں میں نکاح اعزاز حسن سے۔'' وہ اُٹھ
کھڑی ہوگئی اور بلند آواز میں چیخنے لگی۔
''کیا نام بتایا تم نے، ہیں۔ اعزاز حسن۔ اُسی کو تو فون کیا تھا کل امجد نے اور
کہ......'' شنو کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔
''کیا بتایا اُس نے اعزاز کو؟'' ردا تڑپ کے شنو کے پاس آگئی۔
''میں بتاتا ہوں کہ میں نے کیا کہا تمہارے شوہر حضور کو۔'' اچانک کمرے میں
داخل ہوا۔ اپنی آوارہ صورت اور مکار ارادوں کے ہمراہ۔ اس صورت سے ردا کو ہمیشہ
نفرت رہی تھی۔
''میں نے اُس سے یہی کہا کہ تم جسے اپنی سہاگ رات کو بانہوں میں بھرنے کو
رہے ہو، وہ میرے پاس ہے۔ وہ میرے ساتھ اپنی مرضی سے آئی ہے، اُسے کوئی زبر
نہیں لایا۔'' اپنے لہجے میں تمام مکاری و عیاری کو سمیٹ کر امجد بولا اور ردا سکتے کی
کیفیت میں کھڑی سنتی رہی۔
''عنقریب اعزاز حسن طلاق کے کاغذات پہ دستخط کر دے گا اور پھر میں تجھ سے ا
پڑھوا کے تیرا سارا گھمنڈ اُتار دوں گا۔ گھمنڈ تو تمہارا میں ایسے بھی اُتار سکتا ہوں، لیکن
بار میں خود بھی شادی کا مزہ لینا چاہتا ہوں۔'' وہ ذومعنی انداز میں ہنسا۔
''بکواس بند کر کمینے!...... میں تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے د
گی۔ نہیں کریں گے اعزاز یقین تمہارا۔ اگر تُو نے مجھے ہاتھ بھی لگانے کی کوشش کی ا
جان لے لیں گے تمہاری۔'' ردا چلاّ اُٹھی اور اُس کی چیخیں اس بوسیدہ کمرے کے درو
میں گونج اُٹھیں۔
''جان تو وہ تب لے گا ناں، جب اُسے پتہ ہوگا کہ میں کدھر ہوں۔ میں تو تمہیں
علاقے میں لایا ہوں، جہاں اُس کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔''
امجد یہ کہہ کر کمرے سے چلا گیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ کمرے میں لگی لکڑ
اکلوتی کھڑکی بھی بند تھی۔ بس اُس کے ٹوٹے پھوٹے کواڑوں سے دوپہر کا سورج ز
اندر گھس آیا تھا۔



''مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا ماہا! کہ ردا ایسا کر سکتی ہے......''
''اور مجھے یقین ہے عاشر! کہ ردا نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اُسے اغواء کیا گیا ہے۔ وہ
ا مرضی سے کہیں نہیں گئی۔'' ماہا نے عاشر کی بات درمیان سے کاٹی تھی۔
''لیکن وہ فون...... ہم اُس لڑکے کے بیان کو کس طرح نظرانداز کر سکتے ہیں؟ میں
لہ تو اُس کی اعزاز حسن سے شادی میں درپیش رکاوٹ کو دُور کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے
یا پتہ تھا کہ وہ اُس آوارہ لڑکے کے ساتھ......'' عاشر کے لب و لہجے میں غصے کے ساتھ
اتھ نفرت بھی تھی۔
''عاشر! آپ سب لوگ ردا کو مس انڈر اسٹینڈ کر رہے ہیں۔ محض ایک فون کال کی بناء
ماہا نے ردا کی تلاش بھی رُکوا دی ہے۔ گھر کے بھی لوگ اُسے کوسے جا رہے ہیں، گالیاں
یے جا رہے ہیں۔ پتہ نہیں ردا کہاں، کس حال میں اور کس کے پاس ہوگی؟ مجھے پتہ ہے
لہ میری بہن کبھی اتنا گر نہیں سکتی۔ اُسے اعزاز حسن سے محبت تھی اور صرف اُسی سے ہے۔
ں نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا، جس سے اُس کی یا اُس کے خاندان کی عزت داغدار
ا۔'' ماہا کے اندر بل کھاتی بہن کی بے پناہ محبت بول پڑی۔
کچھ دیر ماحول میں گمبھیر خاموشی رہی۔ کمرے سے باہر اور اندر کا ماحول دونوں یکساں
لت میں تھے۔ تین دن پہلے ماہا کی رخصتی ہوگئی تھی لیکن ان دونوں کے اندر تو کیا، گھر
لہ کسی فرد کے اندر بھی وہ شادی والی مسرت نہ تھی۔ ہر کسی پر ایک اُداسی، ایک سوگ
اری تھا۔
اور اعزاز حسن۔ اُس کی تو کائنات لٹ گئی تھی۔ کتنے ارمانوں اور اُمیدوں سے وہ
رات لے کر گیا تھا۔ اُسے یہ رات تو کائنات کی خوب صورت ترین شے لگ رہی تھی اور
ں رات اُس کے ارمانوں کا گلشن قسمت نے اتنی بے رحمی سے نوچ ڈالا تھا۔ ردا پہ اعتبار
ل جگہ لیکن اُس کا یوں اچانک غائب ہونا اور پھر اُس لڑکے کی فون کالز، ردا کے عروسی
اس کا واپس آنا۔ یہ سب کیا تھا؟ سوچ سوچ کر اُس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ دل بھی
ماننے سے انکار کرتا اور دماغ سوچ سوچ کے ہار چکا تھا۔ محبت تھی، اعتبار تھا......
مگر اس محبت اور اس اعتبار کو کتنے ہی خدشوں اور سوالوں کے سانپ جکڑے بیٹھے
جن کی گرفت ہر گزرتے پل کے ساتھ مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔
اگر اُسے ردا کی بے وفائی کا یقین آجاتا تو شاید اُسے بھولنا مشکل نہ تھا۔ لیکن یہ یقین

آنا بھی تو کیسے کہ وہ خود منظر پہ نہ تھی۔ اور پس آئینہ ہو جانے والی باتیں کہاں قابل ہوتی ہیں۔

دل رہ رہ کے دھڑک اُٹھتا۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی، کہاں ہوگی، کیا بیت ہوگی اُس پر؟ اُس کی معصومیت، اُس کی عصمت، اُس کی پاکیزگی........ اُس کی ردا، آنچ تو نہ آئی ہوگی۔ وہ ویسی ہی ردا ہوگی۔ ہنستی کھلکھلاتی، خواب دکھاتی۔ اور پھر دل دھڑ کا چین وسکون سب چھین لیتا۔ نارسائی کہیں نہ چھوڑتی۔

"کہاں ہو تم؟........ تمہارے سوا کچھ نہیں........ کچھ بھی نہیں۔" گرم گرم آنسو آنکھ سے نکل رہے تھے اور بڑھی ہوئی شیو کے کھردرے بالوں میں راستہ بناتے گردن میں جذب ہو رہے تھے۔



اُس کے دُبلے دُبلے جسم پہ شنو کا ڈھیلا ڈھالا کُرتہ تھا۔ اُس کا عروسی لباس نہ جانے کس وجہ سے دو روز قبل تبدیل کروایا گیا تھا۔ اتنے دنوں سے اُس نے کچھ نہ کھایا۔ بھوک کا احساس ہی نہ تھا۔ احساس تو کسی چیز کا نہ تھا۔ نہ گرمی کا، نہ نیند کا اور نہ زندگی۔ اس گرم، بوسیدہ، آسیب زدہ کمرے میں وہ روتی، بلکتی، جھنجلاتی اور اسی طرح سو جا... جب اُٹھتی تو پھر وہی اذیت بھرے لمحے اُس کا سامنا کرنے لگتے۔ شنو اُسے کھانا دینے آتی اور امجد التجائیں کرنے کہ وہ شادی کے لئے راضی ہو جائے۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا زبردستی وہ مُردہ ردا تو پا سکتا ہے، لیکن ایک زندہ، مسکراتی، اپنے حُسن کا جادو بکھیرتی ر... نہیں۔ آج بھی وہ کچھ کاغذات لے کے اُس کے کمرے میں آیا تھا۔

"اس پر دستخط کر دو۔" وہ ردا سے مخاطب تھا۔

"کیا ہے یہ؟" اُس نے کاغذات لئے بغیر سوال کیا تھا۔

"یہ تمہارے اعزاز حسن کے لئے موت کا سرٹیفکیٹ ہے اور میرے لئے زندگی کا۔ طلاق کے کاغذات ہیں۔ یا پھر نوٹس کہہ لو۔" وہ عیاری سے مسکرایا۔ ردا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"میں ان پر سائن نہیں کروں گی۔ مار بھی ڈالو تو نہیں کروں گی۔" وہ چیخی۔

"تمہیں کیوں ماروں گا میں؟ تمہیں مارنا ہوتا تو اتنے پاپڑ کبھی نہ بیلتا۔ تمہیں تو ... رکھنا ہے۔ مارنا تو تمہارے اعزاز حسن کو ہے۔ اگر تم نے سائن نہیں کئے تو........" امجد ... چہرے پہ بچھی مکروہ مسکراہٹ ردا کی جان لے رہی تھی۔

"خبردار، جو اعزاز کو کچھ کہا تو۔" وہ چلاّ اُٹھی۔

"تو پھر سائن کرو۔" وہ بھی چلاّیا۔

"تم مجھ سے چاہے سو کاغذات پر سائن کروالو۔ اعزاز مجھے کبھی طلاق نہیں دیں گے۔ وہ تمہارا کبھی یقین نہیں کریں گے۔" وہ بے بسی کی انتہا پہ پہنچ کر بھی مضبوط تھی۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں اُسے کسی چیز کا یقین دلانے کی نواب زادی! میں چاہوں تو نکاح کے اوپر نکاح کر سکتا ہوں۔ ویسے مجھے نکاح کی بھی کوئی ایسی مجبوری نہیں۔ لیکن تم سے شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں۔ اسے میری مجبوری کہہ لو تو کہہ سکتی ہو۔" امجد انتہائی ڈھیٹ لہجے میں گویا ہوا۔

"تم چاہے کچھ بھی کر لو۔ تمہاری کوئی خواہش پوری نہیں ہوگی۔ کبھی نہیں........ کبھی نہیں۔" وہ چیخ چیخ کر تھک چکی تھی، قدرے مدھم لہجے میں بولی۔

"تو تم چاہتی ہو کہ میں اعزاز حسن پر قاتلانہ حملہ کراؤں۔ یاد رکھ! جو شخص کسی کو اغواء کر سکتا ہے، وہ قاتلانہ حملہ بھی کروا سکتا ہے۔ یہ جو میری ماں ہے ناں شنو، اس کے تعلقات دُور دُور تک ہیں۔ اسے میرے فقط ایک اشارے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

ردا کو حیرت ہوئی کہ ایک جوان بیٹا اپنی ماں کے تعلقات کا ذکر اتنے فخر سے کر رہا ہے۔ لیکن یہ لوگ ایسے ہی تھے۔ تہذیب انہیں چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ لحاظ کا دُور دُور تک بھی گزر نہ تھا اُن کے گھروں میں۔ وہ رو رو کے تھک چکی تھی۔ انجانوں میں ظالموں کی بستی تھی۔ اپنا کوئی نہ تھا، سوائے اُس رب پاک کی ذات کے، جس کے عظیم احسان سے اُس کی ردا ابھی تک اُس کے آنچل میں تھی۔ وہ ابھی تک محفوظ تھی۔ اُسے اپنے ربّ پہ یقین تھا اور یہ یقین ہی اُس کا آخری سہارا تھا۔



اُسے اس زنداں کی قید میں ایک ماہ بیت چکا تھا۔ اب اس فضا کی اُسے عادت ہو گئی تھی۔ وہ صبح کا کوئی پہر تھا۔ وہ اُٹھی تو اُس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اُس نے اردگرد نظر دوڑائی، کونے میں ایک ٹوٹی پھوٹی میز پہ پلاسٹک کا جگ رکھا تھا۔ وہ اُٹھی، اپنے کمزور جسم کو گھسیٹتی اُس جگ تک آئی۔ لکڑی کی کھڑکی نیم وا تھی۔ اُس کی زنگ آلود سلاخوں کے پیچھے کسی کی آواز تھی۔ وہ تجسس کے مارے کھڑکی کے کچھ اور نزدیک آئی۔ شنو اپنے بیٹے سے پنجابی میں مخاطب تھی۔

"بہت ہو گیا اجے! کب تک اُس کو اس طرح چھپا کے رکھے گا؟ کر لے تُو جو کرنا

ہے۔ نہیں مانتی تو نہ مانے۔ تُو کوئی اُس کا نوکر لگا ہے۔"

"پر اماں! تُو جانتی ہے، میں اُس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔"

"دفع کر نکاح کو۔ پہلے کتنیوں سے نکاح کروا چکا ہے تُو۔ میں تو کہتی ہوں، تُو اپنے کر اور اقبالے کو بلا کے اُسے پشاور بھیج دے۔ دلاور خان اُس کی اچھی قیمت دے گا۔" کا لہجہ ردا کو اندر سے توڑ پھوڑ گیا۔ وہ عورت ہو کے عورت کے لئے ایسا سوچ رہی تھی سفاک تھی وہ۔ کیا واقعی وہ کسی کی بیٹی اور بہن رہی ہوگی؟ کیا واقعی وہ کسی کی ماں ہے؟

"اماں! اُسے اگر بیچ کے اُس قیمت ہی وصولنی ہوتی تو میں اُسے کب کا بیچ چکا پیار کرتا ہوں میں اُس سے۔ شادی کرنی ہے مجھے۔" امجد نے قدرے اونچی سرگوشی کی۔

"تو ٹھیک ہے۔ بھرتا رہ اسی طرح ٹھنڈے ساہ۔ وہ نگوڑی مرجائے گی پر تجھ سے نہیں کرے گی۔ خوامخواہ پولیس کو یہ جگہ دکھائے گا تُو۔ وہ اعزاز چھوڑے گا تینوں؟" اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔

"بس اماں! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ آج میں مولوی کو یہیں لے آتا ہوں۔ تُو تیار کر لینا۔ کھلا پلا دینا۔ آج ہی شادی کر کے ہم آج ہی کوئٹہ کے لئے نکل جائیں۔" امجد اپنا فیصلہ سنا کر جانے لگا۔

"کتھے جا رہا ہے تُو؟" شنو نے اُسے عقب سے آواز دی۔

"کچھ انتظام کرنا ہے۔ دین محمد سے پیسے اُدھار لیتا ہوں۔ شکورے کو کہتا ہوں، م لے آئے۔ اور کل کے لئے ٹکٹ بھی کرواتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ گھر سے باہر چلا گیا۔

ردا اپنی چارپائی پہ آ کے بیٹھ گئی۔ وہ اُن کے ارادے جان چکی تھی۔ اُسے جو کرنا ابھی اور اسی وقت کرنا تھا۔ ورنہ یہ لوگ اُسے مجبور کر کے نکاح کے لئے ہاں کروا دیتے پھر نہ جانے کہاں لے جاتے۔ کیا کرتے؟ اُس نے اعزاز کی ردا کے ساتھ ایسا کچھ ہونے نہیں دینا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

گھر میں صرف شنو تھی لیکن وہ عورت نہ تھی۔ وہ غیر معمولی طاقت رکھنے والی م تھی۔ اور اُس کا مقابلہ کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لیکن جو بھی تھا، اُسے آج یہاں نکلنا تھا۔

"اُٹھ جا شہزادی! کھانا کھا لے۔ آج تیری شادی ہے دوسری۔ خوب ڈٹ کے کھا کوئی کسر نہ چھوڑنا۔" شنو نے کھانے کی ٹرے اُس کی چارپائی پر رکھی اور واپس جانے لئے مڑی۔ ردا نے آلو کی بھجیا کے سالن کی کٹوری اُٹھائی اور پھرتی سے شنو کے سامنے

سالن شنو کے چہرے پر پھینک دیا........ اس اچانک وار سے شنو لڑکھڑا گئی۔ گرم گرم مرچوں والا سالن چہرے اور آنکھوں میں گیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گر گئی۔ ردا نے اُسے فوراً اپنی پوری قوت سے اُٹھانے کی کوشش کی۔ وہ ایک مضبوط جسم کی مالک طاقت ور عورت تھی۔ اُس نے خود کو بچانے کے لئے ردا کو دھکا دیا اور نازک پھول جیسی ردا دُور ہو گئی۔ لیکن اُس پر بھی جنون سوار تھا، سو وہ بھی اس وقت بہت طاقت ور تھی۔ فوراً اُٹھی اور شنو کو دبوچ لیا۔ چارپائی کی پائنتی والی رسّی پہلے ہی ردا نے نکال لی تھی۔ اُسے فوراً اُٹھا کے ردا نے شنو کو باندھنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد شنو پوری طرح چارپائی سے بندھ چکی تھی۔ اور اب ردا کے لئے بے ضرر تھی۔

ردا نے اُس پہ نفرت بھری نظر ڈالی۔ اس کے کچھ ہی دیر پہلے کہے الفاظ اُس کے ذہن میں گونج گئے۔ وہ کمرے سے باہر آئی۔ مٹی کے چولہے کے اندر جلتی لکڑیاں تھیں اور پاس ہی کچھ اور سوکھی لکڑیاں۔ ردا نے ایک موٹی ڈنڈی اُٹھائی اور واپس شنو کے پاس آئی، جس کا چہرہ اور آنکھیں ابھی جلن سے دُکھ رہی تھیں۔

"بیچنا چاہتی تھی ناں تُو مجھے ذلیل عورت! قیمت وصولنا چاہتی تھی ناں میری۔ اگر تیری کوئی بیٹی ہے تو خدا کرے اُسے کوئی خرید لے سات سات ہزار میں۔ خدا تیرے کئے کا ضرور حساب لے گا۔ قیامت کے روز نیلی آگ کا ایندھن بنے گی تُو۔"

ردا پوری قوت سے اُسے ڈنڈی مار رہی تھی اور چیخ چیخ کر اُسے بددُعائیں دے رہی تھی۔ اب وہ اپنے دل کا ارمان نکال چکی تو ڈنڈی وہیں پر پھینک کر کمرہ بند کر کے اس گھر سے باہر نکل آئی۔ یہ گھر کسی کچی آبادی کا حصہ تھا۔ گلی میں زیادہ لوگ نہ تھے۔ وہ اپنی پوری رفتار سے بھاگتی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے گزرتی ہوئی ایک پکی سڑک تک آئی۔ دُور سے آتی ایک بس رکوا کے اُس میں سوار ہو گئی۔



"ماہا باجی........!" الگنی پہ گیلے کپڑے ٹانگتی ماہا کی سماعت سے ایک آواز ٹکرائی۔ اُس کا دل دھڑکا۔ جیسے ہی اُس نے دیکھا تو اپنی آنکھوں کے سامنے ردا کو پایا۔ اپنی نازوں پلی، گڑیا سی بہن ردا کو۔ میلے کچیلے زرد کپڑوں میں سانولا کملایا سا چہرہ۔ بکھرے بال۔ رویا رویا چہرہ۔ ماہا کو اپنی بصارت پہ یقین نہ آ رہا تھا۔ وہ دوڑ کر اُس سے لپٹ گئی۔

"ردا! .... کہاں تھی تُو میری جان؟....... کتنا یاد کیا میں نے تجھے۔" وہ اُس کے چہرے، بالوں اور ہاتھوں کو چومے جا رہی تھی۔

"ماہا باجی! مجھے خدا نے بچالیا ہے۔ پتہ نہیں کس ظلم کی بستی سے بچ کر آئی ہوں،
تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

"چل۔ تُو اندر چل۔ سب سے مل۔ آرام سے بیٹھ کے بات کروں گی تم سے
اُسے لے کر اندر آنے لگی۔

"ٹھہرو!" اچانک ایک آواز نے اُن دونوں کے قدم روک دیئے۔ وہ بابا تھے
کے اور ماہا کے بابا۔

"اس کی اس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔" بابا کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ وہ دونوں حیرت سے
جملے اور اس لہجے کو سن رہی تھیں۔

"کہہ دو اسے، جہاں بھاگ کر گئی تھی، وہیں چلی جائے۔" بابا غصے سے بولے۔

"بابا! میں کہیں اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی۔ خدا کی قسم! مجھے اُٹھوایا تھا اُس لڑ
نے۔ میں بے قصور ہوں بابا!" ردا نے التجا کی۔

"ہونہہ...... بے قصور۔ تم جیسی آوارہ لڑکیاں جب بھی کسی لڑکے سے عشق کی
بڑھاتی ہیں تو ہر انجام سے بے خبر ہوتی ہیں۔ لڑکا چاہے غنڈہ ہو، چاہے لوفر، اُنہیں ا
خوابوں کا شہزادہ ہی لگتا ہے۔ اپنے شہزادے کے ساتھ مہینہ رہ کر آئی ہو۔ اور جب اُ
اصلیت تم پہ کھل گئی تو واپس بھاگ آئیں اپنی بے گناہی ثابت کرنے۔" بابا کے الفاظ
نشتر، جو اُس کی رُوح میں پیوست ہو کر اُسے لہولہان کر رہے تھے۔

"بابا!...... ایسی کوئی بات نہیں بابا! ردا نے ایسا کچھ نہیں کیا۔" ماہا بھی سراپا التجا تھی

"تم چپ رہو ماہا!...... ہم نے دنیا دیکھی ہے۔ بھانت بھانت کے لوگوں میں
سیکھا ہے۔ اس لڑکی کے کرتوت ہم پہ اُسی دن آشکارا ہو گئے تھے، جب اُس آوارہ لڑکے
ماں اس کا رشتہ لے کر آئی تھی...... اسے کہہ دو، نکل جائے یہاں سے۔" بابا کی ا
دروازے کی طرف تھی۔ گھر کے سبھی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ امی کی آنکھیں اشک بار تھیں
سینہ اپنی لاڈلی بیٹی کو چمٹانے کے لئے بے قرار۔ چچا اور چچی خاموش تماشائی بنے کھڑے
تھے۔ ماہا کی آنکھیں آنسوؤں سے تر بہ تر تھیں۔ اور عاشر، ردا کو عجب حیرت ناک آنکھ
سے دیکھ رہا تھا۔

ردا اپنے وجود کا بوجھ اُٹھاتی اپنے والد کے پاس آئی۔

"بابا! میں بے قصور ہوں۔ میں ویسی ہی ہوں، جیسے پہلے تھی۔ میرا یقین کریں بابا
وہ رو رہی تھی۔ مگر ابا کے دل میں اُس کے لئے ہمدردی کی کوئی پرچھائیں نہ تھی۔ وہ

ذلت انداز میں کھڑے تھے۔ ردا اپنے پیارے چچا کے پاس آئی۔ وہ چچا، جو اُس پہ آنچ
بھی نہ آنے دیتے تھے۔

"چچا جی! میں نے کچھ نہیں کیا...... میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔"

انوار صاحب کے دل میں ہزار نرم گوشے ہوں، مگر وہ بھی بھائی کے فیصلے کے آگے
مجبور تھے۔ گردن جھکائے کھڑے رہے۔

"عاشر بھائی! بابا سے کہیں ناں، مجھے گھر سے نہ نکالیں۔ میں بے قصور ہوں۔" وہ
عاشر کے سامنے بھیک مانگنے والی آنکھوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ یہ لڑکی عاشر کی محبت تھی،
اس کے دل کی دھڑکن تھی، اُس کے جواں دل کی تشنہ خواہش تھی۔ مگر سفاک وقت نے
اسے بہت دُور کر دیا تھا۔ اب وہ اُس کے لئے صرف ایک عام سی لڑکی تھی۔

وہ چپ رہا۔ کسی کی آنکھوں میں ردا کے لئے پیار نہ تھا۔ کوئی زبان اُس کی اپنی نہ تھی۔

"اگر تھوڑی دیر اور یہ لڑکی مجھے اپنی دہلیز پہ نظر آئی تو خدارا، ہم جان دے دیں گے۔"

ابا سفاک لفظوں کے تیر چلاتے اپنے کمرے میں گئے۔ ردا اپنی ماں کے پاس آئی۔

بے قرار ماں نے اُسے پکڑ کر سینے سے لگا لیا۔ ماہا بھی اُن کے قریب آ گئی۔

"ماہا! ردا کے کچھ کپڑے اسے دے دو۔" ماہا فوراً اندر چلی گئی۔

"ردا! تم اعزاز کے پاس جاؤ۔ وہ تمہارا شوہر ہے۔ ضرور تمہیں قبول کر لے گا۔ میں
تمہارے بابا کو منانے کی کوشش کروں گی۔" ماں کی آنکھیں نم ناک تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ اپنا مختصر سا سامان اُٹھائے اس گھر کے آنگن سے باہر آ گئی، جس گھر
کے آنگن نے سترہ سال تک اُس کے خوابوں کو سنوارا تھا، چلنا سکھایا تھا، اُس کی شرارتوں
سے ہر سُو رونق ہوتی تھی، وہی آنگن پل بھر میں اُس کا دشمن ہو گیا تھا۔

وہ دروازے سے باہر آئی ہی تھی کہ عاشر اپنی گاڑی لے کر اُس کے سامنے رک گیا۔

"بیٹھو! تمہیں اعزاز حسن کے گھر چھوڑ دیتا ہوں۔" وہ اب بھی ہمدرد تھا، مگر اُس کی
ہمدردی ردا کے درد کا مداوا بھلا کہاں کر سکتی تھی؟ ٹوٹا ہوا ہاتھ بھی کام کر سکتا ہے، بکھرا ہوا
دانہ بھی جڑ سکتا ہے، مگر ٹوٹا اعتماد انسان کو بھی توڑ دیتا ہے۔

ردا کو اپنے پیاروں پہ مان تھا، اور اُس کا مان ایسی بری طرح سے ٹوٹا تھا۔

اب دل کی فقط ایک ہی اُمید تھی، اعزاز حسن۔ اور یہ اُمید ردا کے دل کی دھڑکن تھی۔

وہ اعزاز سے محبت کرتی تھی۔ ٹوٹ کے، شدت سے۔ حالات کی آندھیوں نے بھی یہ
محبت ختم ہونے نہ دی تھی۔ وہ اب بھی اعزاز کی تھی۔ اُسی کے لئے تھی۔ اگر اُسے اعزاز

نے نہ اپنایا تو وہ یقیناً مر جائے گی۔



وہ اُس کے سامنے تھی۔ عرصے بعد۔ اُس کا آنکھوں پہ اعتبار کرنا مشکل سا تھا۔
یقینی تھی۔ اور ردا، وہ تو اعزاز کو اپنے سامنے دیکھ کر ہر ضبط کھو بیٹھی۔ دوڑ کے اُس سے لپٹ
گئی۔ ہونٹ خاموش تھے۔ نظر چپ تھی۔ دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ اُس کا اعزاز۔
کے دل کی دھڑکن چپ تھی۔ دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ وہ اپنے آپ پہ قابو نہ پا سکی
بھول گئی کہ عاشر اُس کے عقب میں کھڑا ہے۔ عاشر اس منظر کو کتنی اذیت سے دیکھ رہا تھا
یہ وہی جانتا تھا۔ دل پہ اِک طوفان سا آ گیا تھا۔ ذہن میں ایک دُھند کا پردہ سا چھا رہا تھا
نجانے ابھی اور کیا تھا دیکھنے کو قسمت میں۔

ردا نے محسوس کیا کہ اُس کی وارفتگی کے نتیجے میں اعزاز کی طرف سے خاموشی ہے۔
اعزاز کے کندھوں سے لپٹی ضرور تھی مگر اعزاز کے ہاتھوں نے اُسے نہیں تھاما تھا۔ وہ پہلے کی
طرح کھڑا تھا۔ خاموش، گہری سوچ میں گم۔ ردا نے گردن اُٹھا کر اُس کے چہرے کو دیکھا
وہاں شناسائی کے سائے بہت تھوڑے تھے۔ بے تاثر چہرے پر کوئی خوشی کی رمق نہ تھی۔
کی آخری اُمید کتنی تیزی سے ٹوٹی تھی۔ اعزاز اُسے اپنے سے الگ کرتا عاشر کی جانب بڑھ
گیا۔ وہ کمرے میں تنہا رہ گئی۔ اپنی نارسائی پہ اشک بہاتی۔

کچھ دیر بعد دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد اعزاز اندر آ گیا۔ ردا پُر اُمید آنکھوں
سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم ردا! کہ تم پہ کیا بیتی ہے، تم کہاں تھیں؟ تم اپنی مرضی سے گئی تھیں
نہیں، مجھے کچھ نہیں پتہ۔ لیکن پھر بھی میں اپنی طرف سے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔"
اعزاز کا لہجہ بھی اُس کے چہرے کی طرح بے تاثر تھا۔

"اعزاز! کم از کم آپ تو میرا یقین کریں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں ابھی بھی آپ کی
امانت ہوں۔ نہ میں اپنی مرضی سے گئی تھی اور نہ مجھے کچھ علم تھا۔ میں اُس کمینے شخص کی قید
میں بہت برے دن گزار کر آئی ہوں۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ مجھ پہ کیا بیتی ہے۔" ردا
کے اشک تھم نہیں رہے تھے۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ اُس جیسے کمینے شخص کی قید میں مہینہ بھر رہ کر تم اپنی عزت کی
حفاظت کس طرح کر سکتی تھی؟ جب اُس نے وہ عروسی لباس مجھے بھیجا تھا تو فون پہ یہی کہا تھا
کہ ردا کے تن سے میں نے تمہارے نام کے جوڑے کو اُتار پھینکا ہے۔ کیسے میں یقین

لوں تمہارا ردا!" وہ دھیمے مگر ترش لہجے میں بولا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوا اعزاز! میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں؟ میرے رب پاک نے میری
آبرو کی حفاظت کی ہے، آپ کے لئے۔ نہ جانے کون سی نیکی کام آ گئی تھی کہ وہ ظالم
میرے قریب تک نہ آیا۔ میں نے اُس کے چنگل سے خود کیسے آزاد کروایا ہے، یہ میں ہی
جانتی ہوں۔ بابا نے اپنانے سے انکار کر دیا اعزاز! میں چپ رہی۔ چچا نے یقین نہیں کیا،
میں سہہ گئی۔ لیکن آپ کی بے اعتباری میں برداشت نہیں کر پاؤں گی اعزاز!...... میں مر
جاؤں گی۔" ایک ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح وہ فرش پہ دو زانو ہو کر بیٹھ گئی اور زار و قطار
آنسو بہانے لگی۔

"اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی ہمارے بیچ کا رشتہ برقرار ہے۔ تم میری بیوی ہو۔
ثبوت کے بغیر تو ہمارا دین بھی سزا دینے سے روکتا ہے۔ یہ گھر تمہارا ہے، اس پر تمہارا حق
ہے۔ یہاں رہو، کھاؤ، پیو، لیکن مجھے کچھ وقت دو پلیز!"
قدرے ہمدردانہ لہجے میں کہتا ہوا اعزاز حسن کمرے سے باہر چلا گیا۔
اور وہ قسمت کے ان اچانک ہونے والے چند سفاک واقعات کو یاد کر کے آنسو
بہانے لگی۔



کتنے دن گزر گئے تھے۔ اعزاز کا رویہ ویسا ہی تھا۔ نہ کرخت، نہ نرم، نہ اپنا، نہ پرایا۔
کبھی وہ ہمدرد بن کر اُس کے پاس بیٹھ کے اُسے کھانا کھلاتا تو کبھی انتہائی غیر بن کے اُس
سے ملتا اور اُس کے اس عجیب رویے پر ردا آنسو بہاتی رہ جاتی۔ وہ دل ہی دل میں کہتی۔
"اعزاز! موت دینی ہے تو پوری طرح دو۔ یوں شہ رگ پہ تیز دھار رکھ کر زندگی کے
لئے تڑپانا کہاں کی سمجھداری ہے۔"
ہر ذہنی تکلیف کے باوجود بھی وہ خدا کے آگے سر بسجود تھی کہ اُسے رب العالمین کی
ذات نے ان وحشی درندوں سے بچا لیا ہے۔ اُن کے مظالم سے پناہ میں رکھا ہے۔ وہ اس
گھر کی چار دیواری کی پناہ میں رہ کر کتنی مطمئن تھی۔ واقعی گھر کی چار دیواری ہر عورت کے
لئے بہت بڑی پناہ گاہ ہوتی ہے۔ دنیا کی ہر آگ، ہر سیلاب، ہر زلزلے سے بچاتی ہے۔
اسی طرح کے لوگوں سے حفاظت کرتی ہے۔ سکون کی نیند میسر کرتی ہے۔ اور جس کے
پاس یہ نہیں ہوتی، وہ بہت غیر محفوظ ہوتا ہے۔
اس دن نہا کر کرسی پر بیٹھی رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی تو اچانک اعزاز حسن کی

گاڑی کے اندر آنے کی آواز آئی۔ دن کے بارہ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت عموماً اعـ
ریسٹوران میں ہوتا تھا۔ اُس کی یہ آمد غیر متوقع تھی۔ کچھ دیر بعد اعزاز کے قدموں
آہٹ سیڑھیوں پہ اُبھری اور وہ اوپر آ گیا۔ مگر وہ اکیلا نہ تھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور شخـ
بھی تھا، جس کے کپڑے پھٹے تھے، جسم سے جگہ جگہ خون بہہ رہا تھا۔ بال بکھرے تھے
اُسے اعزاز گھسیٹتا ہوا لایا تھا۔ اُسے کھینچ کر اعزاز نے فرش پہ پٹخا۔ وہ لڑکھڑا کے ردا۔
قدموں میں گر گیا۔

''یہ رہا تمہارا مجرم ردا! بتاؤ اسے کیا سزا دینی ہے؟'' پھولی ہوئی سانس سے اعزاز۔
کہا تھا اور ردا نے اُس شخص کو غور سے دیکھا۔

وہ امجد تھا۔ وہی امجد کریانے والا، جس نے اُس سے سبھی کچھ چھینا تھا۔ ہر کسی کا اعتـ
چھین کر، اُسے سبھی کی نظروں میں گرا دیا تھا۔ یہی تو تھی وہ قابل نفرت ہستی۔ ردا کی آنکھو
میں آنسو آ گئے۔ وہ سرک کر دُور کھڑی ہو گئی۔

اعزاز نے امجد کو بالوں سے پکڑا اور کھینچ کر اُسے صوفے پہ بٹھا دیا۔

''بول! تیرے ساتھ اور کون کون ہے؟ اور تُو نے ردا کو اغواء کیوں کیا؟'' اعزاز اُ
مٹھی میں پکڑے اُس کے بالوں کو جھنجھوڑنے لگا۔ وہ چپ رہا۔ مار کھا کھا کے اُس کا چہرہ
سرخ ہو چکا تھا۔ ناک اور ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔ اعزاز نے اُس کے دریدہ ہونـ
والی جگہ پہ اِک اور گھونسا رسید کیا۔

''بتاتا ہے یا آؤں تیرے ٹریک پر۔'' اعزاز دھاڑا۔

''بتا چکا ہوں میں پہلے بھی، کوئی ساتھی نہیں ہے میرا۔'' وہ کراہتے کراہتے بولا۔ رَ
جل گئی مگر بل ابھی تک باقی تھا۔

''تجھ جیسے کمینوں کی زبان میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے ریوالور سے ایک گو
نکلے گی اور تُو اپنی دس نسلوں کے نام ابھی ابھی بک دے گا۔ بولتا ہے کہ......'' اعزاز۔
اپنی جیب سے ریوالور نکال کر اُس پہ تان لیا۔ وہ ڈھیٹ پھر بھی چپ رہا۔ اعزاز۔
ریوالور کا دستہ اُس کے چہرے پہ رسید کیا۔ پھر اُس پر گھونسوں، لاتوں کی بارش شروع
دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہاں عاشر، ردا کے بابا اور انوار چچا بھی آ گئے۔ غالباً اُن سب کو اعز
نے بلایا تھا۔

''آپ سب کو بلانے کی وجہ یہ تھی کہ آپ اس کمینے کو دیکھ سکیں، جس نے ہماری ردا
اغواء کیا اور اسے اتنا ستایا۔'' اعزاز کے کہنے پر بابا کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔

''یہ اقبالِ جرم میرے سامنے کر چکا ہے لیکن آپ کے سامنے بھی یہ بکے گا اور آپ کو
ی پاکیزگی کا ثبوت دے گا۔''

اعزاز یہ کہہ کر دوبارہ ادھ مرے امجد کے پاس آیا۔ وہ اعزاز سے پہلے ہی اتنی مار کھا
تا کہ مزید کھاتا تو شاید راہی عدم ہو جاتا۔ سو اعزاز نے جو سوال کیا، اُس کا جواب دیتا
اُس کے بیان سے بابا پر یہ بات کھل گئی کہ اس سارے قصے میں ردا کا کوئی عمل دخل
ا تھا۔ وہ واقعی اغواء ہوئی تھی۔ اپنی عصمت کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہوئی تھی اور
اُس کے ساتھ زبردستی کا ارادہ کیا گیا تو وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب رہی۔ ہر
ا کے دل پر چھایا نفرت کا غبار چھٹ چکا تھا۔

اعزاز نے کچھ ہی دیر بعد اپنے کسی انسپکٹر دوست کو فون کر کے بلایا۔ پولیس آئی اور ردا
رم کو گرفتار کر کے لے گئی۔ بابا اور چچا، ردا کے پاس کھڑے تھے۔

''میں نادم ہوں تم سے بیٹی! کہ تمہیں سمجھے بغیر تم پر الزام لگائے۔ تم اور تمہاری سیرت
رے نام کی طرح پاکیزہ ہیں بیٹی! مجھے معاف کر دینا۔'' بابا کا ہاتھ اُس کے سر پر تھا اور
یں نم تھیں۔

وہ کیا کہتی۔ بس اپنے بابا کے کندھے سے لگی کتنی دیر آنسو بہاتی رہی۔ اعزاز کے
ن کا بدلہ وہ کیسے چکا پاتی کہ اُس کا احسان تھا ہی اتنا بڑا۔

ماما، امی، چچی اور عمارہ آ کر اُس سے ملی تھیں۔ وہ سارے کتنی دیر اکٹھے بیٹھے باتیں
تے رہے، ہنستے رہے۔ لگتا تھا، اس خاندان میں زندگی پھر سے لوٹ آئی ہے، رونق پھر
واپس آ گئی ہے، رُوٹھی ہوئی خوشی نے ایک بار پھر دہلیز پہ قدم رکھا ہے، قہقہوں نے پھر
وں پہ دستک دی ہے۔ لیکن ہر خوشی سے اوپر، ہر رونق سے زیادہ ایک اطمینان تھا۔
ا کے ساتھ کا، اُس کے پیار کا، اُس کے اعتبار کا۔

رات کو سبھی چلے گئے تو وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ طمانیت بھری مسکراہٹ سے کپڑے
ل کرنے کی غرض سے الماری کی طرف بڑھی اور الماری کھول کر سوٹ منتخب کرنے لگی۔
ے کمرے کی بتی جلی۔ اُس نے فوراً مڑ کے دیکھا۔

وہ اعزاز حسن تھا۔

وہ نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا اُس کے بہت قریب آیا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک
ا اسے تھمایا۔

''میں چاہوں گا کہ آج رات تم یہ پہنو۔'' وہ بہت بدلے بدلے لہجے میں بولا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ حیران تھی۔

"یہ تمہارا عروسی لباس ہے۔ کسی بھی عام دُلہے کی طرح، میں پہلی رات اپنی دُلہن اسی لباس میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" اُس کا انداز والہانہ تھا۔ وہ شرما کے رہ گئی۔ کچھ کہنے کے لئے لفظ ترتیب دینے لگی۔

"آپ بہت اچھے ہیں اعزاز!" اُس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

"اچھا اس لئے ہوں کہ تم سے پیار کرتا ہوں؟" عجیب سا سوال تھا۔

"نہیں، اچھے اس لئے ہیں کہ مجھ پہ اعتبار کرتے ہیں۔" وہ بولی۔

وہ عروسی لباس میں ملبوس ہو کر جب دوبارہ کمرے میں آئی تو اعزاز کھڑکی میں تھا۔ وہ بھی دھیمے دھیمے قدم اُٹھاتی اُس کے قریب آ گئی۔ پورے چاند کی راتیں تھیں۔ چیز پہ چاندنی رنگ و نور بن کر بکھری تھی۔

"جانتی ہو ردا! اعتبار کے بغیر محبت کچھ بھی نہیں۔ آپ جسے چاہتے ہیں، جسے اپنا ہیں اگر اُس پہ اعتبار نہیں کرتے تو آپ کی محبت اندھی ہے، بصارتوں سے محروم ہے۔" اُس کا ہاتھ تھامے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اعزاز! وعدہ کریں کہ اس اعتبار کی چھاؤں تا عمر مجھ پہ سایہ کئے رہے گی۔ تا عمر محفوظ رکھے گی۔" وہ اُس کے کاندھے پہ گردن ٹکا کے بولی۔

"وعدہ کیا۔" یہ کہہ کر وہ اُس پہ جھکا تھا اور چاند مسکرا کر رہ گیا تھا۔



"ماہا! میرے پاس آؤ گی؟" رات کو سونے سے قبل ماہا کتاب پڑھنے میں مصروف کہ بیڈ پہ لیٹے ہوئے عاشر نے اُسے آواز دی۔ ماہا فوراً اُٹھی اور بیڈ پہ آ کے دوسری طر بیٹھ گئی۔ عاشر سرک کر اُس کے قریب آیا اور اُس کی گود میں سر رکھ دیا۔ ماہا اس اچا حرکت پہ حیران تھی۔ وہ رو رہا تھا۔

"ماہا!...... مجھے معاف کر دو ماہا! میں نے تمہیں کبھی نہیں سمجھا۔ ہمیشہ اپنی خواہ اور اپنی محرومیوں کے پیچھے آنسو بہاتا رہا۔ مجھے پتہ ہی نہ تھا کہ تم مجھ سے اتنی محبت ہو۔" وہ بھاری آواز میں کہہ رہا تھا۔

"عاشر! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ بولی۔

سرخ، بھیگی بھیگی آنکھوں سے وہ اُس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"تمہاری الماری سے تمہاری ڈائری اور ایک سنہری ڈبہ مجھے ملا ہے، جس میں پڑا

ز مجھ سے منسلک ہے۔ میں نے تمہاری ڈائری کا ایک ایک لفظ پڑھ لیا ہے۔ اور مجھ پہ یہ نکشاف ہو گیا ہے ماہا! تمہیں مجھ سے کتنی شدید محبت ہے...... کتنی شدید باوفا محبت سے بے خبر رہا اور مجھے اس جرم کی سزا بھی ملی۔"

وہ چپ تھی۔ مسلسل چپ۔

"میں نے ہمیشہ محرومیاں دیکھی ہیں ماہا! اپنے آپ کو ٹھکرائے جاتے دیکھنے کا درد خود جھیلا ہے ماہا! صرف اور صرف تم ہو، جس نے مجھے چاہا ہے، اپنایا ہے۔ تم ہی تو ہو میری حد دوست۔ میری اپنی۔" وہ اُس کا ہاتھ تھامے اپنے گناہوں کی تلافی کر رہا تھا۔

"مجھے تمہاری محبت پہ ناز ہے ماہا!...... مجھے اپنا بناؤ گی؟...... میں اس قابل تو ہیں، لیکن پھر بھی مجھے کسی کے ساتھ کی ضرورت ہے۔ میری محرومیوں کو، میرے بکھرے وابوں کو کسی کے پیار کی ضرورت ہے۔ ماہا! مجھے اپنا لو۔ مجھے اپنا لو۔" اُس کی آنکھیں لک رہی تھیں اور وہ ماہا کے شانوں پہ تھا۔

ماہا نم آنکھوں سے مسکرائی تھی اور اُس کے دل کے نہاں خانوں میں موجود محبت کی ننھی ی ٹہنی جھوم کے لہرائی تھی۔

تتلیاں باغوں میں لوٹ آئی تھیں...... دھوپ کا رنگ گلابی ہو چکا تھا!



ہجر کی راکھ اور وصال کے پھول

صبح کے اس پہر آسمان گھنے سرمئی بادلوں کی چادر اوڑھے مسکرا رہا تھا۔ اس طرح موسم بہت دنوں بعد اس شہر پہ اُترا تھا۔

چھوٹے سے مگر نفیس سے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑی نتالیہ احمر اپنے ننھے منے پرندوں سے کھیلنے جا رہی تھی۔ یہ رنگ برنگے طوطے اُس کے بہت قریب تھے۔ اُن سے باتیں، اُن کی باتیں سننا اُسے بہت اچھا لگتا تھا اور پھر اُن کے علاوہ اُسے کوئی اور اپنا اپنا نزدیک محسوس ہوتا ہی نہیں تھا، یا پھر اُس کی زندگی میں اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ کسی کو نزدیک کر سکے، کسی کو اپنا بنا سکے۔ لاء کی پریکٹس میں صبح وشام، ماہ و سال کیسے گزرنے تھے، وہ جانتی تھی۔ بس کبھی کبھی کوئی چھٹی کا دن اُس کی مصروف ترین زندگی میں اِک ٹھنڈی سانس کی طرح آتا تھا، جس میں اُسے کچھ نہ کچھ اپنے بارے میں سوچنے کا موقع مل جاتا۔ یہ بھی انہی ٹھنڈی سانسوں ایسے دنوں کی طرح کا ایک دن تھا۔ اگست کا مہینہ تھا اور ساون کی گھٹائیں دُور پار کے جزیروں سے سفر کرتی اس ساحلی شہر پہ بھی آ رُکی تھیں۔

"ہیلو کزن! کیا کر رہی ہو؟...... ضرور اپنے رنگ کے طوطے سے کلام میں مصروف ہو گی۔" انزلہ کی آواز نے اُسے چونکا ہی دیا ہے۔ وہ ہولے سے مسکرا دی۔ ہلکے پنک کلر کے سوٹ میں وہ بہت سادہ اور نکھری سی محسوس ہو رہی تھی۔

"ناشتہ کر لیا تم نے انزلہ!" وہ اُس کی طرف آتے ہوئے بولی۔

"چھٹی کا دن ہو اور میں تمہارے بغیر ناشتہ کر لوں۔ ہو سکتا ہے کیا؟ کبھی کبھی تو تمہاری صورت دیکھنا نصیب ہوتی ہے، ورنہ جس وقت تم جاتی ہو، میری صبح نہیں ہوئی ہوتی اور جس وقت واپس آتی ہو، تو میری رات ہو چکی ہوتی ہے۔" انزلہ کی بات نے اُسے دل سے مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ تم نے اپنی روٹین بنائی ہی اتنی ٹف ہوئی۔

سونا، سونا اور صرف سونا۔ تم تھکتی نہیں ہو انزلہ! اتنی صحت کا کام کر کے؟" نتالیہ نے اُس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

"اُڑا لو...... اُڑا لو...... جتنا چاہے مذاق اُڑا لو وکیل صاحبہ! لیکن دیکھنا، کل کو جب میرا بی اے کا رزلٹ آ جائے گا تو میں بھی کچھ نہ کچھ کروں گی۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھنا مجھے بھی پسند نہیں۔" انزلہ رُوٹھی۔

"اچھا بابا! اب یوں منہ تو مت بسورو۔ یہ بتاؤ، ماموں اور آنٹی اُٹھ گئے ہیں؟"

"ہاں۔ پاپا جی تو صبح کی واک سے ابھی لوٹے نہیں اور مما حسب معمول کچن میں ماسی کی کلاس لے رہی تھیں۔"

"چلیں ناشتے کے لئے۔" انزلہ کی بات پر اُس نے دوپٹہ اُٹھایا اور اُس کے ہمراہ باہر آ گئی۔ مبشر حسین ریٹائرڈ میجر تھے، جو رشتے میں نتالیہ کے ماموں تھے۔ نتالیہ کے والد کی وفات کے بعد اُس کی ماں فائزہ بیگم نے دوسری شادی کر لی تھی اور چھ سالہ نتالیہ تبھی سے اپنے ماموں کے گھر کی فرد بن گئی۔ انزلہ اُس سے دو سال چھوٹی جبکہ انزلہ کا بھائی ارسل چار سال چھوٹا تھا۔ ماموں اُس سے بہت محبت کرتے تھے، اُنہی کی سپورٹ کی وجہ سے وہ ایل ایل بی مکمل کر پائی تھی۔ نتالیہ سے سامنے والے ہی فلیٹ میں اُس کی خالہ کا گھر تھا، اُن کے تین بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا عسفان جو کہ نتالیہ کا ہم عمر تھا۔ ایم بی اے کر چکا تھا۔ اُس سے چھوٹا عفان بی ایس سی کر رہا تھا اور سب سے چھوٹا عالیان انٹر میں تھا۔ زندگی ایک مخصوص ڈگر پہ رواں تھی۔ بنا کسی ارتعاش کے۔

ابھی تمام لوگ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اینٹرنس والے دروازے سے عسفان اور عالیہ آتے دکھائی دیئے۔

"ارے...... آج تو بڑے لوگ تشریف لائے ہیں۔" ارسل اور انزلہ کے کہنے پر عسفان نے سر کھجایا۔ وہ بہت ہی کم آیا کرتا تھا۔ چھٹی کے دن بھی بہت کم ہی چکر لگاتا تھا۔

"آپ کے گھر بھی تو آج بڑے بڑے لوگ تشریف رکھتے ہیں، اس لئے۔" عسفان نے نتالیہ کی طرف اشارہ کیا۔

"دراصل آج ہم نے پکنک کا ارادہ کیا تھا۔ اگر آپ لوگ ساتھ دیں تو بڑا مزہ آئے گا۔" عسفان کے کہنے پر ارسل اور انزلہ کھلکھلا اُٹھے۔

"دیٹس گریٹ عسفان بھائی! ہم ضرور چلیں گے۔" انزلہ جھوم اُٹھی۔

"تو پھر تیار ہو جاؤ۔ تیاری کرو۔ آپ بھی تیار ہو جائیں نتالیہ!" عسفان نے اپنی

آنکھیں اُس شفاف چہرے پہ ٹکائیں تو وہ جھینپ سی گئی۔
''آں........ میں........ مجھے کچھ کام ہے۔سوری........ میں جا نہیں پاؤں گی۔''
نے جھجکتے ہوئے انکار کیا۔
''نتالیہ! اس طرح کی لائف سے تم بہت جلد بوڑھی ہو جاؤ گی۔تمہیں کمرے
کے اپنے طوطوں سے باتیں کرنا، انسانوں سے بات کرنے سے بہتر نظر آتا ہے؟''
نے اُسے ٹوکا۔
''ایسی بات ہے تو ہم طوطوں کو بھی لئے چلتے ہیں۔آخر ایسے موسم کو مس کرنا ا
نہیں ہوتا۔'' عسفان کی گہری آنکھیں نتالیہ کو ڈسٹرب کر رہی تھیں۔اُس نے اُکا
آنکھوں کی بولتی جنبش کو محسوس کیا تھا، مگر ہمیشہ ہی نظر انداز کیا تھا۔شاید وہ اس طرح
کسی احساس سے آشنا ہونا نہیں چاہتی تھی۔شاید وہ اس طرح کی کسی زبان کو سمجھنا
چاہتی تھی۔



''سبھی ساحل سمندر پہ تھے۔گرمی کے اس موسم میں سمندر کی لہریں اور ٹھنڈی ہوا
بھلی محسوس ہوتی تھی۔ازلہ، ارسل، عالیان، عسفان سبھی لہروں میں کھڑے تھے۔
رہے تھے، خوش ہو رہے تھے۔عسفان بھی اُنہی کے ساتھ انجوائے کر رہا تھا جبکہ نتالیہ
ساحل کی ریت پہ بیٹھی اُن کو دیکھ رہی تھی۔اُس وقت جب عسفان کی نظر اُس پر پڑ
اُس نے گردن موڑ کر دور سے آتی جاتی لہروں کو دیکھا۔عسفان ان سب کو چھوڑ کر ا
جانب آنے لگا۔وہ اس بادلوں سے بھرے خوب صورت دن میں بہت نکھری نکھری،
کھلی کھلی لگ رہی تھی۔اُس کے بالوں کی لٹیں بار بار اُڑتیں اور اُس کے چہرے کو چھو
اُسے پریشان کرتیں اور یہ منظر وہ کتنی دیر کھڑا دیکھتا رہا۔ان لفظوں کو اپنے ذہن میں
رہا کہ جو اس منظر کے حُسن کو بیان کر پائیں۔لیکن کیا کسی زبان میں ایسے لفظ ہوتے
جو ہر احساس کو زبان دے پائیں؟
وہ چلتا چلتا اُس کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔نتالیہ نے آنکھ اُٹھا کر اُسے دیکھا تھا۔وا
تھی، جیسے کہ ہوا کے تیز جھونکے سے پھول کانپ اُٹھیں۔وہ بھی اُس کے قریب ہی
پر بیٹھ گیا۔
نتالیہ!........آپ کو تفریح اور انجوائے منٹ سے کوئی دشمنی ہے یا چڑ؟'' عسفان
کہنے پر وہ پل بھر کو مسکرائی۔

''ایسی کوئی بات نہیں عسفان! بس اب یہ باتیں بچوں والی لگتی ہیں۔اس عمر میں اس
طرح دوڑنا بھاگنا ہاں اچھا لگتا ہے؟'' اُس نے پل بھر کے لئے عسفان کے چہرے پر
آنکھیں ٹکائیں اور پھر سمندر کو دیکھنے لگی۔پرندے اُڑ اُڑ کر کبھی لہروں کو چھو جاتے تو کبھی
آسمان کے سایوں میں گم ہو جاتے۔
''کیوں، کیا ہوا ہے آپ کی عمر کو؟........ یہ عمر تو ابھی خواب دیکھنے والی ہوتی ہے،
خواہشوں کو پرونے کی ہوتی ہے، آرزوؤں کے شعر کہنے کی ہوتی ہے۔'' عسفان کے بال
بھی ہوا میں اُڑ رہے تھے۔اچانک نتالیہ نے ٹھنڈی سانس لی۔
''خواب دیکھنے سے یا آرزوؤں کے شعر کہنے سے کبھی کسی ذی نفس کو فائدہ ہوا ہے
خوامخواہ میں اپنی انرجی ضائع کرنے سے حاصل؟ مسٹر عسفان! اگر خواب اور آرزوئیں سچ
ہو جاتیں تو دنیا جنت بن جاتی۔'' وہ تمسخرانہ ہنسی۔
''اگر انسان چاہے تو وہ خوابوں کو صداقت بنا سکتا ہے۔'' عسفان کے لہجے میں تیقن
تھا۔اُس نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔اُس کے دل کے اندر چھپے خیالوں کو پڑھنے
کی کوشش کی۔عسفان نے اسی تیقن سے کہا۔
''میرا خیال ہے، انسان اپنے نصیب، اپنی قسمت کو بنانے والا خود ہے۔کوئی دوسرا
اس کا کچھ بنا سکتا ہے اور نہ بگاڑ سکتا ہے۔''
نتالیہ نے نفی میں سر جھٹکا۔
''کیا یہ صرف کتابی باتیں نہیں ہیں، ہماری پیدائش، ہمارا جنم ہی انسانی مستقبل پہ
سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے؟ کیا یہ کسی کے بس میں ہے کہ وہ کسی بادشاہ کے گھر میں
پیدا ہو یا پھر فقیر کے؟ کیا یہ میرے بس میں تھا کہ میں نتالیہ کی جگہ ازلہ بن کے پیدا
ہوتی؟'' اُس کے چہرے پر کچھ اُداسی کے سائے آئے اور غائب ہو گئے۔
''لیکن جیسے ہی انسان سوچنے سمجھنے کے لائق ہوتا ہے، اپنی زندگی کے فیصلوں کے تمام
دھاگے اسی کے ہاتھ میں ہوتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کو کس طرف لے جائے۔''
عسفان نے مٹھی بھر ریت اُٹھائی اور چھوٹا سا گھروندا بنانے لگا۔وہ گھروندا کچھ اونچا
ہونے کے بعد ٹوٹ گیا۔نتالیہ مسکرا دی۔
''انسان کی زندگی بھی ٹھیک اسی طرح ہے۔وہ ریت کے محل جوڑتا ہے اور اچانک وہ
محل زمیں بوس ہو جاتے ہیں۔اس کے لئے وہ کس کو دوشی ٹھہرائے؟ اپنی قسمت کو یا اپنے
عملوں کو؟''

"اور اگر انسان کے ہاتھ محل جوڑنے میں ماہر ہوں تو؟" وہ اپنی بات منوانے
بولا۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ اتنے ماہر ہیں؟" اب کے نتالیہ کی مسکراہٹ
خفگی بھی تھی۔

"میرے خیال میں انسان چاہے کتنا ہی مضبوط ارادے والا کیوں نہ ہو، وہ ماحول
اثر سے بچ نہیں سکتا۔ ماحول اُس ظالم کلہاڑی کی مانند ہوتا ہے، جو تپتے ہوئے لو
زخم دے دیتی ہے۔" نتالیہ کے لہجے میں گہرائی تھی اور اُس کی آنکھیں ساتھ ہی شو
سمندر سے زیادہ اتھاہ تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں بیک وقت قربت و دُوری کے احسا
تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کبھی بہت قریب ہو اور کبھی بہت دُور۔ گھٹنوں کے اوپر رکھا اُ
چہرہ عسفان کے دل کی گہرائیوں میں تصویر بنانے لگا۔

"عام طور پر تو یہ کہا جاتا ہے کہ مرد حقیقت پسند ہوتے ہیں اور عورتیں خوابو
رہنے والی۔" وہ چھوٹا سا قہقہہ لگا کر اُٹھ گئی۔ اس کے قہقہے کی بازگشت فضا میں گونجی۔

"عام طور پر لوگ اُلٹا سمجھتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عورت کے پاؤں ز
ہوتے ہیں اور مرد ہواؤں میں اُڑتے ہیں۔" وہ ہنستی لہروں کی جانب چ
جہاں یہ انزلہ سمیت سبھی کھیل رہے تھے۔ اور اس کے جانے کے بعد عسفان دیر تک
دیکھ کر مسکراتا رہا۔

ہم خوابوں سے اُٹھ کر حقیقت کو تھام لیں
تم اپنی حقیقت میں میرے خواب سجا لو

"خواب تو تمہاری آنکھوں میں، میں سجا کر ہی رہوں گا، نتالیہ!...... میرے ہا
تعبیر کرنے میں ماہر ہیں۔" اُس نے مسکرا کر سوچا تھا۔



اُس کے الارم کلاک پہ بجنے والی اذان بھی آج اُسے جگا نہ پائی کہ رات اُس کا
کا فون آیا تھا، جس کے بعد وہ ہمیشہ کی طرح دیر تک روتی رہی۔ محرومیوں کے ڈھیرو
اُس کی تنہائی میں زندہ ہوتے رہے۔ کھو جانے والے کتنے ہی پل اُس کے اردگرد گھو
اُسے دوشی ٹھہراتے رہے۔

دیر تک اُس نیند نہ آئی اور نیند آئی بھی تو خواب آور پلو کھانے کے بعد۔ اور صبح
اُس کی آنکھ کھلی تو دن کے دس بج چکے تھے۔ اُس کے رنگ برنگے آسٹریلوی رنگ ط
چیں چیں کر کے اپنے کشادہ پنجرے میں اُڑ رہے تھے۔ یہ طوطے اُسے اُس کی دوست

نے دیئے تھے۔ یوں تو اُسے کسی بھی پرندے کو یوں قید کرنا پسند نہ تھا، لیکن چند دن ان
کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ انہیں اپنے آپ سے جدا نہ کر پائی اور انہیں اپنی زندگی کا
حصہ بنا لیا۔

وہ فوراً ہی اُٹھی...... جلدی جلدی تیاری کر کے اپنا گاؤن اُٹھایا اور آنٹی کو خدا حافظ
کہہ کے باہر آ گئی۔ سیڑھیاں اُترتے ہی اُس پر کھلا کہ باہر زوروں کی بارش ہو رہی ہے اور
اُس کے پاس کوئی چھتری بھی نہ تھی۔ اُس نے اپنی براؤن فائل اپنے سر کے اوپر رکھی اور
جلدی جلدی جانے لگی تو اُسے عقب سے عسفان نے پکارا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا، نیوی بلیو
کلر کی چھتری میں خود کو چھپاتا وہ اُس کی طرف آیا۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ؟" وہ جان بوجھ کر اُس کے ساتھ تکلفات کرتا تھا۔

"کورٹ جا رہی ہوں۔ آج اُٹھنے میں کچھ دیر ہو گئی۔" اُس نے عسفان کی چھتری کی
چھاؤں تلے آنا بہتر سمجھا۔

"لیکن اتنی بارش میں آپ کو کوئی ٹیکسی، رکشہ کہاں ملے گا؟" وہ بولا۔

"شاید کوئی بس ہی مل جائے۔ اگر آپ اپنی یہ چھتری مجھے دے دیں تو شاید میں کچھ
دور پیدل جا سکتی ہوں۔" نتالیہ نے جھجک کو بالائے طاق رکھ کر کہا۔

"اس شرط پہ دوں گا کہ اگر آپ میری چھتری کے ساتھ ساتھ میری گاڑی میں بیٹھ کر
لفٹ بھی قبول کریں۔ میں بھی اپنے آفس ہی جا رہا ہوں۔"

اُس کی بات پر نتالیہ مسکرا دی اور دونوں ایک ہی چھتری کے سائے تلے چھوٹی سی آلٹو
میں بیٹھ گئے۔

گاڑی بارش میں بھیگی سڑکوں پر چلتی جا رہی تھی۔ وائپر ونڈ اسکرین پہ پڑتی بوندوں کو
صاف کر رہے تھے۔ عسفان نے کیسٹ پلیئر آن کیا۔ نازیہ حسن کی دلفریب آواز گونجی۔

"ٹاہلی دے تھلّے بہہ کے
ماہیا وے ماہیا
کریے پیار دیاں گلاں
او کریے پیار دیاں گلاں"

نتالیہ نے عسفان کو ایک نظر دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر کے مناظر سے لطف اندوز
ہونے لگی۔

"اس گلوکارہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" عسفان نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"اس کے بارے میں تو جو بھی خیالات ہوں، لیکن اس کے گانے کے متعلق اچھے خیالات نہیں ہیں۔ آج کل کی بھاگ دوڑ والی زندگی میں کسی کے پاس اتنا وقت ہے کہ ٹاہلی دے تھلّے بہہ کے، پیار دیاں گلّاں کرے۔" نتالیہ نے سر جھٹک کر کہا۔

"شادی سے پہلے وقت نہیں ہوتا پیار کی باتیں کرنے کا، لیکن شادی کے بعد تو ہی وقت ہوتا ہے۔" عسفان نے کہا۔

"وقت تو ہوتا ہے، بس شادی کے بعد پیار کی باتیں نہیں ہوتیں۔ گھی، دال، روٹی، کپڑے، کرائے کی باتیں ہوتی ہیں۔ بچوں کی ضرورتوں اور اپنی بیماریوں کی ہوتی ہیں۔" نتالیہ کا لہجہ قدرے سنجیدہ تھا۔

"ضروری نہیں کہ ہر شادی کا ایسا ہی انجام ہو۔ آپ اتنے یقین سے کیسے ک ہیں؟" وہ دھیمے سے مسکرائی تھی۔

"عسفان چوہدری! اگر شادیوں کے انجام ویسے ہوتے جیسے یہ فلمیں، ڈرامے، ناول دکھاتے ہیں ناں، تو ہماری عدالتوں میں درجنوں کے حساب سے نکاح پھاڑے نہ جاتے۔ میاں بیوی کے درمیان مقدس مضبوط رشتہ لوگوں کے سامنے ٹوٹتا ہے ہفتے میں...... صرف ایک ہفتے میں کم از کم دس طلاقیں ہوتی ہیں ہماری کورٹ دس بھی اس لئے کیونکہ بہت سے کیسز ہم خود بند کروا دیتے ہیں یا انہیں سوچنے کے لئے وقت دے دیتے ہیں۔

شادی...... ہوں...... لوگ عشق کرتے ہیں، اپنے نام کے دو تین بچے سرٹیفکیٹ کے طور پر دے کر پھر کوڑے کرکٹ کی طرح واپس پھینک دیتے ہیں۔ ڈسپوزیبل آئٹم ہو تم مرد لوگ عورتوں کو۔"

نتالیہ کے لمبے چوڑے لیکچر پر عسفان نے اُسے حیرت سے دیکھا۔

"تم بہت اچھی وکیل ہو نتالیہ! آج یقین ہو گیا۔" اُس نے پہلی بار اُسے تم کہا تھا خود بھی حیران تھی۔ "لیکن سن لو کہ کچھ مرد مختلف بھی ہوتے ہیں۔" اُس نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ نتالیہ نے اپنی آنکھیں چرا لیں۔

کورٹ کے باہر اُس نے گاڑی روکی۔ اُس نے اُترتے ہی صرف دبی دبی زبان شکریہ ہی کہا تھا۔ اُس نے نازیہ حسن کا گانا گنگناتے ہوئے گاڑی ریورس کی تھی۔

❖❖()❖❖

"یہ اگلا کیس ہے، جو تمہیں لڑنا ہے نتالیہ!" اُس کے کولیگ احسن مشکور نے ایک

اس کے سامنے رکھی۔

"کس کا کیس ہے؟" اُس نے فائل کھولی۔

"مسز عائشہ وقار کا، جس نے تین سال پہلے وقار احمد سے شادی کی۔ وقار احمد اپنی ایک چھوٹی سی گارمنٹس کی دُکان چلاتا تھا، جبکہ عائشہ امیر والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اور جیسا کہ اکثر اکلوتی اولادیں کرتی ہیں، عائشہ نے کورٹ میں وقار احمد سے رجسٹر میرج کر لی۔ آہستہ آہستہ پیسے کی کمی اور رہن سہن کے اختلاف نے عائشہ کو وقار سے متنفر کر دیا اور اب عائشہ، وقار احمد سے طلاق چاہتی ہے۔ بچی کی کسٹڈی کا معاملہ ہے تو وہ عائشہ کو ملنی چاہئے اصل کہانی یہ ہے، باقی اسے کورٹ میں کیا رنگ دینا ہے، وہ تمہارا کام ہو گا۔" احسن مشکور کی اس بات پر وہ چونکی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا احسن!...... بچی کی کسٹڈی عائشہ کو دلوانے کے لئے میں وقار احمد کو وحشی ٹھہراؤں؟"

"ظاہر ہے، تم عائشہ کی طرف سے کیس لڑو گی۔ تم یہ ظاہر کرو گی کہ وقار، عائشہ پر تشدد کرتا تھا، مارتا تھا یا جلانا چاہتا تھا۔"

"جبکہ ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ عائشہ وقار کے اس کیس میں قصوروار وقار احمد نہیں، خود عائشہ ہے۔ کیونکہ وہ آرام دہ زندگی کے بنا رہ نہیں سکتی، اُس کا شوق پورا ہو گیا ہے، اس لئے وہ وقار احمد کو چھوڑنا چاہتی ہے۔ رائٹ؟" نتالیہ کے لہجے میں خفگی تھی۔

"ہاں...... لیکن ہمیں اس سے کیا۔ عائشہ وقار منہ مانگی فیس دے گی۔" احسن نے مسکرا کے کہا۔

"میں پھر بھی یہ کیس نہیں لوں گی احسن! تمہیں لینا ہے تو لے لو۔ میں خوامخواہ کسی بے گناہ کو بھری دنیا کے سامنے بے عزت نہیں کر سکتی۔ عائشہ وقار جیسی عورتوں سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں۔" اُس نے غصے سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"کول ڈاؤن نتالیہ! لیکن ان عدالتوں میں، اس پیشے میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ بتاؤ، کافی پیو گی؟" احسن مشکور نے اُسے سلجھاتے ہوئے کہا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے بالوں کو پکڑ لیا۔ ذہن کے کسی گوشے سے عسفان کی آواز آئی۔

"کچھ مرد مختلف بھی ہوتے ہیں۔"

"صحیح کہتے ہو تم، عسفان!" اُس نے خود کلامی کی۔ تبھی اُس کے موبائل پہ ایک مدھر گیت کا میوزک بجا۔ خالہ کے گھر کے نمبرز تھے۔ اُس نے فوراً یس کا بٹن پش کیا۔

"مجھے پتہ نہیں، کیوں یہ احساس ہوا کہ تم نے مجھے یاد کیا ہے۔" دوسری جانب ع
تھا۔ وہ یقیناً اُس کی اس بات پہ چونکی تھی، پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

"غلط فہمی ہے آپ کی۔ میں بہت مصروف تھی۔ کسی کو یاد کرنے کی فرصت کہاں۔"

"بہت تھک گئی ہو ناں...... چلو اِک نظم سنو!" وہ بہت پیار سے بولا۔

"وقت نہیں ہے عسفان! پھر کبھی۔" اُس نے منع کیا۔ لیکن وہ اُس کے انکار کو نظر
کرتے ہوئے بولا۔

"آج پھر درد و غم کے دھاگے میں
ہم پرو کر تیرے خیال کے پھول
ترکِ اُلفت کے دشت سے چن کر
آشنائی کے ماہ و سال کے پھول
تیری دہلیز پہ سجا آئے
پھر تیری یاد پر چڑھا آئے
باندھ کر آرزو کے پلے میں
ہجر کی راکھ اور وصال کے پھول"

عسفان کے لہجے میں وفاؤں کے کتنے مدھر سُر تھے، جنہیں خود نتالیہ نے اپنے ار
محسوس کیا۔ مگر اُس کے اندر چھپی اس بے حسی نے انکار کیا کہ نہیں، تمہارے دل میں
طرح کے محسوسات کے لئے کوئی جگہ خالی نہیں، کسی بھی مرد کے آگے دوزانو بیٹھنا تمہار
کی توہین ہے۔

"کچھ باقی ہے عسفان! یا میں فون رکھوں؟" وہ قدرے خفگی سے بولی۔

"پتہ تھا مجھے تمہارے رسپانس کا۔ یہی موقع لے کر میں نے فون کیا تھا۔ لیکن فو
آپ کو زحمت دینے کی وجہ یہ تھی کہ آج رات امی نے آپ کو ڈنر پہ بلایا ہے۔" عسفا
لہجہ فوراً ہی تبدیل ہوا۔

"ڈنر...... کیوں، کوئی خاص وجہ؟"

"جی ہاں...... مابدولت نے ایم بی اے میں ٹاپ کیا ہے۔ آج ہی رزلٹ آؤٹ
ہے۔ اس سال یونیورسٹی سے گولڈ میڈل بھی حاصل کر ہی لیا ہے۔ تو والدہ صاحبہ نے چھ
سی سیلیبریشن رکھی تھی۔" عسفان نے اترا کے کالر جھاڑے تھے۔

"بھئی مبارک ہو بہت بہت۔ یہ بتائیں، کیا گفٹ لینا پسند کریں گے؟" وہ یقیناً خ

ہوئی تھی۔

"فی الحال تو آپ کی تشریف آوری ہی نوازش ہو گی۔ گفٹ وفٹ پھر کبھی۔"

"میں ضرور آؤں گی۔" وہ بولی۔

"میں انتظار کروں گا۔" والہانہ پن سے کہہ کے اُس نے فون بند کر دیا۔ اُس کے فون کے بعد نتالیہ کا موڈ بہت حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ کافی پینے سے قبل بھی وہ کافی فریش تھی اور کافی کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لیتے ہوئے بھی اُس کے ذہن پہ عسفان ہی کی شخصیت چھائی رہی۔ گو کہ وہ بچپن سے جانتی تھی اور جوانی کی دہلیز پہ بھی دونوں کے قدم ایک ساتھ ہی پڑے تھے۔ اکثر اُس کے انداز گفتگو سے نتالیہ نے اپنے لئے پسندیدگی محسوس کی تھی۔ مگر اسے ہمیشہ ہی نظر انداز کیا تھا۔ اس طرح کے ہر احساس سے بدکی تھی، ہر خیال سے بھاگی تھی وہ۔ لیکن اب نجانے کیوں وہ اُسے بار بار یاد کرنے لگی تھی۔ بار بار وہ اُس کے ذہن کی تاریکیوں میں اِک چراغ کی مانند چمکتا اور ہر جانب اپنی جگمگاتی کرنیں بکھیرنے لگتا اور وہ ہر بار نئے سرے سے اُسے اپنے ذہن سے باہر نکالنے کی سعی کرتی۔ لیکن وہ ہر بار ہی ناکام ٹھہرتی۔



ڈیزی اور روزز کے خوب صورت گلدستے کے ہمراہ وہ جب خالہ کے گھر پہنچی تو سبھی کو اپنا منتظر پایا۔ انزلہ، ارسل، ماموں اور سبھی لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

"نتالیہ بیٹے! اتنی دیر لگا دی تم نے۔ میں تو سمجھی تھی کہ میری بچی وقت سے پہلے آ کر اپنی خالہ جانی کی مدد کرے گی کھانا پکانے میں۔" اُس کی خالہ کوثر بیگم اُسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"سوری خالہ جانی! لیکن آج کام بہت زیادہ تھا۔ کتنی پرانی فائلز پینڈنگ تھیں۔ آج اُن سے جان چھڑائی ہے۔" وہ مسکرا کر معذرت کرنے لگی۔

"کوثر! ہر بار اس لڑکی کے پاس کوئی نیا بہانہ ہوتا ہے۔ اور اوپر سے اس کے چہرے پہ سجی یہ جادوئی مسکراہٹ ہر بار اس کی جان بخشی کرا دیتی ہے۔ آج اس سے جواب مانگ ہی لو کہ یہ اپنوں سے اتنا دُور کیوں رہتی ہے۔" مبشر حسین نے پیار بھری شکایت کی۔

"ماموں!" نتالیہ نے پیار سے کہا۔

"ہاں تو اور کیا، تمہاری صورت نظر نہیں آتی۔" ماموں نے مزید ناراضگی کا ڈرامہ کیا۔

''اچھا بابا...... آج میں آپ کی عدالت میں مجرم ہوں۔ آپ کی مرضی، مجھے جو سنائیں۔'' اُس نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

''اور جج کون ہے؟'' انزلہ بولی۔

''بھئی جج تو وہی ہوگا، آج جس کا دن ہے۔ یعنی کہ مابدولت۔'' اوپر صوفے پر بیٹھے عسفان نے اِترا کے کہا۔ اچانک نتالیہ کی آنکھیں اُس پر گئیں۔ وہ بھی پُرشوق نگاہوں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے گھبرا کر آنکھیں چرا لیں۔

''آرڈر...... آرڈر!'' عسفان نے رسالہ اُٹھا کر اس کا رول بنایا اور کسی جج کی طرح صوفے پر مارتے ہوئے بولا۔

''تمام ثبوتوں اور گواہوں کے بیانات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ملزمہ نتالیہ احمر نے تمام لوگوں سے دور رہنے، اور کئی کئی دنوں تک اپنا چہرہ نہ دکھانے کا جو جرم کیا ہے، وہ ناقابلِ تلافی ہے۔ چونکہ ان کی صورت دیکھے بنا کسی کو آرام نہیں اور اس کی موجودگی کے بناء ہر جگہ ویران رہتی ہے، لہٰذا یہ عدالت ملزمہ کو یہ سزا سناتی ہے کہ وہ تاعمر سبھی کی آنکھوں کے سامنے رہے، سزائے عمر قید کاٹے۔''

عسفان بڑی ادا سے بولا...... سبھی نے تالیاں بجانی شروع کیں۔ عسفان کی ما اداکاری پہ وہ اُس کی ذومعنی بات سمجھ چکی تھی۔

نتالیہ نے چور آنکھوں سے ایک بار پھر اُسے دیکھا اور وہ شوخ سی آنکھوں اور شر مسکراہٹ سے دادطلب آنکھوں سے اُسی کی جانب تک رہا تھا۔



''ڈیئر کزن! تمہاری چوائس مجھ سے زیادہ اچھی ہے۔ عسفان بھائی کو تمہارا خریدا گفٹ بے حد پسند آئے گا۔''

''لیکن انزلہ! تم اُس کی پسند ناپسند سے زیادہ اچھی طرح واقف ہو۔ پلیز! میرے ساتھ چلی چلو۔ کل اُس نے اتنا اچھا ڈنر کروایا ہے، اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ آ کسی نہ کسی گفٹ کا مستحق تو بنتا ہی ہے۔'' نتالیہ اُسے راضی کرتے ہوئے بولی۔

''اوکے...... چلی چلوں گی۔ لیکن زیادہ دیر نہ کرنا۔ آج مجھے اپنی کلاس فیلو فریحہ ک طرف بھی جانا ہے۔''

''پورے پانچ بجے میں پہنچ جاؤں گی۔ بس تم گاڑی تیار رکھنا۔'' وعدہ کرتے ہو اُس نے فون رکھا۔ احسن مشکور سامنے رکھی کرسی پہ بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا، پوچھ بیٹھا۔

''کس کو گفٹ دینے کے لئے اتنی پلاننگ ہو رہی ہے نتالیہ......؟''

''میرا کزن ہے ناں، عسفان۔ اُس نے ایم بی اے میں ٹاپ کیا ہے۔ ہمیشہ مجھے کوئی نہ کوئی گفٹ دیتا رہتا ہے۔ سوچ رہی ہوں، اُسے اس بار میں بھی کوئی گفٹ دوں۔'' وہ مسکرا کے بولی۔

''امی اور ماما تمہیں بہت یاد کر رہی تھیں۔ ملنا چاہتی ہیں تم سے۔ کہو تو آج چلیں گھر؟'' احسن نے بات کا پہلو بدلا۔

''آج نہیں احسن! آج انزلہ کے ساتھ وعدہ کیا ہے۔ ویسے بھی کل ماموں سمیت سبھی ناراض تھے کہ میں گھر میں رہتی ہی نہیں ہوں۔ سوچ رہی ہوں، اب جلدی جایا کروں گی۔ آنٹی اور ماما سے ملنے پھر کسی روز چلیں گے۔ تم اُنہیں میرا سلام کہہ دینا۔'' وہ بولی۔

''کہا تھا میں نے اُنہیں کہ نتالیہ احمر اب وہ کالج والی نتالیہ نہیں رہی کہ جو اکثر ملنے آ جایا کرتی تھی۔ بہت مصروف ہوگئی ہے وہ۔ وقت ہی نہیں ہوتا اس کے پاس۔'' احسن نے بھی دبی دبی شکایت کی۔

اُس کے چہرے پر کچھ اُداس سائے آ کے ٹھہر گئے۔ اُس کا چہرہ شام کے رنگوں میں ڈھل گیا۔

''ہاں احسن!...... صحیح کہتے ہو تم۔ میں نے جان بوجھ کر خود کو اتنا مصروف کر لیا ہے تاکہ میں اپنے بارے میں سوچ ہی نہ سکوں کہ میں کون ہوں، میری حیثیت، میری اصلیت کیا ہے۔ میرے ماں باپ نے مجھے کیوں پیدا کیا۔ پیدا کر کے دنیا میں اکیلا چھوڑ دینے کے لئے۔ اور جنہوں نے میری پرورش کی، وہ میرے ماں باپ کیوں نہیں۔ اُن کی محبتیں بھی احسان جیسی کیوں لگتی ہیں۔ تقدیر لکھنے والے نے میرے حصے میں کیا لکھا ہے؟ کیا تھا اگر بابا نہ مرتے؟...... یا امی...... امی میری خاطر دوسری شادی نہ کرتیں۔ احسن! اگر میرے پاس وقت ہو تو میں ان چیزوں کے متعلق سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ میں ان کے متعلق سوچوں ہی نہیں۔''

''نتالیہ! ماضی کی محرومیوں کے بارے میں سوچ سوچ کے تم خود کو پریشان ہی کرو گی۔ تم سوچا کرو اپنے مستقبل کی کامیابیوں کے بارے میں، اپنی خوشیوں کے بارے میں اور اللہ تعالیٰ سے اچھی اچھی دعائیں مانگا کرو...... دیکھنا، ان باتوں سے ماورا کر دے گا وہ رب تعالیٰ تم کو۔''

احسن نے ایک اچھے دوست کی طرح اُسے تسلی دی۔ وہ کچھ لمحے چپ رہی۔

"اچھا احسن!...... انزلہ انتظار کر رہی ہو گی...... میں چلتی ہوں۔" اُس نے ا
فائل اور ہینڈ بیگ اُٹھایا اور چلنے لگی۔



"ڈیئر کزن!...... کہا ناں کہ عسفان بھائی کو میوزک اور شاعری میں بہت دلچ
ہے۔ یا تو میوزک کی کوئی سی ڈی خرید لو، یا پھر شاعری کی کتاب۔" انزلہ نے گاڑی ڈرا
کرتے ہوئے کہا۔
"وہی گھسے پٹے پرانے گفٹ۔ سی ڈی، کتاب، ڈائریاں وغیرہ وغیرہ۔ یار! کیا تم
نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ اسی طرح کی چیزیں گفٹ کی جا سکتی ہیں؟" ثنالیہ جھنجھلائی تھی۔
"اور بھی بڑی چیزیں گفٹ کی جا سکتی ہیں، جیسے کہ جذبات، چاہت، وفا، محبت وغیرہ
اور ویسے بھی عسفان بھائی انہی چیزوں کی توقع کرتے ہیں تم سے۔" انزلہ نے ڈر
ڈرتے ہی مگر سچ بات کہہ دی۔
وہ چونک اُٹھی تھی...... سچ بات کتنی آسانی سے کر دی تھی انزلہ نے۔ وہ سچ کو جھوٹ
بہروپ دے کر جی رہی تھی اور پوری دنیا اُس کے بہروپ کو بھانپے ہوئے تھی۔ وہ تو جا
ہی نہ تھی کہ اس کے علاوہ بھی کوئی واقف ہے ان جذبات سے، جو عسفان کے دل میں اُ
کے لئے تھے۔
"شٹ اپ انزلہ!...... اس طرح کی باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔" وہ بدکی تھی۔
"کیوں نہیں اچھی لگتیں؟ ثنالیہ! اب ایسی بھی کیا بے حسی؟ کیوں اس طرح نظر اندا
کر رہی ہو عسفان بھائی کی محبت کو؟...... کیا تم بھولی ہو، نہیں جانتی کہ وہ بندہ کس قد
انوالو ہو چکا ہے، کس قدر تحلیل ہو چکا ہے۔ ایسا تو نہیں کہ پوری دنیا جان گئی ہے اور ت
انجان ہو۔ یہ انجان بننے کا ڈرامہ کب تک کرو گی ثنالیہ؟" انزلہ اُس پر بھڑک ہی اُٹھی تھی۔
"یہ تمام چیزیں میرے لئے سطحی ہیں۔ غیر ضروری وقت کا زیاں۔ مجھے کوئی شوق نہیں
کسی کی محبت کی اسیری برداشت کرنے کا۔ چوبیس گھنٹے فضول باتوں کو سوچ سوچ کر ا
زندگی برباد کرنے کا خواب دیکھنے اور آنسو بہانے کا۔ اور نتیجے میں محرومیاں حاصل کر
کا۔ میں بہت چین کی زندگی جی رہی ہوں۔ مجھے جینے دو۔"
اُس کے لہجے کا اطمینان قابلِ غور تھا۔ انزلہ نے پل بھر اُسے غور سے دیکھا تھا۔ "مت
کرو اپنی زندگی کو بے چین...... مت سوچو اسے چوبیس گھنٹے۔ ہاں، لیکن اگر تمہارے دل
میں اس شخص کے متعلق کوئی بھی احساس جاگے تو اس کو دبانا نہیں، ورنہ تمام عمر اس احساس

کی روحیں تمہارے دل کے کھنڈروں میں بے چین بھٹکتی رہیں گی۔" انزلہ نے بہت سنجیدگی
سے کہا تھا۔
"ہونہہ...... سب کتابی باتیں ہیں۔ یہ محبت سوائے غلامی کے کچھ نہیں۔ تمام عمر اپنے
ماتھے پر کسی کے نام کا لیبل چپکائے رہو۔ اُس کی طرف سے ملنے والے ہر غم کو برداشت
کرو۔ بے عزتی، تذلیل، نفرت، ہر چیز برداشت کئے جاؤ اور پھر بھی کسی بت کی طرح اس
کی پرستش کئے جاؤ۔ نفرت ہے مجھے مردوں کی غلامی سے۔ نفرت...... نفرت ہے مجھے
محبت سے۔" اُس کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ اُس کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا۔
"کم آن ثنالیہ! تم جیسی حقیقت پسند لڑکی بھی اس طرح کی باتیں کرے، بات کچھ سمجھ
میں نہیں آتی۔ اچھا، فرض کرو اگر عسفان بھائی اپنا رشتہ بھیجیں تمہارے لئے تو کیا کرو گی؟"
انزلہ نے ایک اور پوائنٹ رکھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔
"بولو، انکار کر دو گی یا پھر یہ کہہ دو گی کہ مجھے تمہارے نام کا لیبل اپنے ماتھے پر نہیں
چپکانا۔ دفع ہو جاؤ۔"
"جب ایسا ہوا، تب سوچوں گی۔ فی الحال تم گاڑی اس دُکان پہ روکو۔ میرا خیال ہے،
یہاں سے کچھ اچھا مل سکتا ہے۔"
ثنالیہ نے مسکرا کر گاڑی ایک میوزیکل انسٹرومنٹس کی دُکان پہ رُکوائی اور وہاں سے
عسفان کے لئے ایک گٹار خریدا اور گھر واپسی کا راستہ لیا۔



اُس کے آسٹریلوی طوطوں کی دو جوڑیاں تھیں۔ ایک سبز رنگ کی اور دوسری نیلے اور
سرخ رنگ کی۔ آج جب وہ شام کو گھر لوٹی تو ایک سبز رنگ کے طوطے کو پنجرے میں مرا ہوا
پایا۔ وجہ کیا تھی، وہ جان ہی نہ پائی۔ وہ تو روزانہ باقاعدگی سے اُنہیں پانی اور کھانا دیا کرتی
تھی، پھر کیا وجہ ہو سکتی کہ وہ مر گیا۔ اس طوطے کو ہاتھ میں اُٹھائے وہ کتنی دیر آنسو بہاتی
رہی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ اُس کا بہت ہی قریبی دوست کہیں دور چلا گیا ہو۔
اُس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔ وہ کتنی دیر روتی رہی تھی اور پھر انزلہ کو
بتانے کے لئے باہر آئی۔ وہ لاؤنج سے گزر رہی تھی کہ اندر کمرے میں آنٹی کو کسی سے فون پہ
باتیں کرتے ہوئے سنا۔
"میں تو کہتی ہوں آپی! یہ لڑکی جادوگرنی ہے، پوری جادوگرنی۔ پتا نہیں اس نے کیا گھول کے
پلایا ہوا ہے سب کو۔ مبشر، ارسل، انزلہ سمیت سبھی اس کے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ اور تو اور

اب اُس نے عسفان کو بھی پھنسا لیا ہے۔ اُس دن دعوت والی رات کیا تھا میں نے
عسفان پر۔ بار بار اُسی کو دیکھے جا رہا تھا...... کتنا ارمان ہے مجھے کہ انزلہ، عسفان کی دُلہ
بنے۔ لیکن لگتا ہے، یہ نتالی پھنسا لے گی اپنی خالہ سمیت عسفان کو بھی۔ اپنی ماں پر جو
ہے۔'' اپنی ممانی کے منہ سے اپنے لئے اس طرح کے لفظ سن کر اُس کا سر چکرانے لگا
پاؤں تلے زمین کھسکنے لگی۔ آنسو تر بتر اُس کے رخساروں پہ پھیلتے جا رہے تھے۔ تبھی سا
کچن سے انزلہ نکلی اور اُسے اس طرح روتا دیکھ کر اُس کے پاس آئی۔

''کیا ہوا تمہیں؟...... کیوں رو رہی ہو؟''

اب وہ اُسے کیا بتاتی کہ اس قدر گریز کرنے کے باوجود بھی اُسے گنہگار ٹھہرایا گیا تھا
لیکن اُس کے اندر کے ہزاروں اصول اُسی کے منہ پر دھتکار رہے تھے کہ جن پہ ڈ
رہنے کے باوجود بھی وہ بدنام ہوئی تھی۔ کیا فائدہ ہوا تھا جذبات چھپانے کا، ا
احساسات کا گلا گھونٹنے کا۔ اُس کا دامن تو پھر بھی داغ دار ہوا تھا۔ اُس کے کردار پہ تو
بھی چھینٹے پڑے تھے۔

''بولو ناں...... کیا ہوا؟'' انزلہ نے اُسے جھنجوڑا۔ اُس نے اپنے ہاتھ پہ ر
طوطے کی لاش اُسے دکھائی۔

''کیا ہوا اس کو؟'' انزلہ سمجھ گئی۔

''پتہ نہیں انزلہ!...... اتنا سنبھالنے کے باوجود بھی یہ بکھر گیا۔ نہیں رہا۔'' وہ ذو
بات کہہ گئی تھی۔ آنکھوں سے بہنے والے آنسو اُسے دل میں چبھتے محسوس ہو رہے
مسلسل رونے کے باوجود وہ دل کو ہلکا نہ کر پائی تھی۔ اندر ایک اشتعال تھا کہ اُسے منت
کئے جا رہا تھا۔ اِک ٹوٹ پھوٹ کا احساس تھا کہ جس کی کرچیاں وہ اپنی روح کو زخمی کر
محسوس کر رہی تھی۔

''اپنی ماں پر جو گئی ہے......''

آنٹی کے لفظ اُس کی سماعتوں میں گڈمڈ ہو کر اِک طوفان سا مچا رہے تھے۔ اُس
بے چینی کے عالم میں اپنا سیل فون اُٹھایا اور اپنی ماں کے گھر کے نمبرز ملائے۔ رات
پہر دوسری جانب فون فائزہ بیگم نے ہی اُٹھایا تھا۔

''کون ہے اس وقت؟'' وہ بولی تھیں۔

''میں ہوں...... نتالیہ احمد...... بدقسمتی سے جو تمہاری بیٹی بھی ہے، اور اس وجہ
دنیا بھر میں بدنام ہے۔ کچھ نہ کر کے بھی قصوروار ٹھہری ہے۔ گریز کر کے بھی تہمتیں کما

ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ تمہاری بیٹی ہے۔''

اُس کی آنسوؤں سے بھیگی آواز میں غصہ بھی تھا۔

''نتالیہ!...... بیٹے! کیا ہوا ہے؟'' ممتا بھرے دل میں اُس کی باتوں سے اک کسک
سی اُٹھی۔ اِک درد سا جاگا۔

''تم کون ہوتی ہو مجھ سے سوال کرنے والی؟ سوال تو آج میں کرتی ہوں تم سے کہ
آخر کس کے لئے پیدا کیا تم نے مجھے؟...... صرف دنیا کے الزام سہنے کے لئے؟ اُن کی
باتیں سننے کے لئے؟ زندگی بھر گردن جھکائے، ڈر ڈر کر جینے کے لئے؟...... ہر احساس
سے گریز کرنے کے لئے؟ ہر سانس مجرموں کی مثل لینے کے لئے؟ ہر قدم تنہائی کے
احساس میں گھر کے اُٹھانے کے لئے؟ آخر کیوں زندگی دینے کا احسان کیا مجھ پر تم نے؟''

وہ پھٹ پڑی تھی۔ فائزہ بیگم کی آنکھیں بھی بیٹی کے ہمراہ بہنے لگ گئی تھیں۔

''اور اگر پیدا کر ہی لیا تھا تو دنیا میں سر اُٹھا کے جینے کے قابل تو بنا دیتیں۔ عزت کی
زندگی ہی دے دیتیں۔ چین کی سانسیں تو دے دیتیں ماں!'' اُس کی سسکیاں ائیر پیس میں
گونج رہی تھیں۔ فائزہ بیگم کے پاس اُس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اُسے کیا
بتاتیں کہ اُس کے والد احمر صدیقی کو کھو کر اُس نے کیا کھویا تھا۔ اُس کی پیدائش کے بعد کے
دن کس قیامت میں کاٹے تھے۔ بھابیوں کی باتوں سے گھبرا کر مجبوراً دوسری شادی پہ راضی
ہوئی تھی اور شادی کے بعد جب شوہر نے نتالیہ کو اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کیا تو اس پر کیا
گزری تھی، کیا بتاتیں وہ اپنی اُس بیٹی کو، جو اُس کی پہلی محبت احمر صدیقی کی آخری نشانی
تھی۔ جس کی ہر ہر ادا اُسے احمر صدیقی کی یاد دلاتی تھی۔ جسے اُس نے اور احمر نے کتنا
مانگ کے لیا تھا اللہ سے۔ وہ اُسے کیا بتاتیں کہ ابھی تک اُس کے ہر جنم دن پر وہ کتنا روتی
رہی ہیں اُس کے لئے...... وہ اُسے کیا بتاتیں؟

اُس نے فون آف کر کے بیڈ پر پھینک دیا اور فائزہ بیگم دیر تک روتی رہی تھیں۔



روتے رہنے کی وجہ سے اُسے پہلے شدید سر درد نے پکڑا اور پھر جلد ہی وہ سر درد بخار
بن گیا۔ مجبوراً اُسے کورٹ سے چھٹی کرنی ہی پڑی۔ اپنے کمرے کی بالکنی میں لٹکے باقی
دونوں طوطوں کو پنجرے سے آزاد کر دیا اور کھلی فضاؤں کے سپرد کر دیا۔

وہ بستر پر لیٹی کتاب پڑھ رہی تھی کہ جب اُس کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی
دستک ہوئی اور اس کے جواب دینے پر عسفان اندر آ گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں نفیس سے

سفید پھولوں کے گجرے تھے۔ اُسے دیکھ کر ایک بار پھر نتالیہ کے دل میں اِک چھناکا ہوا تھا۔ وہ چہرہ، نجانے کیوں دل کی حالت دگرگوں کر دیتا تھا۔ کیوں وہ خال و خد عام ہوتے ہوئے بھی دل کے عمیق ترین گوشوں میں بس گئے تھے۔

''بہت افسوس ہوا........ نہ صرف تمہارے دوست طوطے کی موت پر، بلکہ اس بات پر بھی کہ تم نے رو رو کر خود کو بیمار کر دیا ہے۔'' عسفان کے چہرے پہ خفگی تھی اور آنکھوں میں اپنائیت۔ وہ چپ ہی رہی تھی۔

''اتنا سوگ تو کوئی انسانوں کی موت پہ بھی نہیں مناتا۔ پاگل لڑکی!''

''کسی کو کیا پتہ کہ محبت انسانوں سے نہیں کی جاتی محبت اور اپنے پن کے اور بھی بہت سے رشتے ہوتے ہیں۔ ہماری ارد گرد کی چیزوں سے ہماری محبت بھی بہت معنی رکھتی ہے۔'' اُس کا لہجہ اُداسی میں ڈوبا تھا۔

''صحیح کہتی ہو تم۔ میرے پاس بھی ایک شرٹ ہے، پانچ چھ سال پرانی۔ مگر میں آج بھی اسے پہنتا ہوں تو مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ حالانکہ وہ پھٹ چکا ہے، اُس کا کالر اُدھڑ چکا ہے، لیکن مجھے لگتا ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ اور بالکل اسی طرح، امی کے پاس اُن کی بلی تھی۔ مانو........ امی اُس سے بہت مانوس تھیں۔ جب اُسے باہر کوئی جانور کھا گیا تو بہت روئیں، تمہاری ہی طرح۔ نتالیہ! یہ تمام محبتیں اور اپنے پن صحیح ہیں۔ لیکن اس طرح رو کر خود کو ہلکان مت کرو۔'' وہ لہجہ درد آشنائی کا روپ اوڑھے تھا۔ نتالیہ کے دل میں سے چبھن ہوئی۔

''میں نے آپ کے لئے ایک گفٹ لیا تھا۔ آپ کو دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اِک منٹ۔'' یہ کہہ کر وہ بستر سے اُٹھی اور الماری سے گٹار نکالا۔

''یہ لیں........ اُمید ہے، پسند آئے گا۔ آپ کی کامیابی کی خوشی میں دیا ہے۔'' وہ بھر کو مسکرائی تھی اور ساتھ ہی اُس کی آنکھیں بھی لو دینے لگی تھیں۔

''بے حد شکریہ! لیکن اس کی قطعی کوئی ضرورت نہ تھی۔'' وہ بہت خوش ہوا تھا۔

''کیوں........ کیا میں آپ کو کوئی تحفہ نہیں دے سکتی؟ کزن لگتی ہوں آپ کی۔''

''شکر ہے، آپ نے یہ تو تسلیم کیا کہ ہمارا آپ سے کوئی رشتہ ہے۔'' وہ آنکھوں میں جھانک کے بولا۔ اُس کی آنکھیں جھک گئیں۔

''یہ تمہارے طوطے کہاں گئے؟ پنجرہ خالی پڑا ہے۔'' وہ اُس کے گریز کرنے کو بھانپ گیا تھا، اسی لئے بات کا رُخ تبدیل کیا۔

''آزاد کر دیئے سارے۔ کیا فائدہ پہنچا رہی تھی میں اُن کو۔''

''لیکن وہ دیکھو........ وہ والا سبز طوطا تو وہاں کونے میں ابھی بھی بیٹھا ہے۔''

عسفان نے اُس کی توجہ دلائی، جہاں سبز طوطا ابھی بھی بیٹھا تھا۔

''یہ وہی طوطا ہے، جس کا ساتھی کل مر گیا تھا۔ میں اسے بار بار اُڑاتی ہوں عسفان! اور یہ بار بار واپس آ جاتا ہے۔ پتہ نہیں کیا وجہ ہے۔ شاید اس کے پروں میں کوئی مسئلہ ہو۔'' وہ حیرانی سے بولی۔

عسفان اُٹھا اور اُس سبز طوطے کو پنجرے کے اندر ڈالا۔

''جانتی ہو نتالیہ! یہ طوطا بار بار کیوں واپس آ جاتا ہے؟'' اُس کے پوچھنے پر اُس کی گردن نفی میں ہلی تھی۔

''کیونکہ یہ اپنے ساتھی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ شاید اسے پتہ لگ بھی گیا ہو کہ اُس کا ساتھی اس سے بچھڑ چکا ہے۔ لیکن پھر بھی اُس کی روح اس پنجرے میں بس گئی ہے۔ کیونکہ اس پنجرے میں ہی سہی، وہ دونوں ساتھ تھے........ اس طوطے کے پَر اور اُس کی اُڑان اس کی محبت تھی........ یہ یہاں سے کہیں نہیں جائے گا۔ جب بھی اُڑاؤ گی، واپس آ جائے گا۔''

عسفان نے پنجرے کا دروازہ بند کر دیا اور نتالیہ کے قریب آ گیا۔

''اور بالکل اسی طرح........ میرے پَر اور میری اُڑان بھی میری محبت ہی ہے۔ میری روح بھی تمہارے دل کے پنجرے میں بس چکی ہے۔ جسے تم چاہ کر بھی آزاد نہیں کر پاؤ گی۔'' اُس نے اُس کے بہت قریب صورِ اسرافیل پھونکا۔ اظہار کا نقارہ اُسے اپنے کانوں کے اندر بجتا محسوس ہوا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں تھی۔

''مجھے تم سے محبت ہے۔'' دو ہونٹ پھر ہلے تھے۔

''چلے جایئے عسفان!........ چلے جایئے میرے کمرے سے۔'' وہ دل پر جبر کرتے ہوئے بولی۔

''مجھے یہ بھی علم ہے کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے، اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کن فضول باتوں کی وجہ سے تم گھبراتی ہو۔ ایک دن........ نتالیہ! ایک دن میں ضرور تمہیں اپنا بناؤں گا۔ یہ وعدہ ہے میرا تم سے۔'' صداقت بھرے عزم سے یہ کہہ کر اور گٹار اُٹھا کر وہ یہ کہتے ہوئے کمرے سے جا چکا تھا اور وہ قسمت کی دلدلوں میں دھنسنے لگی تھی۔ وہ آئینے سے بھاگ رہی تھی اور آئینہ خود اُس کے روبرو آ کھڑا ہوا تھا۔

❖❖()❖❖

"بہت اُداس لگ رہی ہو......خیر تو ہے؟ گھر پہ کچھ ہوا ہے کیا؟" اُسے اُدا
دیکھ کر احسن نے سوال کیا تھا۔
"نہیں، گھر پہ تو کیا ہونا ہے۔ احسن! میں ہاسٹل شفٹ ہونے کا سوچ رہی ہو
خیالوں سے چونکی ہی تھی۔
"کیوں......ایسا کیا ہو گیا ہے کہ تم اتنا بڑا فیصلہ کر رہی ہو؟"
"ویسے ہی خیال آ گیا ہے کہ میں کب تک ماموں کے احسانوں تلے دبی رہ
کب تک اُن کی نرم دلی سے فائدہ اُٹھاؤں گی۔ اُنہوں نے مجھے پڑھا لکھا کر اس
دیا ہے کہ میں اپنے بل بوتے پر کچھ کر سکتی ہوں، تو کیوں میں خوامخواہ اُن پر اپنا بو
رہوں؟" وہ کسی غیر مرئی نقطے پر آنکھیں ٹکائے بولی تھی۔
"نتالیہ!......زمانہ ایک ایسا جنگل ہے کہ جہاں اپنوں کی پناہ گاہیں بہت
ہیں۔ جیسے ہی کوئی عورت اپنوں کی چھت سے باہر نکلتی ہے، دنیا اُس پر بہت تنگ
جاتی ہے اور دنیا والے جنگلی بھیڑیوں کی مانند اُس پر جھپٹتے ہیں۔" احسن کے
اپنائیت بھری دوستی تھی۔
"کہتے تو تم ٹھیک ہو احسن! لیکن ایک چھت کے نیچے کی حفاظت کے بد
نہیں سہنا پڑتا ایک عورت کو...... چاہے وہ چھت اُسے باپ مہیا کرتا ہے یا ش
کے بدلے میں اس سے نجانے کیا کیا توقع رکھتا ہے۔ باپ اُسے اپنی عزت و
بیٹیاں پڑھا پڑھا کر شوہر کے حوالے کرتا ہے اور شوہر زندگی بھر اپنی انا اور عزت کا
بنا کر اپنی تجوریوں میں بند رکھتا ہے۔"
"لیکن......تم آخر کیوں وہ گھر چھوڑنا چاہتی ہو؟ کچھ سمجھ تو آئے۔"
"بس......اب مجھے لگتا ہے کہ اُس گھر کی دیواریں مجھ پر تنگ ہوتی جا
آہستہ آہستہ سرکتی سرکتی مجھ سے سمٹتی جا رہی ہیں۔" اُس کے لہجے میں تنہائیوں کی گ
"کچھ اور بھی تو حل ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں تمہیں ہاسٹل میں شفٹ ہ
بجائے کچھ اور سوچنا چاہئے۔" احسن نے اُسے مشورہ دینا چاہا۔
"کچھ اور کیا؟"
"یہی کہ تم شادی کر لو۔" اُس کی بات پہ وہ یقیناً چونکی تھی۔ اُس کے سامنے اُ
تو پھٹا تھا۔
"شادی کر لو گی تو خود بخود تمہیں اک نئی پناہ گاہ ملے گی اور حفاظت بھی۔"

"ہاں......تمہارے خیال میں یہ میرے لئے اچھا ہو گا۔ مٹی کا پنجرہ بیچ کر لوہے کا
ہ خرید لینا۔" وہ تمسخرانہ مسکرائی تھی۔
"تھوڑا سا حقیقت پسند ہو کے بھی سوچا کرو......کیوں ہر وقت اللہ کی پوری کائنات
انے پھوڑنے پر تلی رہتی ہو؟ شادی کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔" احسن نے اُسے ڈانٹا ہی تھا۔
"دنیا میں کیا ملا ہے ان لوگوں کو جنہوں نے شادی کی ہے؟......میری ماں نے بھی
ار شادی کی اور نتیجہ کیا ہوا؟ ایک شادی سے انہوں نے اپنی اولاد کو برباد کیا اور دوسری
لود کو۔ اگر شادی ہر مسئلے کا حل ہوتی ناں احسن! تو دنیا بھر کے لوگ آج اپنے غموں کا
وہ اُٹھائے اپنی بربادی کا ماتم نہ منا رہے ہوتے۔" وہ جھنجلا گئی تھی۔
"پتہ نہیں، تمہارا دل پتھر کا کیوں ہے؟ اور اگر ہے بھی تو کیا کوئی ایسا ہے، جو اس پتھر کو
لا سکے، اس کو محبت کرنا سکھا سکے۔" احسن نے اپنا سر تھام کے کہا اور اُس کے کہے اس
نتالیہ کے دل میں عسفان کا چہرہ مسکرایا تھا اور دل میں اِک سرگوشی سی ہوئی تھی۔
"مجھے تم سے محبت ہے......"
اُس کے گلے میں اِک گولا سا اٹکا تھا۔ آنکھ نم سی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنا سر ٹیبل پر
کا دیا۔



چھٹی کا دن تھا۔ وہ بالکنی میں کھڑی صبح کی موہوم دُھوپ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔
ہر بار نظریں سامنے عسفان کے کمرے کی کھڑکی پہ چلی جاتیں۔ آسمان پر بادلوں کے
کالے ٹکڑے تیر رہے تھے، لیکن ستمبر کی دُھوپ اُن کو چیر کر کسی پالتو بلی کی طرح آ کر کمرے
میں بیٹھ جاتی۔ ظاہری طور پر تو اُس کے سامنے شہر کا رستہ تھا، لیکن دل کی آنکھوں میں
عسفان ہی براجمان تھا۔ وہ کبھی مسکراتا تھا، کبھی قہقہے لگاتا تھا تو کبھی خاموشی سے دل کے
اندر جھانکنے کی سعی کرتا تھا۔ اُس کی محبت نے انتہائی خاموشی سے اُس کے گرد ایک ہالہ سا بنا
رکھا تھا۔ ہر موسم، ہر رُت میں وہ اُس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس خاموش محبت کے مدھم سے
احساس نے بھی اُسے کتنا تبدیل کر دیا تھا۔ وہ پہلے کیا تھی، اور اب کیا ہو گئی تھی۔ وہ اس
کھڑکی کے اس پار لٹکتے پنجرے کو دیکھ دیکھ کے سوچ گئی۔ آج پہلی بار اُس کا بہت دل کر
رہا تھا عسفان سے ملنے کو، اُسے دیکھنے کو، اُس کی باتیں سننے کو۔ ابھی اُس کے پرپوزل والی
بات مکمل طور پر کھلی نہ تھی۔ ابھی تو ماموں نے یہ بات نیم رضامندی کے ساتھ خالہ کو کہی
تھی۔ آخری فیصلہ تو خود نتالیہ نے کرنا تھا اور اُس نے یقیناً ہامی بھر لینے کا سوچا تھا۔

اُس نے اپنی وارڈروب سے نیلا سوٹ نکالا، جس پہ پی کاک کلرز کی کڑھائی کی تھی۔ اسے پہن کر اُس نے اپنے بال کھلے رکھے اور خالہ کے گھر کی طرف کا رُخ کیا۔ بجائی تو دروازہ خالہ نے کھولا۔

"خالہ جانی!" وہ بہت پیار سے اُن سے لپٹ گئی تھی۔

"میری بچی!....... کتنے دنوں بعد چہرہ دکھا رہی ہو۔ اور شکر ہے، خالہ کے گھر ہی آ جانے کو دل چاہا۔ ورنہ تو تجھے بس کھڑکی سے آتے جاتے ہی دیکھتی ہوں۔" خالہ نے شکوہ کیا۔

"کیا کروں خالہ جانی! میری ملازمت ہی ایسی ہے۔"

"بس بند کرو اب یہ عدالتوں کے چکر اور آ کے گھر سنبھالو میرا۔ اب ان بوڑ ہاتھوں میں اتنی طاقت نہیں رہی کہ سب کچھ سنبھال سکوں۔" خالہ نے وہ پیار بھری فرما کی تھی، جو ہر بیٹے کی ماں اپنی بہو سے کرتی ہے۔ وہ شرما ہی تو دی تھی۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو اس روپ میں....... دل کرتا ہے، فوراً تمہیں اپنے گھ چاند بنا لوں۔" کوثر بیگم نے کچھ زیادہ ہی ارادہ کر لیا تھا اُسے چھیڑنے کا۔

"آج کیا بنا رہی ہیں خالہ جانی؟" اُس نے بات کا پہلو بدلا تھا۔

"مٹر چاول اور کڑھی بنانے کی فرمائش کی ہے آج میرے شہزادے نے۔ فی الحال تو بنانے کا آرڈر آیا ہے عسفان کی طرف سے۔"

"میرا بھی موڈ ہو رہا ہے کافی پینے کا، خالہ جانی! میں بنا لوں کافی؟" اُس کی مع خواہش پر خالہ مسکرا دی تھیں۔

پھر وہ کچن میں گئی، کافی بنائی اور اسے مگ میں ڈال کر باہر آئی۔

"کہاں ہیں عسفان، خالہ جانی؟"

"اپنے کمرے میں ہے۔" خالہ کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ وہ عسفان کے کمرے طرف آئی۔ دروازہ کھلا تھا۔ سبز جارجٹ کے باریک پردے کے اس طرف وہ بیڈ پہ دراز تھا۔ اُس کے ہاتھ میں گٹار تھا۔ کمرے میں اے سی کی خنکی تھی۔ اُس کے ہاتھ گٹار تاروں پر تھے اور ہونٹوں پر گیت کے بول تھے۔

"ملنے والوں کے سب سوالوں میں
کل بھی تم تھی، آج بھی تم ہو
ان سوالوں میں، جو اشارے ہیں

دیکھنا ان کا بھید کھل جائے گا
نہ تُو آئے گی، نہ ہی چین آئے گا
میرے آنگن کی ساری بیلوں کا، پتا پتا ٹوٹتا جائے گا
نہ تُو آئے گی....... نہ ہی چین آئے گا"

گٹار پہ ہاتھ مہارت سے چل رہے تھے۔ کمرے میں بہت پیار بھرے سُر بکھر رہے تھے۔ اُس نے اپنی اُنگلی سے دروازے پہ دستک دی۔ عسفان کے ہاتھ رُک گئے اور اُس نے دروازے کی طرف دیکھا اور اُسے باریک پردے کے ساتھ ہی ہاتھ میں ٹرے پکڑے اس خوب صورت روپ میں دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ نیلے رنگ کے سایوں میں اُس کے چہرے کی رنگت کس قدر شفاف نظر آتی تھی۔ اور اُس کے بھیگے بالوں کی دلکش لٹیں اُسے کتنا حسین بنا دیتی تھیں۔

"آپ....... زہے نصیب....... یہ آج دن میں کس طرح چاند چلا آیا؟ اور وہ بھی کھڑکی کے بجائے دروازے سے؟" وہ مسکرایا تھا۔ "ویسے ہی میں خوش فہمی میں مبتلا ہو رہا تھا۔ بائی دی وے، کافی کے لئے شکریہ۔"

"آپ گانا بہت اچھا گاتے ہیں۔ اور گٹار بجانا بھی واقعی آتا ہے آپ کو۔" اُن دونوں کے مابین پہلی بار ہی ہلکی پھلکی باتیں ہو رہی تھیں۔

"شکریہ....... ہماری کوئی ادا پسند تو آئی۔ میں تو یہی سمجھتا آیا ہوں آج تک کہ تم مجھے ناپسند ہی کر سکتی ہو۔ تمہارے دل میں میرے لئے کبھی کوئی انوکھا احساس جنم نہیں لے سکتا۔"

"پھر تو آپ کی سوچ بالکل غلط ہے۔ کبھی کبھی کچھ انسان بدل بھی جاتے ہیں۔" وہ مسکرا کے اُٹھی اور اپنے طوطے کی طرف آئی۔

"بڑی چوری چھپے اُٹھوا لیا اس طوطے کو آپ نے۔ مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔" وہ پنجرے کو ہلاتے ہوئے بولی۔

"اِک اُمید تھی دل میں کہ شاید پرانے زمانے کے جادوگروں کی طرح تمہاری جان بھی اس طوطے میں ہو۔ اور دیکھو، یہ اُمید درست ہو گئی۔ طوطے سے ملنے کے بہانے ہی تم میرے کمرے میں تو آئیں۔" کافی کے ہلکے ہلکے سپ لیتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔

"آپ کی باتیں کبھی کبھی بہت افسانوی ہو جاتی ہیں۔ سچ کہوں تو میں آپ سے ملنے آئی تھی۔" اقرار کا کوئی جملہ پہلی دفعہ زبان پہ آیا تھا۔

"پہلی بار تمہاری زبان سے میٹھی بات سن کر بہت عجیب لگ رہا ہے....... عادت نہیں ہے ناں اس طرح کی باتوں کی۔" وہ اُسے غور سے دیکھنے گیا۔ یک ٹک۔

"آپ بار بار میری طرف اس طرح دیکھتے ہیں، جیسے میں کوئی جن بھوت یا پھر داستان میں جادوگر ہوں۔ کیا اس وسیع دنیا میں آپ کی آنکھوں کو دیکھنے کے لئے اور کچھ نہیں ملتا؟"

اُس کی بات پہ وہ مسکرایا تھا۔ بکھرے بال، آرام دہ کرتے میں وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اُٹھا، اُس کے پاس آیا اور پنجرے کی دوسری جانب کھڑا ہو گیا۔ پنجرے کی سنہری جالی کے اس طرف اُس پری پیکر کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں، جن آنکھوں میں پہلی بار اُداسیوں کے سایوں کی جگہ وفاؤں کے ان گنت ستارے تھے۔

"مجھے تم سے محبت ہے......." وہ سرگوشیانہ لہجے میں گنگنایا تھا۔ وہ مسکرا کے دُور ہٹ گئی تھی۔

"کہتے ہیں، جس چیز سے زیادہ محبت کی جائے، وہ زمین میں کہیں گم ہو جاتی ہے۔" عسفان نے اُس کا ہاتھ تھاما۔ اُس کے لمس سے بدن میں کپکپی سی دوڑی تھی۔

"تمہیں مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ نہ آسمان اور نہ زمین۔" اُس کے تیقن سے بھرے لہجے بھی سچائی تھی۔ وہ اُس کی جانب دیکھنے گئی۔ اچانک ہی اُس کے چہرے پر یاسیت کے سائے پھیل گئے۔ وہ خود کو ماضی کے ویران اندھیروں میں اُترتا سا محسوس کرنے لگی۔ ایسی محبت تو اُس نے کبھی دیکھی ہی نہ تھی۔ اتنی چاہت، اتنا پیار....... اس سب سے کہاں واقف تھی وہ۔

"نتالیہ!....... مجھے پتہ ہے کہ تم محبت یا شادی کو اسیری کے بندھن کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتی۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارے دل میں یہ احساس بھی جاگے کہ محبت کے پانے کے بعد میں بدل جاؤں گا۔ یہ خیالات تمہارے دل میں آنے یقینی ہیں۔" وہ اُس کے سامنے، اُس کی آنکھوں میں جھانک کر، اپنی تمام قوتِ ارادی کو جمع کر کے کہہ رہا تھا اور نتالیہ اُس کے ہر لفظ پہ اعتماد کئے جا رہی تھی۔

"میں تمہیں محبت کرتا ہوں۔ لیکن تمہارے اصولوں اور چاہتوں کے آگے کبھی بھی رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ اور پھر انسان جس چیز کو صداقت سمجھتا ہے، اس کے لئے زندہ رہنا اور فنا ہونا ہی تو زندگی ہے۔ جھوٹ سمجھتے ہوئے بھی کسی بات سے چمٹ جانا، وہ تو مرنے کے برابر ہے۔ میری زندگی کی صداقت صرف تم ہو۔ لیکن میں تمہیں اپنی محبت کے بندھنوں میں قید نہیں کرنا چاہتا۔ تم آزاد ہو۔" عسفان کی آنکھوں میں اِک شفاف

جھلملانے لگی۔

نتالیہ کے دل میں اس وقت اُس شخص کے لئے کتنے اچھے احساسات آ گئے تھے۔ وہ سوچنے لگ گئی تھی کہ یہ شخص کتنا عظیم ہے۔ اگر وہ ہاتھ میں اس کا ہاتھ لے کر اس سے وعدہ مانگتا اور کہتا کہ "تم میری ہو، میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گا۔" تو وہ یقیناً اپنا ہاتھ نہیں چھڑا پاتی۔ تاعمر اپنا آپ اُس کے نام کر دیتی۔ لیکن اس کے بدلے میں اُس نے کہا تھا کہ تم آزاد ہو۔ میں کون ہوں جو تمہارے راستے کی رکاوٹ بنوں۔ بچپن سے لے کر آج تک اُس نے جن لوگوں کو بھی اپنے آپ سے محبت کرتے پایا تھا، اُن کے الگ رُوپ دیکھے تھے۔ ہر رُوپ میں ایک قید تھی۔ ہر محبت کی کوئی مانگ تھی۔ ہر کسی کو اپنی محبت کے بدلے کی ضرورت تھی۔ لیکن آج، اُس کے کانوں میں شور مچا رہی تھی، ایک نئی آواز۔ نتالیہ! تم آزاد ہو۔

"عسفان! میں نے ایک موتی ڈھونڈ لیا ہے۔ بے حد انمول، بیش قیمت۔ سوچتی ہوں، اُسے کہاں چھپاؤں؟" نتالیہ کا چہرہ پہلے گلاب کی طرح کھل گیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ آہستہ آہستہ دو چھوٹے سے ہونٹ کھلے اور کسی نے عسفان کے دل کے بہت قریب سے پکارا......."میں تمہاری ہوں۔"

اُس نے اُس کے کندھے چھوڑ دیئے۔ وہ چلی گئی۔ پہلے تو عسفان نے اس ملتے ہوئے پردے کی طرف دیکھا، جہاں سے وہ ابھی گئی تھی اور پھر رٹرز طوطے کے اس گیت کی طرف متوجہ ہوا، جو اُس کے ہونٹوں پہ ابھی ابھی کھلا تھا۔



"کیا کر رہے ہو بیٹا! کوئی ضروری کام ہے؟" کمپیوٹر پہ بیٹھے احسن سے اُس کی والدہ رابع بیگم نے سوال کیا۔

"نہیں امی! کوئی خاص کام نہیں۔ بس اپنی میلز چیک کر رہا تھا۔ کورٹ میں تو اپنے کاموں سے فرصت نہیں ملتی۔" احسن نے کمپیوٹر کو شٹ ڈاؤن کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے تم سے ضروری بات کرنی تھی احسن!"

"جی امی!....... میں سن رہا ہوں۔" وہ متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"بیٹا!....... رضوی صاحب، ماہا کی شادی کے لئے کہہ رہے تھے۔ اُن کے بیٹے نے شادی کے بعد ہاسٹل ہونا ہے۔ اس لئے وہ جلد سے جلد شادی کرنا چاہتے ہیں۔" رفیع بیگم نے بلا تاخیر اصل بات کی۔

"تو پرابلم کیا ہے امی؟........ویسے بھی منگنی ہوئے دو سال ہو چکے ہیں اور ماہا کی
مکمل ہو چکی ہے۔" احسن نے مسکرا کے کہا۔
"ہاں بیٹا!........لیکن میں چاہتی ہوں کہ ماہا کے جانے سے قبل تمہاری دُلہن اس
میں آ جائے۔ جو جگہ ماہا خالی چھوڑ جائے گی، وہی جگہ تمہاری دُلہن آ کر بھر دے۔ کچھ غلط
نہیں ناں سوچا میں نے۔" رفیع بیگم نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔
"وہ سب تو ٹھیک ہے امی! لیکن اتنی جلدی یہ سب کیسے ممکن ہے؟ مطلب یہ کہ رشتے
کی بات طے ہونے سے لے کر شادی ہو جانے تک کا مرحلہ دنوں پہ نہیں، مہینوں اور بعض
اوقات سالوں پہ محیط ہو جاتا ہے اور ہم ماہا کی شادی کو اور لیٹ نہیں کر سکتے۔"
"بیٹا!........ضروری تو نہیں کہ ایسا ہو۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ ماہا کی رخصتی
سے قبل تمہاری کم از کم منگنی ہو جائے تاکہ دل کو اطمینان رہے کہ اب بہت جلد تیرا گھر
بسنے والا ہے۔ اگر تم کہو تو میں لڑکی ڈھونڈنا شروع کر دوں؟"
رفیع بیگم کی اس بات پہ وہ مسکرایا تھا۔ کئی دنوں سے وہ اپنے دل کی بات کہنے کا موقع
ڈھونڈ رہا تھا اور قسمت نے اُسے وہ موقع فراہم کر دیا تھا۔ وہ اپنے دل کی تمام ہمت مجتمع کر
کے بولا۔
"امی! لڑکی میں ڈھونڈ چکا ہوں۔ بس آپ نے اُسے میری دُلہن بنا کر اس گھر
لے آنا ہے۔" احسن لڑکا ہونے کے باوجود بھی یہ بات بتاتے ہوئے شرما رہا تھا۔
"کون ہے وہ؟........کیا کوئی کولیگ؟" ماں کا دل دھڑکا۔
"امی!........آپ اُسے اچھی طرح جانتی ہیں۔ کئی بار مل چکی ہیں۔ آپ خود ہی اندازہ
لگائیں کہ وہ کون ہے؟" احسن نے ماں کو اِک نئے امتحان میں ڈالنا چاہا تھا۔ لیکن اُس کے
چہرے کے رنگوں اور لہجے کی کھنک سے ہی رفیع بیگم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کون
ہے۔
"کہیں تم نتالیہ کی بات تو نہیں کر رہے؟" اُن کا لہجہ قدرے سنجیدہ سا تھا۔ احسن نے
سر کھجاتے ہوئے ہامی بھری۔
"وہ آپ کو پسند تو ہے ناں امی!" وہ دوزانو ہو کر ماں کے آگے بیٹھ گیا اور اُن کے
گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔
"ویسے تو ٹھیک ہے، بس ذرا سنجیدہ و متین طبیعت کی ہے۔ کیا وہ بھی تمہیں پسند
ہے؟"

"یہ تو معلوم نہیں۔ وہ اپنی ذات کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ بس یہ ہے کہ وہ میری
اچھی دوست ہے اور میرے خیال میں شادی کا رشتہ اگر دوستی کا رشتہ بھی ہو تو سفر بہت
آسانی سے کٹ جاتا ہے۔" احسن نے نہایت رازداری سے کہا۔
"مجھے تمہاری پسند بہت پسند آئی۔ بس تم نتالیہ سے بات کر لینا۔ پھر ہم کسی دن ان
کے گھر چل کے اُسے مانگ لیں گے۔" والدہ کی بات پہ وہ جھوم ہی تو اُٹھا تھا۔
"تو امی! یہ شادی مکمل طور پر ارینج شادی کی طرح ہو گی۔ آپ لوگ جائیے گا اُسے
مانگنے۔ میں اُس سے فی الحال کچھ نہیں کہوں گا۔" دل میں اُسے پانے کے ارادے تھے اور
روح اُسے حاصل کر لینے کی آرزوؤں میں رچی بسی۔ آج احسن مشکور بے حد خوش تھا۔



"نتالیہ!........وہ صرف ایک بار تمہارے ساتھ باہر جانا چاہتے ہیں........صرف ایک
بار۔" انزلہ نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"نہیں انزلہ! میں اس طرح کا کوئی قدم نہیں اُٹھانا چاہتی۔ گھر میں ملاقات کی بات
اور ہے، باہر گھومنا پھرنا اچھا نہیں ہوتا۔ ممانی کو پتہ چل گیا تو ٹھیک نہیں ہو گا۔ اُسے جا کے
کہہ دو، میں نے منع کر دیا ہے۔" نتالیہ نے صاف انکار کیا۔
"ارے، امی کو تو کیا، کسی کو بھی پتہ نہیں چلے گا۔ عسفان بھائی بائیک لے کر نکل جائیں
گے اور تمہیں میں وہاں ڈراپ کر دوں گی۔ دیکھو نتالیہ! عسفان بھائی نے بہت منتیں کی ہیں
میری۔ اور ویسے بھی ایک دو ماہ کے اندر تم دونوں کی منگنی تو ہو ہی جائے گی۔" انزلہ نے
اُسے سمجھایا۔
"تو ہو جانے دو ناں منگنی۔ اُسے آخر ایسی کیا جلدی ہے؟ میں نے کوئی مر تھوڑی جانا
ہے۔"
"پلیز نتالیہ!........میری اچھی بہن ہو ناں۔ پلیز! پلیز! پلیز!" انزلہ نے تنگ آ کر
ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ کچھ سوچنے لگ گئی۔
"اچھا ٹھیک ہے........مگر ایک شرط پہ جاؤں گی کہ رات ہونے سے پہلے وہ مجھے
واپس لے آئے گا۔"
"او کے........وعدہ........اب چلو، تیار ہو جاؤ........اور ہاں، کوئی اچھے سے کپڑے
پہننا۔ کوئی سفید، میلاد والا جوڑا نہ نکال لینا۔ بوڑھی روح۔" انزلہ کے کہنے پر اُس نے
اُس کے کندھے پہ اِک تھپڑ رسید کیا تھا۔ وہ مسکرا کے اُٹھی اور اپنی وارڈروب سے اورنج اور

پنک کنٹراسٹ کا اِک جارجٹ سوٹ نکالا تھا۔ ہلکی پھلکی تیاری کے بعد وہ انزلہ کے گھر سے آ گئی۔ انزلہ اپنی گاڑی پہ اُسے لے آئی۔ اگلے سگنل پہ عسفان اپنی بائیک ساتھ کھڑا اُن کا منتظر تھا۔

"چلو اُترو! وہ بے چارے کب سے کھڑے ہوں گے۔" انزلہ نے اُسے چپ بیٹھے دیکھ کر کہا۔

"میں نے نہیں جانا۔" وہ صاف مُکر گئی۔

"جاتی ہو یا کہوں عسفان بھائی سے کہ تمہیں آ کے اُٹھا لیں۔" انزلہ نے اُسے
وہ چپ چاپ اُتری اور عسفان کے پیچھے بائیک پہ بیٹھ گئی۔ عسفان نے سلام کو
بائیک اسٹارٹ کر دی۔

سردیوں کی شام تھی، بادلوں سے بھرا آسمان تھا۔ بائیک سیدھی سڑکوں پہ دوڑتی آگے ہی آگے جانے لگی۔ پھر ایک مخصوص پارک کے آگے اُس نے اپنی بائیک روکی۔

"اتنا رُوٹھنے کی وجہ؟...... میں نے تو اِک چھوٹی سی خواہش ظاہر کی تھی، تمہا
ساتھ باہر جانے کی۔" وہ سنگ مرمر کی بنچ پہ بیٹھا اس کے چہرے پہ پھیلے غصے کے تا
سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"ضرورت کیا تھی، مجھے یوں بلانے کی؟ اگر آنٹی کو پتہ چل گیا تو اچھا نہیں
جانتے تو ہیں آپ آنٹی کی طبیعت۔" وہ بولی۔

"ارے کہہ کے تو دکھائیں کچھ ہماری جان کو۔ جان نکال دوں گا اُن کی۔" وہ
انداز سے بولا۔ وہ ہنس دی۔ اتنی اپنائیت سے پہلے کہاں آشنا تھی وہ۔ اس طرح
جتانے والا تو کوئی تھا بھی نہیں۔

"بس، بس...... اب ایسی بھی کیا بہادری...... اچھا بتائیں، کیا باتیں ہیں جو
انزلہ کے آپ گھر پہ نہیں کر سکتے تھے؟"

"محبت کے کچھ اقرار، اپنی مضطرب طبیعت اور بے چین رات دن کے چند قصے
والے حسین دنوں کے کچھ خواب وغیرہ وغیرہ۔ کتنی باتیں شیئر کرنے کو ہوتی ہیں۔ میر
تو تم آتی نہیں اور تمہارے گھر جاؤ تو ہر وقت ماموں کی مسز کا ڈر ہوتا ہے۔ اب
بے چارہ کرتا بھی تو کیا۔ اس لئے انزلہ کو ہی ہم راز بنا لیا۔" وہ بڑی ادا سے بولا تھا۔

"وہ آپ کی صرف ہم راز نہیں، ایس ایچ او لگی ہوئی ہے۔ اتنی زبردستی لے آئی یہاں۔" وہ رُوٹھی ہی تو تھی۔

"پھر تو مجھے اُس کا اور شکر گزار ہونا پڑے گا۔ ویسے اُسے میں نے ہی سکھایا تھا کہ گھی ٹیڑھی اُنگلی سے کس طرح نکالا جاتا ہے۔" وہ فضا میں اپنی اُنگلی لہرانے لگا۔

"عسفان!" نتالیہ نے غصے بھری آنکھوں سے اُس کی جانب دیکھا تھا۔

"اصل بات تو یہ تھی مہرباں! کہ مجھے تمہاری صحبت میں چند گھڑیاں گزارنی تھی، کچھ تمہاری سننی تھی اور کچھ اپنی سنانی تھی۔ اپنی زندگی تمہارے نام کرنی تھی، کچھ عہد و پیاں کرنے تھے، کچھ قسمیں کھانی تھیں۔" اُس نے کہتے کہتے اچانک ہی اُس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ فوراً ہاتھ چھڑا کر بولی۔

"یہ عہد و پیاں، یہ قسمیں، وعدے شادی تک ملتوی نہیں ہو سکتے؟ مجھے کمٹمنٹ سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"بالکل ملتوی نہیں ہو سکتے...... اتنے سالوں سے تو ہوتے آ رہے ہیں۔ اب بالکل نہیں۔ اور ویسے بھی امی کہہ رہی تھیں کہ اگلے ماہ ہی ہماری منگنی ہو گی انشاءاللہ۔ اور پھر ہمارا ملنا جلنا بالکل بند۔ کیونکہ یہ ہماری فیملی میں نہیں ہوتا۔ اس لئے آج چند ایک وعدے تو کر لیتے ہیں۔" وہ اُس کی آنکھوں میں جھانک کر اُس سے مخاطب تھا۔

"اگلے مہینے منگنی...... یہ آپ سے کس نے کہا؟...... ابھی میری طرف سے رضامندی نہیں ہوئی۔" وہ اِترا کے بولی۔

"تمہاری طرف سے رضامندی کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے علاوہ اور کسی کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ یا پھر یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ میرے علاوہ تمہارے ساتھ کوئی زندگی نہیں گزار سکتا۔" اُس کے یہ کہنے پر نتالیہ نے گھور کے اُس کی جانب دیکھا تھا اور عسفان کی آنکھیں وفاؤں کی لو سے جگمگا اُٹھیں۔

باغ میں اِردگرد کتنے ہی لمبے چوڑے درخت تھے، جن کی عمریں سو سال سے بھی زیادہ پرانی تھیں اور اُن کی جڑیں زمین میں کتنے ہی سو فٹ نیچے تک پھیلی تھیں۔ اُن کے سائے تلے بیٹھ کر وہ دونوں بھی خود کو تاریخ کا حصہ محسوس کر رہے تھے۔ کئی سو سال پہلے شاید اسی طرح کے درختوں کے نیچے پرانے رشتوں نے دنیا کے بھید سمجھنے کی سعی کی ہو گی۔

آسمان پر اِدھر اُدھر سے بادل اکٹھے ہوتے رہے اور آسمان چھپتا گیا۔ نتالیہ آسمان پہ پھیلے انہی ابر پاروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"تمہاری محبت کے ملنے سے پہلے میں اکثر سوچتی تھی کہ میری زندگی کیا موڑ لے گی؟ کہاں جائے گی؟"

"پھر، اب راستہ نظر آ رہا ہے؟"

"آنکھیں اب بھی تو بے بس ہیں۔ وہ دیکھ سکتی ہیں، راستے کا صرف فرلانگ بھر کا اور ہمیں زندگی میں کتنا سارا وقت اور کتنا سارا راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔"

وہ چپ چاپ نتالیہ کی آنکھوں میں دیکھے گیا۔ پھر وہ دونوں بنچ سے اُٹھ گئے درخت کے نیچے گھاس پہ بیٹھ گئے۔ اُس دن مٹی پہ پتھر سے لکیریں کھینچتے ہوئے نتالیہ اپنی زندگی کی محرومی کی ہر داستان اُس کے سپرد کر دی۔ پاپا کی موت کے بعد کی محرومی، ممی کی شادی اور اس کے نتالیہ کی زندگی پہ اثرات، آنٹی کی بے رُخی، طعنے، اُس کی تنہائی بہے کتنے ہی اشک۔

عسفان کتنی دیر چپ میں ڈوبی درختوں کی ٹہنیوں کی جانب دیکھتا رہا، پھر اچانک بولا۔ "نتالیہ! گیت سنوگی؟"

وہ مسکرا کے بولی۔ "ہاں عسفان! کوئی بہت مدھر، بہت سریلا گیت سنائیں۔"

عسفان کے لبوں پہ گیت کے بول آ کر ٹھہر گئے۔

"مجھے تم سے محبت ہے......

محبت بھی کچھ ایسی جو کسی سورج کو کرنوں سے

مجھے تم سے محبت ہے......"

عسفان گیت گاتا رہا، اور وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دے کر برگد کے بوڑھے، درختوں کی ٹہنیوں کی قطاروں کے درمیان سے گزرتے رہے۔ نتالیہ کے ہاتھوں پہ اُس پسینہ سا محسوس کیا۔ کھلے ہوئے گلے سے نکلتی میٹھی مدھر آواز ہوا میں پھیلتی رہی۔ ہوا بہت دھیمی چال سے چل رہی تھی، پھر اچانک ہی آسمان سے بوندیں برسنے لگیں۔ ابھی دونوں دھیمی رفتار سے چلتے ہوئے بائیک تک آئے ہی تھے کہ وہ چھم چھم برستی بوندیں بارش اور آندھی طوفان میں تبدیل ہونے لگ گئیں۔ ہر طرف تیز بارش کا پانی برسنے آسمان چمکیلی بجلیوں سے چمکنے لگا۔ باغ میں اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے لوگ تیز رفتاری بھاگنے لگے۔ عسفان بھی بائیک پہ بیٹھا اور فوراً بائیک چلا دی۔ پارک ہی کے باہر لگی کے شیڈ کے نیچے اُس نے بائیک کھڑی کی۔

"اتنی تیز بارش شروع ہو گئی ہے۔ گھر سے بھی بہت ہی دُور ہیں ہم۔ اس طرح بھی کے جانا بھی درست نہیں۔" وہ بولا۔

"پھر کیا کریں؟" وہ یقیناً گھبرائی تھی۔

"ایسا کرتے ہیں، میرے دوست عباس رضوی کا فلیٹ قریب ہی ہے، ابھی وہیں چلتے ہیں۔ بارش تھمتے ہی گھر کا رُخ کریں گے۔ ٹھیک ہے؟" اُس نے نتالیہ کی تائید چاہی۔ وہ چپ ہی رہی۔ اور اس طرح وہ دونوں بھیگتی سڑکوں پہ بائیک دوڑاتے عباس رضوی کے اپارٹمنٹ تک آئے۔ بیل بجانے پر دروازہ خود عباس ہی نے کھولا تھا۔

"ارے عسفان! تم ......آؤ، آؤ...... اس طرح بھیگے ہوئے، اور یہ کون ہیں؟" عسفان کے عقب میں کھڑی بھیگی بلی کی طرح سہمی نتالیہ کو دیکھ کر وہ بولا تھا۔

"یہ ایڈووکیٹ نتالیہ احمر ہیں۔ میری کزن اور منگیتر، جو بہت ہی جلد نتالیہ عسفان بننے والی ہیں۔ اُس کے کرائے گئے تعارف پر نتالیہ چونکی ہی تھی۔ اس طرح اُسے اپنی منگیتر کہنا عجیب ہی لگا تھا۔

"آئیے...... آئیے بھابی!...... میں اپنی مما اور بہن افشاں سے ملواتا ہوں آپ کو۔" عباس رضوی اُنہیں اپنے نفاست سے سجے فلیٹ میں لے آیا۔

"مما!...... یہ ہیں عسفان...... میرے کولیگ اور دوست...... اور یہ ہیں ان کی منگیتر نتالیہ...... اور یہ ہیں میری مما اور بہن افشاں۔ یہ بتاؤ اتنی بارش میں تم دونوں کیسے نکلے؟" عباس نے تعارف کروانے کے بعد کہا۔

"بس یار! ویسے ہی گھومنے نکلے تھے کہ اچانک اتنی تیز بارش شروع ہو گئی اور بائیک پہ آگے سفر کرنا بھی آسان نہ تھا۔" عسفان بولا۔

"آپ اگر اس طرح ان بھیگے کپڑوں میں رہیں تو آپ کو بخار ہو سکتا ہے۔ آئیے، میں آپ کو اپنے کپڑے دیتی ہوں۔" افشاں نے نتالیہ سے کہا۔ وہ اُٹھ کے اُس کے ہمراہ کمرے میں آ گئی اور عباس کی والدہ چائے بنانے کچن میں چلی گئیں۔

"ہیلو انزلہ!...... نتالیہ اور میں یہاں بارش میں پھنس گئے ہیں۔ اس وقت تو ہم محفوظ مقام پر ہیں۔ جیسے ہی بارش تھمتی ہے، ہم گھر آ جائیں گے۔ تم سب سنبھال لینا۔" عسفان نے انزلہ کو انفارم کیا۔ وہ فون رکھ چکا تھا۔

"بہت مشکل ہے یار! یہاں سے آگے والے ایریا میں بارش کے پانی میں کچھ گاڑیاں پھنس گئی ہیں، روڈ بلاک ہے اور بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی۔ آج کی رات تو باہر جانا بہت ہی مشکل ہے۔" عباس نے چائے کا کپ اُسے دیتے ہوئے کہا۔

"اوہو...... یہ تو بہت برا ہوا۔ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے عباس؟"

"راستہ تو ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ ہر جگہ ہی یہی مسئلہ ہوگا۔ اور پھر رات بھی ہو گئی

ہے۔ کچھ ایریاز کی تو بجلی بھی کٹ چکی ہے۔ ٹرانسفارمر پھٹ گئے ہیں۔"

"تو کیا آج کی رات یہیں گزارنی پڑے گی؟" وہ فکرمندی سے سوچ گیا اور اُٹھ کر اندر کمرے میں ثنالیہ کے پاس آیا، جہاں وہ افشاں کا، کاسنی رنگ کا سوٹ پہنے، گیلے بالوں کو سکھا رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر افشاں کمرے سے باہر چلی گئی۔

"ثنالیہ! لگتا ہے، ہمیں آج کی رات یہیں ٹھہرنا ہوگا۔" وہ اُسے تمام بات سمجھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"لیکن عسفان! یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ اگر گھر کے لوگوں کو علم ہوگیا تو اچھا نہیں ہوگا۔ ساری رات ہم دونوں گھر سے باہر رہیں، یہ کیسے ممکن ہے؟" وہ اپنا ڈر صحیح سمجھنے لگی تھی، جو عسفان سے ملنے آنے سے قبل تھا۔

"مجبوری ہے ناں ثنالیہ!....... ایسا کرو، تم ماموں کو فون کر کے کہہ دو کہ تم اپنی دوست کے گھر ہو اور صبح آؤ گی۔ صبح میں پہلے گھر چلا جاؤں گا اور تم اکیلے بعد میں جانا۔" وہ اُسے حل بتانے لگا۔

اور پھر اُس نے ایسے ہی کیا۔ ماموں کو فون کر کے پہلے اطمینان دلایا کہ وہ ثانیہ کے گھر پر ہے اور پھر ثانیہ کو فون کر کے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

صبح وہ دونوں ساتھ ہی عباس کے گھر سے نکلے۔ عسفان نے ثنالیہ کو پہلے ثانیہ کے گھر چھوڑا اور خود اپنے گھر آ گیا۔ اُس کے گھر آتے ہی کوثر بیگم کی جان میں جان آئی جو کہ ساری رات اُس کی راہ دیکھتی رہی تھیں، دُعائیں مانگتی رہی تھیں۔ عسفان کے گھر پہنچنے کے کوئی گھنٹے بعد ثنالیہ کو ثانیہ اُس کے گھر ڈراپ کرنے آئی۔ اوپر فلیٹ پر بھی وہ اُسے چھوڑنے آئی اور اُس نے اپنی طرف سے پورا یقین دلایا سب کو کہ ثنالیہ رات بھر اُس کے گھر رہی تھی۔

گوکہ یہ سب اچانک اور نادانستہ طور پہ ہوا تھا لیکن یہ واقعہ اور اس کے اثرات سے منسلک خوف ثنالیہ کے دل میں کئی دنوں تک گھر کئے رہا۔ اُس دن کے بعد اُس نے عسفان کے ساتھ کہیں بھی جانے سے انکار کر دیا۔



جاڑوں کے مختصر سے دن اور اگر ان مختصر دنوں میں بادل آسمان کا احاطہ کئے رہیں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے سورج نے اپنا چہرہ دنیا سے چھپا لیا ہو اور ہر وقت مغرب کے وقت کا سماں محسوس ہوتا ہے۔

اس وقت بھی ابھی شام کے چار ہی بجے تھے لیکن بالکل غروب کا سا وقت لگ رہا

وہ گہری نیند سے جاگی، اُٹھ کے منہ دھویا، بالوں کو جُوڑے کی شکل دے کر ہیئر کیچ میں قید کیا، پہلے وہ بالکنی میں آئی اور دانستہ طور پر اُس کی آنکھیں عسفان کی کھڑکی کی جانب اُٹھ گئیں، جہاں باریک پردے کے پار اُس کا رنڑ طوطا چہچہا رہا تھا۔ کمرے میں شاید کوئی نہ تھا۔ اُس نے مسکرا کر آسمان کی جانب دیکھا اور پھر چائے بنانے کی غرض سے کچن میں آئی، جہاں آنٹی پہلے ہی کھڑی تھیں۔

"کیا کر رہی ہیں آنٹی! چائے بنا رہی ہیں؟ چلیں، آپ چھوڑیں، میں بنا لیتی ہوں۔" اُس نے بہت پیار سے کہا۔

"رہنے دو....... جہاں سارے کام ہو جاتے ہیں، وہاں یہ بھی صحیح۔" فرزانہ بیگم نے آہ بھر کر کہا۔

"آنٹی یقین کریں، میں پوری کوشش کرتی ہوں کہ کسی طرح وقت نکال کر آپ کا ہاتھ بٹاؤں لیکن بالکل وقت ہاتھ نہیں آتا۔ چلیں چھوڑیں، مجھے بنانے دیں۔" وہ پیار سے حق جتاتے ہوئے بولی۔ فرزانہ بیگم بھی پیچھے ہٹ گئیں۔ اُس نے چولہے پہ پانی اُبلنے کے لئے رکھا اور اس میں چائے کی پتی ڈال دی۔

"تم سے کچھ بات کرنی تھی ضروری۔" آنٹی نے بات کا آغاز کیا۔ وہ متوجہ ہوئی۔ آنٹی نے گردن موڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور یقین کر لیا کہ کوئی آس پاس نہیں ہے۔

"کیا تم اور عسفان ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو؟" اچانک اس طرح کے سوال پر وہ چونکی ہی تھی۔ اُس نے ممانی کے چہرے کی طرف دیکھ کے اُن کے تاثرات جانچنے چاہے، جہاں سپاٹ سے چہرے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔ کیا تم اور عسفان ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو؟" وہی سردمہری۔ اُس نے اثبات میں گردن ہلائی، جس طرح کسی بہت بڑے جرم کا اقرار کیا ہو۔ ممانی کی آنکھوں میں ڈھیروں آنسو اُمڈ آئے۔

"جانتی تھی میں کہ تم نے اُسے پھنسا لیا ہے۔ ارے وہ تو اس طرح کا لڑکا ہی نہ تھا۔ پتہ تھا مجھے کہ تم اس طرح ضرور کرو گی۔ آخر کس ماں کا خون دوڑ رہا ہے تمہاری رگوں میں۔"

"آنٹی! کیا ہوگیا ہے؟....... آپ رو کیوں رہی ہیں؟" وہ بولی۔

"میری اُمیدوں پہ پانی پھیر کے پوچھتی ہو، کیا ہوگیا ہے۔ ارے بچپن سے عسفان کو میں نے اپنی انزلہ کا دولہا تصور کیا ہے۔ اور تم نے ایک ہی وار سے اُسے اپنا بنا لیا۔" وہ زار وقطار رو رہی تھی۔

''آنٹی!........اُن کی طرف سے آئے پرپوزل کا مجھے پہلے کوئی علم نہ تھا۔ یقین کر اس سے پہلے میں نے کبھی عسفان کے لئے کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔'' وہ یقین دلا ہوئے بولی۔

''جانتی ہوں........خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔ تمہیں بھی اور تمہاری ماں کو بھی کس طرح شیشے میں اُتارنا جانتی ہو تم دونوں مردوں کو۔ ارے جنہوں نے تمہیں اتنا بڑا پڑھایا لکھایا، اس قابل بنایا، تم اُنہی کے ساتھ دشمنی کر رہی ہو؟'' ممانی کا کاٹ دار لہجہ کی رگوں میں نشتر چبھونے لگا۔

''میں نے آپ کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں کی آنٹی! آپ لوگ تو میرے محسن ہیں! میرے ماں باپ کی جگہ پر ہیں۔ میرے لئے خدا کے بعد آپ ہی لوگ ہیں۔'' وہ رو ہوئی۔

''اگر سچ میں ایسا ہوتا تو کیا تم خیال نہ کرتیں ہمارا؟ کچھ بات نہ مانتی ہماری؟ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

''آنٹی! آپ کہہ کے تو دیکھیں۔ میں اپنی جان بھی دے دوں گی۔'' وہ روہانسی تھی۔ بے بس آنسو رخساروں پہ اپنے نشان بنا رہے تھے۔ ممانی کے سنائے ہوئے جرم کٹہرے میں وہ مجرم کی مانند کھڑی تھی۔

''تو پھر کر دو انکار عسفان کی شادی سے۔ ابھی تمہاری طرف سے رضامندی باقی ناں۔ کر دو منع اپنے ماموں کو۔'' اُس کی سماعتوں میں بم تو پھٹا تھا۔ کتنی بے دردی سے آنٹی نے یہ جملہ۔ وہ تڑپ اُٹھی تھی۔

''اپنے ماموں کے احسانوں اور میرے کھلائے ہوئے نوالوں کا اگر ذرا بھی احساس ہوگا ناں تجھے، تو خود اپنی زبان سے انکار کر دو گی تم۔'' وہ بے دردی سے کہتی ہوئی کچن سے باہر نکل گئیں اور وہ گنگ سی کھڑی رہی۔ اُس کا دل کر رہا تھا کہ اُس کے نیچے سے زمین کا ٹکڑا پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ دل میں کتنے طوفان چل رہے تھے۔

چولہے پہ چائے کا پانی اُبل اُبل کر گر رہا تھا، مگر اُسے کوئی ہوش نہ تھا۔ محبتوں کی توہین ہوئی تھی۔ اُس کی سماعتیں پھٹی جا رہی تھیں، دل کرچیاں کرچیاں ہو کر بکھر رہا ذہن میں کبھی عسفان کا چہرہ گھومتا تو کبھی ممانی کے الفاظ۔ آسمان کی چھت تلے، کم کے کسی کونے میں ایک بے گناہ رُوح انتشار کا شکار تھی اور کسی کو اس کا علم نہ تھا۔

کسی دھیان کے، کسی طاق پہ ہے دھرا ہوا

وہ، جو ایک رشتہ درد تھا
مرے نام کا تیرے نام سے
تیری صبح کا مری شام سے
سرِ رہگزر ہے پڑا ہوا وہی خواب جاں
جسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے واسطے
کئی لاکھ تاروں کی سیڑھیوں سے اُتر کے آتی تھی کہکشاں
سرِ آسماں
کسی ابر پارے کی اوٹ سے
اُسے چاند تکتا تھا رات بھر، میرے ہم سفر
اُسی رختِ غم کو سمیٹتے، اُسی خوابِ جاں کو سنبھالتے
مرے راستے، کئی راستوں میں اُلجھ گئے
وہ طنابِ دل جو اُکھڑ گئی
وہ خیامِ جاں جو اُجڑ گئے
وہ جو منزلیں
کسی اور منزلِ بے نشاں کے غبارِ راہ میں کھو گئیں
وہ چراغ جو میرے ساتھ تھے، بجھ گئے

تیز ہواؤں کی ٹھنڈی بھی اُس کے جسم کو محسوس نہ ہوتی تھی، اس طرح کی آگ تھی اُس کے اندر میں۔ احساس صروحی کے کتنے اژدھے اُسے جکڑے تھے۔ کھو جانے کے احساس کی کتنی زہریلی چھپکلیاں اُسے اپنی گردن پہ سرسراتی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ بالکونی کے کونے میں اندھیرا کئے کھڑی تھی۔ اپنی بے بسی اور قسمت کی سفاکی پہ آنسو بہا رہی تھی، افسوس کر رہی تھی اس لمحے پر کہ جب اُس نے سمجھا کہ قسمت اُس پہ مہربان ہوگئی ہے۔ اُس نے آج تک صرف قسمت کی سیاہیاں ہی دیکھی تھیں، وہ تو واقف ہی نہ تھی کہ زندگی کی مسرتیں کیا ہوتی ہیں۔ عسفان کی چند دن کی محبت اُس کی زندگی میں خواہشوں کی نرم پھوار لائی تھی۔ اور وہ اپنے آپ کو اس کن من پھوار میں بھیگتا محسوس کر رہی تھی۔ لیکن جلد ہی قسمت کی اندھیری رات پھر اپنا دامن اس پہ پھیلائے کھڑی تھی۔

عسفان کے کمرے کی کھڑکی سے اُس کے گٹار کی آواز آ رہی تھی۔ وہ روز رات کو اس وقت گٹار بجاتا تھا اور اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ اپنے پیار کی نرم کومل چھاؤں تلے

اُسے بلا رہا ہو، اُسے آواز دے رہا ہو اور اُس کی اپنائیت بھری وہ آواز ثنالیہ کو اپنے پا
کھینچتی تھی۔ لیکن آج نجانے کیوں اُسے محسوس ہوا کہ عسفان گٹار کے ہمراہ کھڑکی میں کھ
تھا اور اُس کی آنکھیں ثنالیہ کی بالکنی کی طرف تھیں۔ وہ شاید اندھیری بالکنی کے کونے
کھڑی ثنالیہ کے ہیولے کو پہچان چکا تھا۔

ثنالیہ بالکنی سے اندر کمرے میں آئی اور دروازہ بند کر دیا۔ اُس کے موبائل پہ
ہوئی۔ نمبر عسفان ہی کا تھا۔ وہ اُٹھانا چاہتی تھی، اُس سے بات کرنا چاہتی تھی، اُس کو
چاہتی تھی کہ وہ کس طرح مجبور ہے........ بے بسی کا کون سا پہاڑ اُس پہ ڈھے گیا ہے۔
طرح دنیا اُس کی خوشیوں کی دشمن بنی ہوئی ہے، وہ کہنا چاہ رہی تھی۔ وہ اپنے اندر کے
اپنے محبوب پہ ہلکا کر دینا چاہتی تھی........ مگر وہ مجبور تھی........ اُس نے نہ چاہتے ہوئے
فون بند کر دیا اور موبائل آف کر کے بستر پہ آ گئی۔ مگر رات دیر تک وہ اُلجھتی رہی، ا
قسمت کے ستاروں سے، اپنے تخلیق کار سے، اپنے خدا سے۔



اگلے دن اُس کی زندگی میں اِک اور امتحان آیا۔ آزمائش کا اِک اور پڑاؤ اُس کی
میں حائل ہو گیا۔ اُس کی قسمت نے اِک اور رنگ لا کے اُس کی آنکھوں کے سامنے ٹھہر
اگلی شام جب وہ گھر آئی تو احسن کی والدہ اور اُس کی بہن ماہا کو اپنے گھر میں پایا۔ ممانی
کی خاطر مدارت میں مصروف تھیں۔ ماموں اور انزلہ بھی بیٹھے تھے۔ جبکہ ماحول اُس
آنے کے بعد کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا، بعد میں بھی نارمل ہو گئے۔ ماہا اور اُس
والدہ ہمیشہ کی طرح بہت پیار سے اُس سے ملیں۔ ماہا اُس کے لئے ایک گفٹ پیک
لائی تھی، جسے اُس نے ہنستے ہوئے قبول کر لیا۔

اُن کے چلے جانے کے بعد انزلہ اُس کے کمرے میں آئی اور اُس کے سامنے ایک
پھوڑا۔

''احسن کا رشتہ لے کر آئی تھیں اُن کی والدہ۔''

''کیا؟........ احسن کا رشتہ؟........ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ احسن نے تو کبھی اس ط
کی کوئی بات نہیں کی۔ وہ تو میرا دوست ہے۔'' ثنالیہ حیران ہی تو ہوئی تھی۔

''یہی تو فرما رہی تھیں اُن کی والدہ کہ احسن اور ثنالیہ بہت اچھے دوست ہیں اور ش
کے رشتے کے لئے دوستی کا رشتہ ہونا بے حد ضروری ہے۔ اور احسن، ثنالیہ کو بہت پسند
کرتا ہے۔'' انزلہ نے احسن کی ماں کی بات دوہرائی۔

''تو ماموں نے کیا جواب دیا؟'' وہ بولی۔

''ابو کو کچھ نہیں بولنے دیا مما نے۔ وہی بولتی رہیں کہ ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔
ثنالیہ کو ہم نے اپنی بیٹی ہی کی طرح پالا ہے، اُس کی خوشی میں ہماری خوشی ہے۔ اور موصوفہ
احسن کی والدہ نے تمہاری اور احسن کی دوستی کو اتنا ہائی لائٹ کیا کہ ابو نے بھی کہہ دیا ہے کہ
وہ تم سے پوچھ کر ہی کچھ فیصلہ کریں گے۔'' انزلہ نے کہا۔ وہ چپ چاپ سوچتی رہی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟........ کہہ دینا ابو کو کہ تمہیں عسفان بھائی سے شادی کرنی ہے،
اور کسی سے بھی نہیں۔'' انزلہ نے اُسے جھنجھوڑا تھا۔

''کیا میں ایسا کہہ سکتی ہوں؟'' وہ اُس کی جانب دیکھ کے بولی۔

''کیوں........ کیا تمہارے منہ میں زبان نہیں کہ تم اپنی پسند کا اظہار کر سکو؟ دوستی اور
محبت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے مس ثنالیہ احمر! ضروری نہیں کہ اچھا دوست اچھا شوہر
بھی بن پائے۔ اگر تم نہیں کہو گی ناں، تو میں کہوں گی ابو کو۔'' انزلہ ہٹ دھری سے بولی۔
ثنالیہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

جیون کا اِک دوراہا اُس کے سامنے تھا۔ ایک طرف محبت تھی تو دوسری طرف مجبوری۔
ممانی کے الفاظ کبھی اُس کی سماعتوں میں گونج کے اُسے بے چین کرتے تو کبھی عسفان کے
محبت بھرے لفظ۔

آنٹی کے الفاظ میں صاف ظاہر تھی اُس کی اوقات، جس کا اُسے ہمیشہ سے اچھی طرح
ادراک تھا اور اس اوقات کے اوپر سایہ کئے ہوئے تھا ماموں کے ان گنت احسانات کا
پہاڑ، جسے جھٹلانا یا جس کی چھاؤں سے انکار کرنا خود ثنالیہ کے بس میں نہ تھا۔ وہ کیا کرتی۔
حقوق اور فرائض کی چکی میں پس کے رہ گئی تھی۔ آج تک ماموں ممانی نے صرف اپنے
فرائض ہی انجام دیئے تھے، کبھی اپنے حقوق کی مانگ نہ کی تھی۔ اور جب کی تھی تو اُس کے
لئے کتنا مشکل تھا اسے نبھانا۔ کیا وہ عسفان کو چھوڑ کے، اُسے بھلا کے زندہ رہ سکتی تھی؟
شاید ہاں۔ مگر پھر بھی وہ زندگی سانسوں کے آنے جانے کے سوا اور کچھ نہ ہو گی۔ ایک
طرف اُس کی محبت تھی تو دوسری طرف فرض۔

اُس شام وہ کمپیوٹر پہ بیٹھی بے دلی سے سکرین کی جانب دیکھ رہی تھی کہ جب اُس کے
ماموں اُس کے کمرے میں آئے اور اُس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کے اُسے مخاطب کیا، اور
وہ مسکرا دی تھی۔

''ثنالیہ بیٹے! ہم تم سے کچھ بات کرنے آئے ہیں۔''

"جی ماموں!" وہ کرسی سے اُٹھ کے ساتھ رکھے ٹو سیٹر صوفے پہ آ گئی تھی اور ماموں بھی اُس کے ہمراہ بیٹھ گئے تھے۔

"نتالیہ بیٹے! تم میرے لئے بیٹی ہی ہو۔ کبھی میں نے انزلہ اور تم میں فرق محسوس نہیں کیا، بلکہ اس سے بھی زیادہ تمہیں اپنے قریب پایا ہے۔ کیا تمہیں احساس ہے اس بات کا؟" مبشر حسین نے نہایت پیار سے کہا۔

"ماموں!...... میں نے تو بچپن سے آپ ہی کو پایا ہے۔ میرا اپنا اور کون ہے اس میں۔ میرے ہمدرد، میرے خیر خواہ آپ ہی تو ہیں۔" وہ قالین پہ بنے پھولوں پہ آنکھیں ٹکائے بولی۔

"میں نے تمہیں ہمیشہ ایک اچھا مستقبل دینا چاہا۔ یہ چاہا کہ تم ہر مرحلے میں آگے رہو۔ تعلیم ہو یا عام زندگی، تم ہمیشہ جیتو۔ ذمے دار اور خود مختار بنو۔ اپنی زندگی کے فیصلے کرو۔ اپنے اچھے برے کا تعین آپ کرو۔ اور اسی لئے تمہاری زندگی کے سب سے بڑے فیصلے کا حق بھی میں تمہیں ہی دے رہا ہوں۔" وہ چند ساعتیں رُکے اور پھر بولے۔

"نتالیہ! تمہارے لئے آج رشتہ آیا تھا، تمہارے اپنے کولیگ، کلاس فیلو اور دوست احسن مشکور کے گھر سے۔ اور شاید تمہیں اس بات کا بھی علم ہو کہ کچھ عرصہ پہلے تمہاری ممانی عسفان کا رشتہ بھی لائی تھیں تمہارے لئے۔ بیٹا! فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ دونوں رشتے اچھے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عسفان گھر کا بچہ ہے، دیکھا بھالا ہے۔ اور پھر تم زندگی بھر ہماری آنکھوں کے سامنے رہو گی عسفان کی دُلہن بن کے۔ لیکن پھر بھی ہم کسی قسم کا دباؤ تم پر نہیں ڈالتے بیٹے!" مبشر حسین نے فیصلے کے تمام حقوق اُسی کو دے دیئے تھے۔

"تم سمجھ دار ہو...... مجھے یقین ہے کہ تم صحیح فیصلہ کرو گی۔ اطمینان سے سوچو اور ہمیں پھر جواب دینا۔" یہ کہہ کے ماموں اُٹھے۔ وہ گم صم ہی رہی۔ زندگی سے فرار کی راہ کوئی نہیں۔ عسفان کو اپنا سکتی نہیں تھی، احسان کو اپنانا چاہتی نہیں تھی۔ زندگی اُس کے لئے اَن بوجھی پہیلی بن گئی تھی۔ ایک طرف ماموں کی پیار بھری باتیں تھیں اور دوسری طرف ممانی کے روح کو تار تار کر دینے والے جملے۔

"جانتی تھی کہ تم نے اُسے پھنسا لیا ہے...... آخر کس ماں کا خون دوڑ رہا ہے تمہاری رگوں میں...... ایک ہی وار سے اپنا بنا لیا...... اگر اتنا ہی خیال ہے تو کر دو منع اپنے ماموں کو...... کر دو منع اپنے ماموں کو، اگر احسانوں کا ذرا سا بھی احساس ہے تو...... کہہ دو انکار...... کر دو انکار......" اِک بازگشت سی اُس کے کانوں میں گونجتی رہی۔

"ماموں!" عقب سے اُس نے پکارا تھا اور دروازے کے قریب پہنچے ہوئے مبشر حسین کے قدم رُک گئے تھے۔ وہ قریب آئی اور بولی۔

"میرے لئے سب سے زیادہ پریشان ہونے والے بھی آپ ہیں ماموں! میرے دوست، میرے اپنے بھی آپ ہیں۔ اور مجھے اچھا لگا کہ اس فیصلے میں آپ نے میری رائے کو اہم سمجھا۔" اُس نے لمحہ بھر سانس لی تھی۔ "ماموں! میرا فیصلہ احسن مشکور کے حق میں ہے۔"

وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اُس نے کس مصلحت کے تحت یہ کہا تھا، مگر وہ کہہ چکی تھی۔ اور مبشر حسین سراپا حیرت تھے، کیونکہ اُن کا ووٹ یقیناً عسفان کے حق میں تھا۔ مگر نتالیہ کی خوشی ان کے لئے سب کچھ تھی۔ وہ بہر حال نتالیہ کی خوشی چاہتے تھے۔

"کیا یہ فیصلہ تمہارا، سوچ سمجھ کے کیا ہوا ہے؟...... کیا تم خوش رہ پاؤ گی اُس شخص کے ساتھ؟" مبشر حسین نے اُس کے سپاٹ چہرے پہ کچھ کھوجنا چاہا تھا، مگر وہاں سوائے سرد سے تاثرات کے اور کچھ بھی نہ تھا۔

"ماموں!...... اچھی زندگی گزارنے کے لئے ہماری خوشی یا ہم اہم نہیں ہوتے، اہم ہوتا ہے اطمینان۔ اور احسن سے شادی کر کے میں اطمینان حاصل کر پاؤں گی۔ شاید اُس کی اور میری دوستی، ذہنی ہم آہنگی شادی جیسے مشکل رشتے کو نباہنے میں آسانی کر دے۔" وہ زمین میں اپنی آنکھیں گاڑے بولی۔

مبشر حسین پہلے تو کچھ لمحے سوچتے رہے، پھر اپنی گردن اثبات میں ہلانے لگے۔

"جیسی تمہاری مرضی...... میں کل ہی احسن مشکور کی والدہ کو رضامندی کا فیصلہ سنا دوں گا اور تمہاری امی کو بلوا کے کوثر آپا کو بھی سب بتا دوں گا۔" اُن کے چہرے سے موہوم سی ناراضگی جھلک رہی تھی۔

"آپ احسن سے پہلے مل تو لیں۔" وہ گویا اس ناراضگی کو بھانپ چکی تھی۔ چاہتی تھی کہ ماموں اس ناراضگی کا اظہار کریں، اُس سے لڑیں، اُس سے کہیں کہ نہیں، تم عسفان کے لئے بنی ہو اور وہی تمہارا دولہا ہے۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ ماموں کے چہرے عجیب سے تاثرات کے باوجود بھی اُن کی زبان پہ پیار تھا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں نتالیہ! مجھے تمہارے فیصلے پہ یقین ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے جا چکے تھے۔ اور نتالیہ اپنے ہی طے کئے فیصلے پر کتنی دیر آنسو بہاتی رہی تھی۔

❖❖○❖❖

پت جھڑ کی دہلیز پہ بکھرے
بے چہرہ پتوں کی صورت
ہم کو ساتھ لئے پھرتی ہے
تیرے دھیان کی تیز ہوا

اگلی صبح وہ کورٹ جانے کے لئے گھر سے نکلی۔ ابھی سیڑھیاں اُتری ہی تھی کہ سامنے عسفان کو پایا۔ اُس کی آنکھوں سے واضح تھی وہ حالت کہ جو اُس پہ گزر رہی تھی طوفان اُس کے اندر کے اشجار کو توڑے پھوڑے اور جڑ سے اُکھاڑے جا رہا تھا کہ جو اس کے سامنے کھڑی ہے، اس سے محبت کرتی ہے۔ مگر یہ نہ جانتا تھا کہ اُس نے اپنانے سے انکار کیوں کر دیا ہے۔ کیوں اُس کی محبت کو تاریکیوں کو سپرد کر کے ا روشنی کی تلاش میں نکل پڑی ہے۔ وہ ہمت نہ رکھتی تھی کہ اُس کی شدتوں سے آنکھ سکے۔ وہ کترا کے جانے لگی، جیسے کہ اس شخص سے شناسا ہی نہ ہو۔

ابھی دو قدم ہی اُٹھائے تھے کہ وہ پھر سے اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"مجھ سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں، یا اتنی نفرت دل میں پیدا کر لی ہے کہ آ ملانا نہیں چاہتیں؟" وہ بولا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے عسفان! آج بہت اہم فیصلہ ہے۔ کورٹ میں جانے دو دامن بچا کے نکل جانا چاہتی تھی۔

"اس فیصلے سے اہم فیصلہ کیا ہو سکتا ہے، جو تم نے سنایا ہے؟...... اس طوفان زیادہ بڑا طوفان کیا آ سکتا ہے، جسے تم لے کر آئی ہو؟...... میں پوچھتا ہوں، نتالیہ سوچ کر تم نے یہ طے کیا ہے؟ کسی کا دباؤ ہے تم پر یا پھر...... واقعی، تمہیں احسن محبت ہے؟...... یہ کیا ہے نتالیہ؟...... کیا یہ سچائی ہے؟ اگر یہ سچائی ہے تو پھر وہ کیا محبت، وہ وعدے، وہ خواب۔ بولو نتالیہ! جواب دو مجھے۔" وہ اُسے کندھوں سے پکڑ رہا تھا۔ اُس نے آنکھیں موند کے اپنے باہر آتے آنسوؤں کو واپس بھیج دیا اور اپنا آ کی مضبوط گرفت سے چھڑا لیا۔

"ہمارے بیچ کوئی ایسے عہد و پیماں نہ تھے عسفان! کہ جن کو پورا نہ کرنے کا ہو۔ ہمارے دلوں پر جو دو ایک ملاقاتوں کا بوجھ ہے، اُسے اُتار دو اور اپنی زندگی شروعات کرو۔" وہ اپنا آپ بہت ٹھوس کر کے بولی۔

"بوجھ...... ہمارے درمیان کی وہ ملاقاتیں تمہارے لئے بوجھ ہوں گی

میرے لئے وہ سرمایۂ حیات ہیں۔ اچھی طرح جان لو کہ تمہارے بغیر میری زندگی کی کوئی شروعات ہے اور نہ ہی کوئی اختتام۔ اور اگر تم میری نہیں بنی تو کبھی بھی کسی کی بھی نہیں بنو گی...... زندگی بھر تنہائی میں میری محبت ٹیس بن کر تمہارے دل میں جاگے گی، زندگی بھر تمہارے تکیوں پر میری یادوں کے آنسو بن بن کر ٹپکیں گی۔ نہیں رہ پاؤ گی مطمئن تم نتالیہ احمر! نہیں رہ پاؤ گی۔" وہ چھ فٹ کا مضبوط ڈیل ڈول والا بندہ اُس کے سامنے یوں بے بسی سے آنسو بہا رہا تھا اور وہ مندر میں پڑی کسی دیوی کے بت کی مانند بے حس و حرکت کھڑی اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"جانے دو مجھے۔" وہ بولی۔

"جاؤ نتالیہ احمر!...... جہاں جانا ہے، جاؤ...... مگر یہ سوچ لو! کہ واپسی کا سفر آسان نہیں ہوتا...... جن کی آنکھوں کو دیکھ دیکھ کر جینے کی عادت ہو جائے، ان آنکھوں کے بغیر گزر آسان نہیں ہوتا...... میری محبتوں کے سوا تمہیں کوئی راستہ نہیں ملے گا نتالیہ احمر! نہیں ملے گا تمہیں کوئی راستہ، کوئی راہ، کوئی پگڈنڈی...... خود ہی آؤ گی لوٹ کر ایک دن۔"

وہ نیچے فرش پر دو زانو ہو کے بیٹھ گیا۔ آنسو اُس کے چہرے کو بھگو کے اُس کی آنکھوں کو دُھندلا رہے تھے۔ اور نتالیہ وہاں سے چلی گئی۔

اوپر کھڑکی میں کھڑی انزلہ بھی بے شمار رو رہی تھی۔ عسفان اور نتالیہ اُس کے لئے دونوں بہت قیمتی تھے اور ان دونوں کو دُکھی وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اُسے نتالیہ کے کئے فیصلے پر حیرت بھی تھی اور دُکھ بھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہیں، مگر وہ نتالیہ کے کئے اس کٹھور فیصلے کی وجہ نہیں جانتی تھی۔



آفس میں خود کو تنہا پاتے ہی نتالیہ احمر نے اپنی فائل اور گاؤن پھینکے اور زور زور سے آنسو بہانے لگی۔ وہ طوفان جو بے حسی کے پردے میں چھپائے بیٹھی تھی، اسے دل کھول کے باہر آنے دیا۔ وہ چیخ رہی تھی۔ جھٹپٹا رہی تھی۔ عسفان کی آنکھ سے بہتا ایک ایک آنسو اور اُس کا ایک ایک لفظ اُسے توڑ پھوڑ رہا تھا، اُسے منتشر کر رہا تھا۔ اُس کی شدتیں پل بھر میں بے وفائی کا روپ دھار چکی تھیں۔ وہ نرم، کومل جذبوں والی لڑکی پل بھر میں اِک بے حس اور ظالم لڑکی بن چکی تھی۔ یہ کسی کو علم نہ تھا کہ خوابوں کے ٹوٹنے کا اِک شور اُس کے دل میں بھی جاری ہے۔ بکھرے ارمانوں کی کرچیاں اُس کی آنکھوں میں بھی چبھی ہیں، اس سے کوئی واقف نہ تھا۔

اور پھر اگلے ہی پل اُس کے آفس کے دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔ اُس نے
اپنے آنسو پونچھے، بال بنائے اور چھوٹے سے واش روم کے سنک سے منہ پہ پانی کے
تین زور کے چھینٹے مارے۔ دستک دوہرائی گئی۔ وہ واپس آئی، اپنا گاؤن اُٹھا کے پہنا
"کم اِن" کہہ کے اپنی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ دروازہ کھلا اور احسن مسکورا اپنی بھرپور شخصیت
کبھی نہ مٹنے والی مسکراہٹ کے ہمراہ اُس کے سامنے تھا۔ نتالیہ یقیناً اس وقت اُس کا سا
نہ کرنا چاہتی تھی۔

"کیا میں بیٹھ سکتا ہوں نتالیہ؟" وہ مسکرا کے بولا تھا اور اُس نے ہمیشہ کی طرح فار
لیس کہہ کے اُسے کرسی پہ بیٹھنے کا کہا تھا۔ اُس کے بیٹھنے کے بعد وہ فائل کھول کے دیکھنے لگی۔

"آج ظفر اقبال کے کیس کی فائنل ہیرنگ ہے ناں؟" اُس کے بات شروع کر
پر احسن نے اثبات میں جواب دیا۔

"کس وقت شروع ہوگی کورٹ کی کارروائی؟" وہ پھر بولی۔

"لنچ ٹائم کے بعد۔" احسن نے جواب دیا۔

"اور باقی کون کون سے کیسز ہم نے آج دیکھنے ہیں؟" وہ اُسے کسی اور بات کے
متعلق بولنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

"نتالیہ! پلیز، تھوڑی دیر کے لئے مجھے کچھ کہنے دو۔" وہ اُس کو مسکرا کے مخاطب کرنے
لگا۔ وہ چپ رہی۔ آنکھیں فائل پہ ٹکی تھیں۔

"کورٹ کے کیسز اور فارمل باتوں کے علاوہ بھی ہمارا ایک رشتہ ہے، اور اب تو اِک
اور رشتہ بندھنے جا رہا ہے۔"

"احسن! جس طرح تم نے مجھ سے بنا پوچھے، بنا بات کئے ہی اپنا پرپوزل میرے گھر
بھیج دیا، مجھے بتانا تک گوارا نہیں کیا کہ تمہاری والدہ اور بہن ہمارے گھر کیوں جا رہے ہیں،
بالکل اسی طرح مجھے مت بتاؤ کہ تمہارے اور میرے بیچ کون سا رشتہ جڑنے والا ہے۔" وہ
لئے دیئے انداز میں بولی۔

"کیا تمہیں میرا اس طرح پرپوزل بھیجنا برا لگا؟"

"تم میرے دوست کہلاتے ہو ناں خود کو۔ تو کیا اتنا بڑا قدم اُٹھانے سے پہلے تم مجھے
بتا نہیں سکتے تھے؟" اُس نے پہلی بار آنکھیں اُٹھا کر اُس کی جانب دیکھا۔

"اتنے سالوں سے میں تمہیں جانتا ہوں نتالیہ! اور مجھے یہ علم تھا کہ تم کسی سے بھی شادی
کرنا نہیں چاہتیں۔ لیکن پتہ نہیں کب، کس لمحے میں تمہیں چاہنے لگا۔ اور اسی چاہت نے

مجھے یہ قدم اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اگر تمہیں میرا یہ طریقہ برا لگا تو آئی ایم سوری۔" وہ اُس
کی آنکھوں میں جھانک کے بولا۔

"ابھی مما کا فون آیا تھا۔ اُنہوں نے بتایا کہ تم نے یہ پرپوزل قبول کر لیا۔" وہ مزید
بولا۔ خوشی کے عکس اُس کے چہرے سے چھپائے نہ چھپ رہے تھے۔ وہ اس وقت خود کو دنیا
کا خوش نصیب ترین بندہ سمجھ رہا تھا۔

"احسن!........ ہم یہاں آفس میں اس طرح کی کوئی بات ڈسکس نہیں کریں گے
کیونکہ یہ باتیں پہلے بھی ہمارے بڑوں کے درمیان ہوئی ہیں اور آئندہ بھی انہی کے بیچ
ہوں گی۔ ہمارا اس میں کوئی کردار نہ ہوگا، سمجھ گئے تم؟" اُس نے سختی سے احسن کی جانب
دیکھا تھا اور وہ خاموشی سے اُس کو دیکھے گیا۔



کتنا گریز کیا تھا عسفان کی محبت سے اُس نے۔ کتنا کترائی تھی خوابوں کا ہاتھ تھامنے
سے وہ۔ کتنا چھپی تھی خوابوں کے آئینوں سے۔ مگر اتنے گریز، اتنے بچاؤ کے باوجود بھی وہ
محبت کی اس دلدل میں پھنس گئی تھی اور اب کتنا مشکل تھا اپنے پاؤں اس سے نکالنا۔ اگر وہ
خواب نہ دیکھتی، خوابوں کے ریت محل نہ جوڑتی، جانتی تو تھی کہ وہ ریت محل پل میں ٹوٹ
جاتے ہیں۔ خود ہی تو سمجھاتی تھی وہ عسفان کو۔ وہ کہ جو اتنی حقیقت پسند لڑکی ہوا کرتی تھی،
کس طرح اپنا آپ خواب جزیروں میں کھو بیٹھی۔ کیا اُس کی عمر کا قصور تھا یا پھر بیری دل کا
کہ جو اُس کا ہوتے ہوئے بھی اُسے دھوکا دے گیا۔

جس طرح عسفان سے محبت کا اقرار کر کے وہ ممانی کی گنہگار ٹھہری تھی، اسی طرح
اُس سے محبت سے انکار کر کے وہ دنیا کی نگاہوں میں قصوروار ٹھہری تھی۔ انزلہ اور خالہ کے
علاوہ ماموں بھی اُس سے خفا تھے۔ بظاہر تو نہیں لیکن اُن کی بہت سی باتوں سے اُسے اندازہ
ہوتا تھا۔ انزلہ نے تو اُس سے بات کرنا تک چھوڑ دیا تھا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پہ کھانا کھانے
بیٹھتی تو انزلہ پلیٹ اُٹھا کر کمرے میں چلی جاتی اور اگر بیٹھتی بھی تو اُس سے بات نہ کرتی۔
اب تو وہ خود کو آئینے سے بھی آنکھ ملانے کے قابل نہ سمجھتی تھی۔ اتنا قابلِ نفرت سمجھنے لگی تھی
خود کو۔ محرومیوں کے سانپ کہ جن کے زہر کو عسفان کی رفاقت کم کر چکی تھی، ایک بار پھر
اپنے زہریلے پھن پھیلائے اُسے ڈسنے کو تیار تھے۔

اُس شام گھر میں کوئی نہ تھا۔ ممانی اپنی بہن کے گھر ارسل کے ہمراہ گئی تھیں اور ماموں
کسی دوست کے گھر۔ وہ گھر لوٹی تو دروازہ انزلہ نے کھولا۔

''کہاں گئے ہیں سب لوگ انزلہ؟'' اُس کے سوال کا جواب دیئے بغیر ہی انزلہ اور کمرے کی طرف جانے لگی۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے........ کیا میں اتنی غیر ضروری ہو گئی ہوں تمہا لئے کہ تم میری بات کا جواب تک نہیں دیتیں؟'' وہ بولی تھی۔

''مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔'' انزلہ نے صاف کہہ دیا تھا۔

''کیوں نہیں کرنی مجھ سے بات؟ کیا کر دیا ہے میں نے؟''

''نہیں........ تم نے کچھ نہیں کیا۔ کچھ بھی نہیں کیا۔ کیا تو اُس نے تھا، جواب تمہاری محبت اور بے وفائی کے غم میں قطرہ قطرہ پگھل رہا ہے۔ تم نے واقعی کچھ نہیں کیا احمر!........ محبت بھی نہیں........ لیکن جانتی ہو، تمہارا یہ کچھ نہ کرنا بھی اُس پر کتنا بھاری ہے؟'' انزلہ کے چہرے پر کتنے افسوس کے سائے تھے۔

''انزلہ! میں نے تمہارا یا عسفان کا دل توڑنے کے لئے یہ فیصلہ نہیں کیا۔ کاش مجھے مل سکتیں، میرے ارادوں، میری مجبوریوں کو جان سکتیں۔'' وہ تڑپی تھی۔

''پلیز ثنالیہ!'' انزلہ نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ کوئی بھی مجبوری کس زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتی۔ میں پوچھتی ہوں اگر احسن مشکور کی دوستی عسفان کی پہ حاوی تھی تو پھر تم نے کیوں اُس کے دل میں نئے ارمان جگائے؟ چاہے چند دنوں لئے ہی صحیح، تم نے اُس کو ہرٹ تو کیا ناں........ دل تو توڑا ناں تم نے اُس کا۔ تم تو ش کر کے اپنا گھر بسا لو گی اور شاید چند ہی ماہ کے اندر تمہیں اپنی پچھلی زندگی مذاق ہی لگے لیکن اُس لڑکے کا کیا ہو، جو تمہاری محبت کی آگ میں پل پل سلگ رہا ہے........ کیا ا مشکور کی چند دنوں کی شناسائی، عسفان بھائی کی برسوں کی محبت پہ بھاری تھی؟ بولو نہ جواب دو۔'' انزلہ کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

''ہر کوئی مجھ سے ہی جواب مانگنے آ جاتا ہے۔ لیکن میں اپنے سوالوں کے جواب سے مانگوں؟'' ثنالیہ کی آنکھیں بھی نمی سے جھلملائی تھیں۔

''دلوں کے اندر چھید کرنے والوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی سے کوئی جواب کریں۔ اور اگر جواب تمہیں مانگنا ہی ہے ناں، تو جا کے اُس شخص سے مانگو، جو تمہا بے وفائی پر دنیا تیاگ کر ایک کمرے کا قیدی بن کر رہ گیا ہے........ جاؤ، اُسی سے اپنے ہر سوال کا جواب کہ جس نے کل اپنی گاڑی کو جان بوجھ کر سڑک سے گرا دیا۔ مگر موت نے بھی تمہاری طرح اُسے اپنانے سے انکار کر دیا۔''

وہ نم آنکھوں سے کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور ثنالیہ کے پاؤں تلے سے تو یے زمین ہی نکل گئی۔ کل عسفان نے اپنی جان دینے کی کوشش کی اور اسے علم ہی نہ ہوا۔ ں دیوانے لڑکے نے اپنی قیمتی جان اُس کے لئے گنوانے کی ٹھان لی اور وہ بے خبر رہی۔ سے جان بوجھ کر بے خبر رکھا گیا تھا، یا پھر واقعی میں سبھی لوگ اُس کو قصور سمجھ رہے تھے۔ کیا سفان کی اس حالت کی ذمہ دار وہ اکیلی تھی؟........ حالات تھے، یا پھر مقدر؟........ امتحان لینے کے لئے کیا تقدیر کو صرف اُسی کی جان ملی تھی؟

وہ فوراً سے بھی پہلے اپنے گھر سے نکلی اور خالہ کے گھر کا ڈور بیل بجایا۔ عسفان نے روازہ کھولا۔ خالہ ہمیشہ کی طرح بہت پیار سے ملیں اُس سے۔ اُن کے چہرے پر غم کے ائے تو اُسے نظر آئے مگر رنجش کے نہیں۔

کچھ لوگ کچی مٹی کی طرح ہوتے ہیں، اُن پر کتنی ہی بارشیں کیوں نہ برسیں، وہ تمام انی اپنے اوپر برداشت کر لینے کے باوجود بھی اسے جذب کر دیتے ہیں۔ اور ماموں اور لہ بھی اُنہی لوگوں میں سے تھے۔ ثنالیہ نے نادانستہ طور پر جو دُکھ اُن کو پہنچایا تھا، اُن وں نے اُسے بھی جذب کر دیا۔

وہ خالہ کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ محبت بھری یہ گود اُسے ماں کی رح لگی تھی۔ گو کہ وہ ممتا کی گرمی سے آشنا ہی نہ تھی۔

''کیوں رو رہی ہو میری جان! کہو مجھ سے۔ بتاؤ مجھے، کیا بات ہے جو تیرے دل کو ئے جا رہی ہے؟'' کوثر خالہ کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔ وہ اس وقت عسفان کی ماں یں، اُس کی دوست بنی بیٹھی تھیں۔

''خالہ جانی!........ میری وجہ سے عسفان نے........ میں ہرگز بھی یہ نہ چاہتی تھی خالہ انی! میں اپنی ذات سے کسی کو بھی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی۔'' وہ روتی ہوئی کہنے لگی۔

''تم نے کسی کو بھی تکلیف نہیں پہنچائی ثنالیہ! اگر تم نے یہ فیصلہ اپنی خوشی اور مرضی سے کیا ہے تو یقین کرو، میں عسفان کو اپنی من مانی کرنے نہیں دوں گی۔ لیکن بیٹا! اگر تم پر کسی کا باؤ یا کوئی اور بات ہے تو خدا کے لئے اپنی خواہشوں کا قتل مت کرو۔'' خالہ نے اُس کے الوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ وہ چپ ہی رہی۔

''عسفان کے ساتھ ساتھ میں نے بھی تمہیں مانگا ہے بیٹا! لیکن ہم سب کے لئے تمہاری خوشی زیادہ ضروری ہے۔ اگر تم نے انکار کیا ہے تو یقیناً سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔''

''خالہ جانی! میں مجبور ہوں۔'' وہ کسمسائی تھی۔ مجبوری اور بے بسی یقینی طور پر اُس کے

چہرے سے واضح تھی۔ اور اس کے بعد خود کوثر نے بھی نہیں اُس سے پوچھا کہ آخر وہ مج
کون سی ہے۔ جبر کی، یا پھر خواہش کی۔

"میں عسفان کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ ایک بار خالہ جانی!" التجا تھی یا فرمائش، جو بھی
بہرحال اُسے اس کا حق نہ تھا۔

"مل لو اُس سے........ اُس کی طبیعت کو بھی چین آ جائے گا۔ اور ہاں، عنقریب وہ
پاکستان چھوڑ کر انگلینڈ جا رہا ہے۔ وہیں سیٹل ہونے کے ارادے کے ساتھ۔" خالہ کی
اس خبر پہ پل بھر کو وہ لڑکھڑائی تھی۔ اُسے لگا کہ وہ زمین میں دھنس رہی ہو۔ پاؤں
اچانک سرسراہٹ نے یہ محسوس کرایا کہ جیسے کوئی لہر پاؤں تلے سے واپس جا رہی ہو۔ ا
کے پاؤں ریت میں دھنس رہے ہوں۔

خالہ اندر جا چکی تھیں۔ وہ مڑی اور عسفان کے کمرے کی طرف آئی۔ اندر سے
مغنیہ کی درد بھری آواز نے سر اُٹھایا۔

اب کے تجدید وفا کا نہیں امکان جاناں
یاد کیا تجھ کو، دلائیں تیرا پیماں جاناں
یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انسان جاناں
دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں، دل تو ہے ناداں جاناں
اوّل اوّل کی محبت کے نشے یاد تو کر
بن پیئے بھی تیرا چہرہ تھا گلستاں جاناں
ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اُڑتے ہوئے اوراق پریشاں جاناں

کمرے میں ان ڈائریکٹ لائٹ کی مدھم روشنی تھی۔ عسفان نیچے پڑا تھا اور گٹار بھی
گٹار کے خاموش وجود پہ کچھ حرف ساکت تھے۔

مجھے تم سے محبت ہے........ کی گنگناہٹ اچانک نتالیہ کو اپنے کانوں کے اندر گھو
محسوس ہوئی۔

چند ہی دنوں میں کیا حال کر کے رکھ دیا تھا محبت نے اُس کا۔ جیسے کہ اُس کا ہر
لٹ گیا ہو۔ جیسے کہ وہ اپنا تمام زادِ راہ کہیں کھو چکا ہو۔

دروازے پہ ہلکی سی دستک نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ نتالیہ کو دیکھ کر اُس نے اپنی
اُنگلی میں تھامی جلتی سگریٹ کی راکھ کو کرسٹل کے ایش ٹرے میں مسلا۔

"اندر آؤ۔" سر کے بائیں حصے پہ لگے بینڈیج پہ اب بھی خون کا سرخ دھبہ تھا اور
دائیں ہاتھ پہ بھی پٹی بندھی تھی۔ وہ اندر آئی اور اُس کے سامنے ہی کارپٹ پہ بیٹھ گئی۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" اُس کے سوال پہ وہ پل بھر کو ہنسا تھا۔ "بہت گہری
چوٹ آئی ہے کیا؟" ایک اور سوال اُٹھا اور اِک اور مسکراہٹ اُس کے چہرے پہ آئی۔ "اور
یہ سگریٹ کب سے پینا شروع کر دیا ہے آپ نے؟"

اب کے عسفان کی مسکراہٹ بہت گہری ہو گئی۔

"میں تمہارے کس کس روپ کو سمجھوں نتالیہ! کبھی ظالم بن کے دُکھ دیتی ہو، تو کبھی درد
آشنائی کی چادر اوڑھے بڑے حق سے سوال کرتی ہو۔"

"آپ زندگی کے معمولی حادثوں کے پیچھے اپنی جان گنوانے پہ تُل جائیں، اور میں
آپ سے بھی پوچھنے نہ آؤں؟ اور میں نے کون سا ظلم کیا ہے آپ پر؟ میں نے تو صرف
اپنے ایک دوست کو اپنے لئے چنا ہے۔" وہ بہت ہٹ دھرمی سے بولی۔

"دشمن تو تمہارا میں بھی نہ تھا۔" وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ چپ کا قفل اُس کے ہونٹوں
پہ لگ چکا تھا۔

"ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں آپ؟"

"ارادہ تو ہے۔ لیکن میرے ارادے کہاں پورے ہوتے ہیں؟ بس امی ابو بھیج رہے
ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ شاید میری ہستی ٹوٹ پھوٹ کا ہی شکار رہے گی، اگر میں یہاں رہا
تو۔" وہ سفید پنجرے پہ اپنی اُنگلیاں پھیرنے لگا۔

"خوش رہ سکو گی میرے بغیر؟" اچانک ہی سوال کیا اُس نے اور نتالیہ کے دل کا اِک
تار لرزا تھا۔ آنکھوں کے کونے نم ہو گئے تھے۔ گلے میں اِک بوجھ سا اٹکا تھا۔

"اوہ........ میں تو بھول ہی گیا کہ تم نے اپنے لئے اپنے دوست کو چنا ہے۔ اور جہاں
پہ دوستی ہوتی ہے، وہاں اطمینان اور خوشی خود بخود آ جاتی ہے۔ میں تو شاید نہ کہہ سکوں، تم ہی
اپنے دوست سے کہہ دینا کہ وہ تمہارا خیال رکھے اور تمہاری ان ستارہ آنکھوں کو کبھی نم نہ
ہونے دے۔" اُس کی سنجیدگی میں بھی محبت اور وفائیں پنہاں تھیں۔ اتنا کچھ ہو جانے کے
باوجود بھی وہ اُس سے محبت کرتا تھا۔

وہ کارپٹ پہ اپنی آنکھیں ٹکائے خاموش تھی۔

''کبھی کبھی پتہ نہیں، کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہیں کسی نے اس فیصلے پہ مجبور کیا
تم کسی بے بسی کے تحت مجھے چھوڑ رہی ہو۔'' اُس کے اس جملے پہ وہ ٹھٹکی تھی۔ مزاج
کی یہ حد........ جاننے پہچاننے کی اتنی شدت۔ اُس کا دل زور سے چاہا کہ وہ ہاں کر
کہہ دے کہ ہاں، وہ مجبور ہے۔ اُسے چھوڑنے اور احسن کو اپنانے کے لئے بے بس
قصور ہے وہ۔ لیکن جو کر چکی تھی، جو کہہ چکی تھی، اسے جھٹلانا شاید اُس کے اختیار میں
وہ خاموشی سے اُٹھی اور واپس جانے لگی۔ سوچا تھا کہ اُس سے مل لینے کے بعد دل
بوجھ کو کچھ ہلکا کر دے گی، لیکن دل کا یہ بوجھ ملنے کے بعد مزید بڑھ گیا تھا۔



رات کے کھانے کے وقت سبھی لوگ ڈائننگ ٹیبل پہ جمع تھے۔ آنٹی، ماموں، انزلہ
اور ارسل۔

''انزلہ بیٹے! تمہارا رزلٹ آ گیا ہے۔ آگے کیا ارادہ ہے تمہارا؟'' مبشر حسین
کھانے سے فارغ ہونے کے بعد نیپکن سے اپنے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

''میرا خیال ہے پاپا جی! کہ میں اکنامکس میں ماسٹرز کر لوں۔'' وہ بولی تھی۔

''تمہاری امی اور مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی۔'' ثنالیہ کی موجودگی اور اس کی
بھی لیتی تھی، انزلہ بیٹی! اس گھر میں ہر کسی کو اپنے فیصلے کرنے کا حق حاصل ہے۔
بڑوں کی خوشی پھر بھی نظر میں رکھنی چاہئے بچوں کو۔'' ماموں کے اس ذومعنی جملے پہ
چونکی تھی۔ یقیناً یہ ماموں کے دل کی رنجش بولی تھی۔

انزلہ متوجہ تھی۔

''تمہاری امی نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری اور عسفان کی منگنی کر دی جائے۔''
کے اس جملے کے بعد اُس کا منہ تک جاتا ہوا نوالہ رُک گیا تھا۔ ذہن میں اِک دھماکا
تھا اور خود انزلہ بھی حیران سی والد کو دیکھنے لگی۔

''تمہاری پھپھو سے میں نے مشورہ کیا تھا، اُنہوں نے عسفان سے بھی پوچھا
کوئی اعتراض نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ عسفان کے انگلینڈ جانے سے پہلے، ثنالیہ کی
کے ساتھ ہی تمہاری بھی منگنی کر دی جائے۔''

''لیکن پاپا جی!'' انزلہ نے کچھ بولنے کی سعی کی۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں انزلہ! ہمارا فیصلہ تمہیں ماننا ہی پڑے گا۔ آج کل بچے لازم
بڑوں کا دل دُکھا کے بھی اپنی من مانی کرتی ہیں۔ جب عسفان لڑکا ہو کے مان سکتا ہے

ں؟'' ممانی کی زبان کے نشتر کی سمت اُسی کی جانب تھی۔ وہ چپ تھی۔
مبشر حسین اُٹھ کر اپنے کمرے کی جانب چلے گئے۔

''مما! آپ جانتی ہیں کہ عسفان بھائی میرے لئے بھائی ہی کی طرح ہیں۔'' انزلہ
احتجاج کیا تھا۔

''بھائی کی طرح ہے۔ بھائی ہے تو نہیں ناں۔ اور یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ کیا
پھوپھی زاد سے شادی نہیں ہو سکتی؟........ اور خبردار! جو میرے سامنے زبان کھولی تو۔
دکا اثر تم پر بھی ہونے لگ گیا ہے۔'' ممانی یہ کہہ کے برتن اُٹھا کے کچن میں چلی گئیں۔
کے حلق نے کھانے سے انکار کر دیا۔ وہ ممانی کی بات مان کر بھی اُن کی گناہ گار تھی۔
کبھی کسی زبان کو رب تعالیٰ اتنا صبر نہ دے، کہ وہ احتجاج بھی نہ کر پائے........ انزلہ
ثنالیہ کی جانب دیکھا، جس نے بھینچی مٹھی میں چمچ کو زور سے تھاما ہوا تھا۔

''کل تم گئی تھیں ناں عسفان بھائی سے ملنے۔ کہیں تم نے تو نہیں انکار کیا اُنہیں ہاں
نے کو؟'' انزلہ کی آواز اُسے کسی گہری کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ سب سمیت
کی آنکھوں میں بھی چھوٹی ہو گئی تھی........ اتنی شدت سے محبت کرنے والی انزلہ بھی
ے ناراض تھی۔

''انزلہ! کوئی کسی کو کچھ کرنے پہ مجبور نہیں کر سکتا۔ اور پھر اس بات میں حرج ہی کیا
تم اور عسفان اچھے دوست ہو، ایک دوسرے کے قائل ہو۔ تم دونوں کا کپل بہت
ار ہے۔'' اُس نے کمال ضبط سے کہا تھا۔

''تم صرف دوست، دوست کی رٹ لگاتے ہی رہنا، باقی رشتے کوئی ضروری نہیں
ے لئے۔'' انزلہ کے اس جملے پہ اُس کے ہونٹ مسکرائے تھے، تمسخرانہ پن سے۔

''میں نے تو جو کر لیا، سو کر لیا۔ پلیز! تم میری طرح کسی کا دل نہ دُکھانا۔ اور عسفان کو
ے علاوہ اور کوئی نہیں سنبھال سکتا۔'' یہ کہہ کے وہ ٹیبل سے اُٹھی، اپنے کمرے میں
دوپٹہ منہ میں دبایا اور زوروں سے رونے لگ گئی۔ لیکن اُس کی آواز سیاہ سوتی دوپٹے
جذب ہوتی رہی۔



''کیا میں آپ سے پوچھ سکتی ہوں کہ اِتنی جلدی اتنا اہم فیصلہ کر لینے کے پیچھے کیا وجہ،
بوری ہے؟''

انزلہ خصوصی طور پر اُس کے آفس اُس سے ملنے آئی تھی۔ وہ، جو نہ صرف اُس کا کزن

تھا بلکہ اُس کا ہم راز، اُس کا دوست بھی تھا۔ ستالیہ کی محبت عسفان نے پل پل انزلہ سے شیئر کی تھی۔ اپنی ہر فیلنگ کا اُسے امین بنایا تھا۔ اور یوں بھی انزلہ ایک اسپیشل لڑکی تھی۔ شدتوں سے چاہنے والی، ہر رشتہ خوب گہرائی میں اُتر کر نبھانے والی۔ اُس میں اور ستالیہ میں ایک غیر معمولی قسم کی شباہت تھی۔ خال و خد سے لے کر احساسات تک کی شباہت۔

"انزلہ! مجھے علم ہے کہ تمہیں بھی میری ہی طرح یہ فیصلہ بہت عجیب لگ رہا ہوگا۔ سچ پوچھو تو پہلے پہل میں خود بھی اسے قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ لیکن پھر میں نے سوچا، بہت سوچا اور اس نتیجے پہ پہنچا کہ اپنی یک طرفہ ضد اور دیوانے پن کے پیچھے اپنے امی، بابا اور ماموں کا دل دُکھانا صحیح نہیں۔ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اذیت میں مبتلا رکھنا، یہ کہاں کی سمجھ داری ہے؟" وہ بہت ہی سنجیدگی سے بولا۔

"لیکن عسفان بھائی! کیا جبراً مان لئے جانے والے فیصلے صحیح سمت میں جا سکتے ہیں؟" انزلہ ابھی تک پریشان تھی۔

"یہ کبھی مت سمجھنا کہ تمہیں اپنا لینے کا فیصلہ میں نے کسی جبر کے تحت کیا ہے۔ میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم سے زیادہ نزدیک شاید کوئی بھی نہیں میرے۔ وہ بھی نہیں کہ جسے سب سے زیادہ قریب سمجھتا تھا میں۔" عسفان کے چہرے پر اُداسی کے سائے نجانے کہاں سے اُڑ کر آ گئے، جیسے کہ سفید کبوتر آسمان سے اُتر کر آنگن میں آ بیٹھے۔

"اور اُسی ظالم ہی کے تو الفاظ ہیں کہ جہاں دوستی ہوتی ہے، وہاں اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ اُس نے بھی اپنے لئے اپنے دوست کو چنا ہے۔ تو اگر میں نے اپنے دوست کو اپنانا چاہا ہے تو کیا ہے۔ دوست تو خوشیوں کے ساتھ ساتھ دُکھوں میں بھی شریک ہوتے ہیں ناں۔" اُس نے انزلہ کی اُداس آنکھوں میں جھانکا تھا، جہاں پہ اب بھی سوچ اور پریشانی کے سائے تھے۔

"میں نے آپ کو کبھی اس طرح سوچا ہی نہیں۔" اُس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔

"انزلہ! انسان نجانے کیا کیا سوچتا رہتا ہے۔ آرزو کے دھاگوں کو اپنے من مرضی سے گانٹھتا رہتا ہے۔ لیکن قسمت اُن گانٹھوں کو اپنی مرضی سے کھولتی ہے، اپنی مرضی سے نئی گرہیں لگاتی ہے اور انسان تا عمر بس ہاتھ ملتا ہی رہ جاتا ہے۔" اُداسی دونوں پہ بیک وقت اپنی گرفت مضبوط کئے تھی۔ دونوں پہ بیک وقت پرانے رشتوں کی زنجیریں اپنی گرفت مضبوط کئے تھیں۔ دونوں بیک وقت نئی بندھنے والی گرہوں سے خوف زدہ تھے۔

"زندگی کسی نہ کسی کے ساتھ تو گزارنی ہے ناں....... کسی نہ کسی کا ہاتھ تو تھامنا ہے

الی۔ جب ہر رشتہ ہی قید ہے تو کیوں نہ اپنے دوست ہی کی قید کو اپنا لیا جائے۔ جب ہر طرف جنگل اور بھیڑیے ہیں تو کیوں نہ اپنی پسند کے جنگل کو منتخب کیا جائے۔" نجانے وہ زلہ کو سمجھا رہا تھا یا پھر اپنے دل کو....... اُس کے سامنے والی چیئر پر پیپر ویٹ کو گھماتی، اس سی لڑکی ابھی تک خاموش تھی۔

"تمہارے پاس سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لئے بہت وقت ہے انزلہ! یقیناً کسی بھی کی کے لئے یہ مشکل ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسے لڑکے سے شادی کر لے کہ جو کسی اور سے بت کرتا ہو۔ تم پر کسی کا بھی دباؤ نہیں ہے انزلہ!" وہ اپنی آنکھیں جھکائے بولا اور انزلہ جو نہ اُس کی باتوں اور اُس کی اُداس آنکھوں سے پہلے ہار مان چکی تھی، اُس کی عظمت کی اور رف ہو گئی۔ وہ ٹوٹا بکھرا وجود تھا، محبت کی چوٹ کھایا ہوا، ایک ہارا ہوا انسان تھا۔ اور اُس صرف انزلہ کی دوستی ہی سمیٹ سکتی تھی۔ اُس کی خواہشوں کی ٹوٹی مالا کے بکھرے موتیوں صرف انزلہ کی چاہت ہی دوبارہ پرو سکتی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

"کیا آپ اپنے دل میں مجھے جگہ دے پائیں گے؟" وہ اپنی تمام تر قوت مجتمع کر کے ۔ اس غیر متوقع سوال پہ وہ چونکا تھا۔ کتنی دیر دونوں خاموش رہے اور پھر اس خاموشی کو ان کی آواز نے چیرا۔

"کسی کو دل میں جگہ دینا مشکل نہیں ہوتا انزلہ! کسی کو دل سے نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ ویسے بھی زندگی کی طرح دل میں بھی ہر کسی کی جگہ متعین ہوتی ہے، جسے کوئی بھی دوسرا نہیں پاتا۔ سمجھی تم؟" اُس کے اس پُر خلوص جواب پہ وہ پہلی بار مسکرا دی تھی۔ اُس کی وں سے ایک پہلا ہی شگوفہ پھوٹا تھا۔

"اچھا، اب میں چلتی ہوں۔ یہاں آنے کا گھر پہ کسی کو بتایا نہ تھا۔" وہ اُٹھنے لگی۔

"رُکو۔ دونوں مل کے چلتے ہیں۔ سنا ہے کہ شادی سے قبل ایک دوسرے کو سمجھنا ضروری ہے۔ اور سمجھنا، ساتھ رہنے سے ہی ہوتا ہے۔ ہے ناں؟" اُس کے اس انداز پہ وہ شرما نہ پائی تھی کہ اُس کی عسفان سے رشتے کی نوعیت پہلے اس طرح کی کبھی بھی نہ تھی۔ اور پانک ہی ہو جاتا۔

ظاہری طور پر جو بھی ہو، پس منظر تو یہ تھا کہ عسفان خود کو بھی جھوٹے دلاسے ہی دے ا۔ اور اتنی جلد بازی سے اس فیصلے کو مان لینا بھی صرف اور صرف اِک ضد تھی۔ ستالیہ د کا جواب....... اور اِک ضد۔

اگر وہ اُسے ٹھکرا کے، بھول کے کہیں اور شادی کر سکتی تھی، تو کیا عسفان نہیں کر سکتا

تھا؟........انا اُس میں تھی تو کیا عسفان میں نہ تھی؟........محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ اور یہ محبت بھی تو اِک جنگ کا روپ لے چکی تھی۔ دونوں ہی اپنی اپنی محبتوں کو زبردستی اپنے دل میں دبائے، اپنی اناؤں کی فتح کے جھنڈے گاڑنے نکلے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ شکست کس کو ہوتی ہے۔ محبت کو........ یا جنگ کو........



خودسپردگی کی یہ شام دونوں گھروں پہ ایک ساتھ ہی اُتری تھی۔ ایک ہی گھر کی دو بیٹیاں ایک ہی ساتھ کسی سے منسوب ہو رہی تھیں۔

ایک طرف انزلہ تھی........ سبز رنگ کے نیٹ کے کامدانی سوٹ میں، چہرے پہ اِک انمول مسکراہٹ کو کھلائے ہوئے۔ دل کا پس منظر جو بھی ہو، لیکن پیش منظر بہر حال خوش تھی۔ اور ویسے بھی عسفان کی چند ملاقاتوں اور تسلی بخش باتوں نے اُسے ذہنی طور پر بہت باتوں کے لئے تیار کر دیا تھا۔

اور نتالیہ........اُس کا اور اُس کے کردار کا پیش منظر یہ تھا کہ اُس نے من مانی کی تھی۔ اپنی پسند سے احسن کو اپنایا اور عسفان کو ٹھکرایا تھا۔ لیکن اُس کا پس منظر تو یہ تھا کہ یہ شام اُس کی زندگی میں اِک آزمائش کا روپ تھی........ کسی کے ساتھ بندھن میں بندھنا اُس نے کبھی چاہا نہیں تھا۔ اور اگر چاہا بھی تھا تو صرف اور صرف عسفان کے ساتھ کہ جس کے دل کے پنجرے میں اُس کی محبت اِک پرندے کی مانند قید تھی۔

ایک طرف عسفان تھا، ہونٹوں پہ جھوٹی مسکراہٹ کا اِک خول چڑھائے ہر کسی سے مل رہا تھا........ لگتا تھا کہ اُسے جیسے کوئی دُکھ ہی نہ ہو نتالیہ کے کھونے کا، اُس کا ساتھ کسی اور کو ملنے کا، زندگی بھر کے لئے اِک دُکھ پال لینے کا........ وہ تو اپنی انا کی چادر اپنے اوپر اوڑھے اِک جنگ میں مصروف تھا۔ نتالیہ کو یہ ثابت کرانے کی جنگ کہ وہ اُس کے ٹھکرانے کے باوجود بھی خوش ہے۔ کسی اور نے اُسے اپنا لیا ہے، کوئی اور اُس کا ہونے اور اُسے اپنا نام دینے پر تیار ہے۔

اور احسن........وہ ہر قسم کی ہار جیت، جنگ اور محبت سے بے خبر اپنی قسمت پہ نازاں اور نتالیہ جیسے ساتھی کے ملنے پر از حد خوش تھا۔ اُس کی مسکان، اُس کی آنکھوں کی چمک کسی سے بھی پوشیدہ نہ تھی۔

یوں تو دونوں خاندان خوش تھے۔ مبشر حسن اور زہرہ بیگم بھی خوش تھے کہ جن کی فرمانبردار بیٹی نے اُن کا کہا مانا تھا اور اُن کے بہت ہی پیارے بھانجے عسفان کا ساتھ

قبول کیا تھا۔ دوسری طرف مبشر حسن نے نتالیہ کا فرض بھی بخوبی ادا کیا تھا۔ فائزہ بیگم نتالیہ کی ہزار نفرتوں کے باوجود بھی وہاں موجود تھیں۔ وہ ماں تھیں۔ اپنی بیٹی کے لئے دل میں بیش بہا احساسات رکھنے والی۔ اور کوثر بیگم، وہ بھی اِک ماں تھیں، جو کہ اپنے چہیتے بیٹے کے غم کو خوب اچھی طرح محسوس کرتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ عسفان اداکاری کر رہا ہے۔ اپنے ساتھ ساتھ سبھی کو بہلا رہا ہے۔

دُور پار کے سبھی مہمانوں کی آمد کے بعد عسفان اور احسن کو اسٹیج پہ مدعو کیا گیا۔ عسفان نے پہلی بار نتالیہ کو سامنے دیکھا........

زرد رنگ کے سجے سنورے لباس میں، اپنے چہرے کی رنگت بھی زرد کئے بیٹھی تھی۔ نہ آنکھوں میں رمق تھی اور نہ ہونٹوں پہ ہنسی۔ یہ نتالیہ احمر اپنی من مرضی کرنے کے باوجود بھی اتنی ٹوٹی، بکھری کیونکر تھی؟........ ہر داؤ اپنی خواہش کے مطابق چلانے کے باوجود بھی وہ ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح پژمردہ کیونکر تھی؟........ کیوں؟........عسفان سوچ گیا۔ نتالیہ نے آنکھ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

فاصلے ایسے بھی ہوں گے، یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا

وہ اعتماد کی چال چلتا انزلہ کے قریب بیٹھ گیا اور احسن، نتالیہ کے........عسفان نے انزلہ کا نازک ہاتھ تھاما اور گولڈ کی دمکتی نک سک سی انگوٹھی اُس کی تیسری انگلی کے سپرد کر دی۔ سبھی نے تالیاں بجائیں۔

احسن کی والدہ اُس کے قریب آئیں۔ نیلی ڈبیہ میں مقید اِک خوب صورت سا چھلا احسن کو دیا، جسے اُس نے نتالیہ کی اُنگلی میں جگمگانے کے لئے چھوڑ دیا۔ ہر طرف مبارک باد کا اِک شور اُٹھا۔ مٹھائی بانٹی گئی، گیت گنگنائے گئے۔ انزلہ اور احسن بے حد خوش تھے، زندگی کی دُشوار گزار راہوں پر اتنے اچھے ہم سفر ملنے کی خوشی میں۔ اور ان دونوں کے ہم سفر........ اپنے آپ کو، ان دونوں کے سپرد کر کے خود کو کہیں کھو چکے تھے۔ اِک طرف محبت تھی، موہوم سے احساسات تھے، آرزوئیں تھیں تو دوسری جانب انا تھی، ضد تھی، جنگ تھی۔

اور اُن دونوں کے درمیان معلق تھے دو وجود........ایک نتالیہ کا اور دوسرا عسفان کا........

منگنی والا بھاری بھرکم سوٹ اور زیورات اُتار لینے کے بعد وہ بیڈ پہ بیٹھی تھی، اپنا سر گھٹنوں میں دیئے کہ اُس کے کمرے کے دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔ اُس نے گھڑی دیکھی، رات کے ساڑھے بارہ بجنے کو تھے۔ گرمیوں کی مختصر راتوں میں سے ایک رات کا وہ پہر تھا!

اُس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ ہاتھ میں دو چائے کے مگ اُٹھائے وہ انزلہ تھی۔ سفید رنگ کے نائٹ سوٹ میں ملبوس، چہرے پر میک اپ صاف کرنے کے باوجود بھی موجود تھا۔ سفید مخروطی اُنگلی میں عسفان کا رشتہ مسکرا رہا تھا۔

"اندر آسکتی ہوں؟" بہت دنوں بعد وہ پہلے کی طرح مسکرا کے بولی تھی۔ نتالیہ نے اُسے اندر آنے کو راستہ دیا۔

"بہت تھک گئی تھی۔ تھکن کے مارے نیند بھی نہ آرہی تھی۔ سوچا، چائے بنا لوں۔ تمہارے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھی تو سوچا تمہارا حال بھی میرے والا ہوگا۔ اس لئے ایک کپ تمہارے لئے بھی بنا لیا۔ یہ لو۔" وہ اُسے چائے کا مگ دیتے ہوئے بولی۔

"تم بہت اچھی ہو انزلہ!" وہ مگ تھام کے مسکرائی تھی۔

"اتنے دن ہوگئے، تم نے مجھ سے بات بھی نہ کی۔" انزلہ بیڈ پہ تکیہ اُٹھا کے بیٹھ گئی۔

"میں کیسے بات کرتی؟ تم ناراض جو تھی مجھ سے۔" نتالیہ بھی اُس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"جو ناراض ہوتا ہے، اُسے منایا جاتا ہے، اُس کو اُس کے حال پہ چھوڑ کے منہ نہیں موڑا جاتا۔" انزلہ نے پیار سے کہا۔ "تم نے اپنی اَنگیج منٹ رنگ کیوں اُتار دی؟" انزلہ کی نظر اُس کے خالی ہاتھوں پر پڑی۔

"ویسے ہی...... عادت نہیں ہے ناں انگوٹھی چھلوں کی۔ بوجھ محسوس ہو رہی تھی، چبھ رہی تھی۔ اس لئے اُتار دی۔" اُس کی آنکھ کے کونے نم ہوئے تھے۔ یہ بوجھ تو انگوٹھی اُتار لینے کے باوجود بھی ہلکا نہ ہوا تھا۔ یہ چبھن تو ابھی بھی تھی۔

"اس طرح اُتار نہیں دیتے اس کو۔ یہ تو اس نئے رشتے کی نشانی ہوتی ہے۔" انزلہ نے اپنی انگوٹھی کو دوسری اُنگلی سے چھوا تھا۔ اُس کے کھٹے میٹھے احساس اُس کے چہرے سے عیاں تھے۔

"رشتے تو رشتے ہوتے ہیں انزلہ! انہیں کسی نشانی، کسی بیساکھی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کہنے سے رشتے بنائے تو جاسکتے ہیں لیکن توڑے نہیں جاسکتے۔" وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے بولی تھی۔

"تم نے صحیح کہا تھا نتالیہ! کہ جہاں دوستی ہوتی ہے، وہاں رشتوں کو نباہنا آسان ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل تو میرے لئے انتہائی مشکل تھا یہ سوچنا کہ میں عسفان سے منسلک ہوں گی۔ ناممکن سا لگتا تھا پرانے رشتے کو جھٹلا کر، بھلا کر نیا رشتہ جوڑنا۔ لیکن صرف دوستی ہی بنیاد بنی اس نئے رشتے کی۔ اور ویسے بھی دوست سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے اِک انسان

ہو؟" انزلہ کے چہرے پر خوشی کے اَن گنت عکس تھے۔ نتالیہ مسکرا دی۔ لیکن دل میں کتنے ارمان اشکبار ہوگئے۔ دل سے اِک آواز آئی۔

"تمہیں تو تمہارا دوست مل گیا انزلہ! لیکن میں نے تو اپنا سب کچھ کھو دیا۔ تہی داماں تو پہلے بھی تھی، لیکن اس اعتبار کی اِک ٹوٹی پھوٹی کشتی تو تھی۔ اب وہ بھی چھن گئی۔ اب زندگی کی تند و تیز موجوں سے مجھے کون بچائے گا؟"

"نتالیہ!...... میں بہت خوش ہوں۔ یا پھر بہت مطمئن۔ اور ویسے بھی تمہی نے کہا تھا ناں کہ خوشی یا غم ضروری نہیں ہوتا۔ ضروری ہوتا ہے اطمینان، جس کے ساتھ زندگی آسانی سے کٹ جاتی ہے۔" انزلہ مسرور تھی۔

"مجھے اچھا لگا یہ سن کر کہ تم بہت خوش ہو...... عسفان کو تم سے زیادہ نہ کوئی سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی چاہ سکتا ہے۔" نتالیہ نے مسکرانے کی اِک ناکام کوشش کی۔ انزلہ نے اِک پل بھر اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ایک بات پوچھوں نتالیہ! ایمانداری سے جواب دو گی؟"

"پھر کوئی اُوٹ پٹانگ سوال نہ پوچھ بیٹھنا۔" نتالیہ مسکرائی تھی۔

"کیا تمہیں عسفان سے کبھی محبت تھی ہی نہیں؟...... میرا مطلب، تمہارے وہ احساس، وہ ملنا، وہ جذبے، وہ سب کیا تھا؟" اس سے قبل کہ انزلہ اُس کی آنکھوں سے جھلملاتی محبت کی نمی دیکھتی، وہ اُس کے سامنے سے ہٹ گئی اور ٹیبل پر کپ رکھنے لگی۔

"پتہ نہیں۔" اِک فرار کی کوشش کی تھی نتالیہ نے۔

"اس طرح نہیں...... میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے، مجھے فیس کر کے جواب دو۔" انزلہ نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے سامنے بٹھایا تھا۔

اچانک کمرے میں اندھیرا ہوگیا۔ لائٹ چلی گئی تھی۔ اندھیرے کے ساتھ ہی اے سی اور پنکھے کی آواز بند ہوگئی۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ صرف گھڑی کی ٹک ٹک ہی سنائی دی۔

"ایک تو گرمیوں کی یہ لوڈ شیڈنگ...... کسی بھی وقت اندھیرا ہو جاتا ہے۔" نتالیہ یہ کہہ کر اُٹھ گئی۔ اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ مگر اندھیرا بہت دبیز تھا، وہ آنسوؤں کی نمی انزلہ کے ہاتھوں پہ بھی گری۔

"ہاں...... کبھی کبھی یہ اندھیرا بھی بڑا ساتھ دیتا ہے۔" انزلہ کے ذو معنی لہجے کو وہ سمجھ گئی تھی۔ اُس نے موم بتی جلائی۔ انزلہ نے کپ اُٹھائے اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ موم بتی ٹیبل پہ رکھ کے بالکنی کا دروازہ کھول کے باہر آچکی تھی۔ اُس کے آنسو کتنی دیر ریلنگ

پہ گرتے رہے۔ اُس کی نظر عسفان کی کھڑکی پہ چلی گئی۔

پردہ ہٹا ہوا تھا۔ موم بتی کی ملگجی روشنی کمرے میں بکھری تھی۔ خاموشی تھی۔ ویرانی تھی۔ صرف گٹار کے تاروں سے اُبھرتی اِک پُرسوز سی دُھن تھی اور درد بھری اِک آواز۔

ہم کہ رُوٹھی ہوئی رات کو بھی منا لیتے ہیں
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسمِ ہجراں جاناں
مدتوں سے یہ عالم نہ توقع، نہ اُمید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے، جاناں جاناں
اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں
اب کے تجدیدِ وفا.......

ٹوٹے دل کی کرچیاں جابجا بکھری تھیں۔ دونوں روحوں پہ آسمان سے درد اُتر رہا تھا۔ وفاؤں کی موت کا ماتم دونوں اکٹھے منا رہے تھے۔ بظاہر خوش تھے، مگر دلوں میں آگ تھی۔ ایسی آگ کہ جسے بجھانا دونوں ہی کے بس میں نہ تھا۔ دونوں کے دل کی بستیاں جل رہی تھیں اور کسی کو سورۃ ابراہیم یاد نہ تھی.......



''جب سے ہماری منگنی ہوئی ہے، تمہارے اور میرے درمیان اِک عجیب ہی انجانا پن آ گیا ہے۔ حالانکہ ہمیں اب پہلے سے زیادہ فرینک ہونا چاہئے، لیکن پتہ نہیں، تمہارا روّیہ اتنا بدلا بدلا سا کیوں ہے۔'' کسی کاغذ پر تیز رفتاری سے کچھ تحریر کرتی ہوئی نتالیہ احمر سے احسن نے کہا تھا اور اُس کے ہاتھ چلتے چلتے رُک گئے تھے۔

''ایسی کوئی بات نہیں احسن!'' مختصر سا اِک جواب آیا تھا۔

''کوئی بات تو ہے۔ تمہارا یوں کھوئے کھوئے رہنا، صرف اور صرف کام سے منسلک بات کرنا، پہلے کی طرح کوئی بات شیئر نہ کرنا، یہ سب کیا ہے نتالیہ؟....... مجھے تو لگتا ہے کہ تم اس منگنی سے خوش ہی نہیں۔ اُس دن بھی تم اُداس اُداس تھیں۔ تمہارے چہرے پر دُلہنوں والی کوئی رمق نہ تھی۔ اور تمہاری کزن انزلہ کتنی خوش تھی اور کتنی مسرت تھی اُس کے چہرے پر۔'' احسن کی گہری نظر اُس کا مشاہدہ کر چکی تھی۔

اُس نے اپنا پین کاغذ پہ رکھ دیا اور بولی۔

''کہاں ناں احسن! ایسی کوئی بات نہیں۔ اور ویسے بھی انزلہ اور میری عمر میں فرق ہے۔ اس کے لئے منگنی اور شادی جیسی باتیں نٹ کھٹ سے احساسات سے سجی اِک خواب

کی سی باتیں ہیں۔ جبکہ میں ذہنی میچورٹی کی اس حد پر ہوں کہ جہاں یہ سب باتیں میرے لئے صرف احساسِ ذمہ داری ہیں، اور کچھ نہیں۔'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی تھی۔

احسن اُس کے بے تاثر چہرے پر کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

''احساسِ ذمہ داری....... یا پھر احساسِ اسیری؟'' احسن نے طنز سے کہا۔

''تم جو بھی سمجھو احسن! لیکن مجھ سے یہ توقع ہرگز بھی مت رکھنا کہ میں لاابالی عمر کی کسی لڑکی کی طرح تمہارے ساتھ شرما، لجا کے بات کروں گی، یا پھر کھلے بیٹھے خواب جوڑوں گی۔ وہ اعتماد سے اُس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولی تھی....... پتہ نہیں کیوں اس رشتے کے جڑنے کے بعد دونوں کے مابین پہلے والی دوستی، اپنا پن کہیں کھو گیا تھا۔

''میں تم سے توقع نہ رکھوں گا نتالیہ! تو اور کس سے رکھوں گا؟'' احسن کے اس سوال کا جواب دینا اس کے لئے مشکل تھا۔

''اس نئے رشتے سے بہتر تو ہمارے درمیان وہ پرانا رشتہ تھا۔ کم از کم کسی طرح کی توقعات کی کٹھن شرط تو نہ تھی۔'' وہ کھوئی کھوئی آنکھوں سے بولی تھی۔ وہ کرسی سے اُٹھا اور اُس کی کرسی کے عین سامنے ٹیبل پہ بیٹھ گیا۔ اُس کے بہت قریب۔ نتالیہ کو اُلجھن ہوئی۔ اُس کی سبز چیک دار شرٹ کے اوپر لگی ''اوپیوم'' کی مہک اور اُس کی سانسوں کی آواز اُسے ڈسٹرب کرنے لگی۔

''میں تمہیں پا کے بہت خوش ہوں نتالیہ!....... پلیز میرے دل میں یہ احساس مت پیدا کرو کہ میں نے تمہاری زندگی میں آ کر کچھ غلط کیا ہے۔ تمہیں کھو دینے کے احساس سے ہی ڈرتا ہوں میں۔'' احسن کی آنکھیں اُس کے اندر کی محبت سے جھلملا رہی تھیں۔

''مجھے علم ہے کہ تم شادی کو غلامی سمجھتی ہو۔ لیکن یقین کرو، میں تمہیں کسی قسم کی غلامی میں مبتلا نہیں کروں گا۔ تم جو کرنا چاہو گی، جو پسند کرو گی، وہ کر سکو گی۔ تم پر میرے رشتے کا کوئی پہرہ نہیں ہو گا۔ تم آزاد ہو نتالیہ!....... تم آزاد ہو۔''

احسن کی کہی اس بات نے اُسے پھر سے گئے دنوں کے اُن ویران دریچوں پہ جا کھڑا کیا کہ جہاں عسفان بھی اسی طرح اُسے اپنے سامنے کر کے گویا ہوا تھا۔

''میں تمہیں اپنی محبت کے بندھنوں میں قید نہیں کرنا چاہتا نتالیہ! تم آزاد ہو....... تم آزاد ہو۔''

اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ دل درد کے بوجھ سے ٹوٹنے لگا۔ عسفان کی اس بازگشت کے جواب میں دل سے اِک آواز اُٹھی۔ ''کاش! مجھے اپنی محبت کے بندھنوں میں قید کر

لیتے عسفان!........کاش تم مجھے آزاد نہ کرتے۔"

آنسو روانی سے بہنے لگے تھے۔ سامنے عسفان کی جگہ احسن تھا، لیکن تخیل میں وہ عسفان ہی کے ساتھ تھی۔ اس وقت وہ احسن کے گھٹنوں میں اپنا سر رکھے رو رہی تھی اور احسن کے ہاتھ اُس کے بالوں کے اوپر تھے، اُسے چپ کرا رہے تھے۔ اس احساس سے سرشار کہ نتالیہ نے اُس کی محبت کو قبول کرلیا ہے اور اس کا اظہار اُس کی آنکھوں سے گرنے والے یہ بیش بہا موتی ہیں۔ اُسے تو یہ علم ہی نہ تھا کہ نتالیہ اس وقت جسمانی طور پر بے شک اُس کے ہمراہ ہو، لیکن اُس کی روح عسفان کے ساتھ تھی، اُس کے گھٹنوں میں اپنا سر دیئے، اپنی وفاؤں کے موتی لٹاتی ہوئی، اپنی بے بسی پہ روتی ہوئی۔



"عسفان! بیٹا ناشتہ کرلو۔ میں نے فائزہ کے گھر بھی جانا ہے۔" فون پہ گفتگو میں مصروف عسفان سے کوثر بیگم نے کہا اور وہ فون ڈس کنکٹ کرکے ٹیبل پر آیا۔

"عالیان کب کا یونیورسٹی چلا گیا۔ اور ایک تم ہو کہ تمہیں کھانے پینے کی کوئی فکر ہوتی ہی نہیں۔" ٹیبل پر پلیٹ لگاتی ہوئی کوثر بیگم بولیں۔ وہ کھویا کھویا سا ماں کی بات سنتا رہا۔

"کیا ہوا ہے بیٹے! اُداس ہو؟" خاموش بیٹے کی اُداسی سے ممتا کا دل دھڑکا۔

"برٹش قونصلیٹ کو فون کیا۔ پتہ چلا کہ میرا ویزہ تیار ہوگیا ہے، اور شاید اگلے ہفتے کا ٹکٹ بھی لگ جائے۔" وہ اُسی کھوئے کھوئے پن سے بولا۔ کوثر بیگم کے چہرے پر بھی اُداسی کے سائے لہرائے، بیٹے کی جدائی کا سوچ کر۔

"امی!........ میں صحیح کر رہا ہوں ناں؟........ واقعی مجھے جانا چاہئے؟ میرے قدم کیا صحیح فیصلے پر آ ٹھہرے ہیں؟" وہ بولا۔

"میرے بچے! ہماری زندگی میں جو ہوتا ہے، اس میں رب تعالیٰ کی مصلحت ضرور شامل ہوتی ہے۔ کوئی کام، کوئی بات اُس کی مرضی کے بنا نہیں ہوتی۔" اُسے تسلی دیتی ہوئی ماں دل سے خود کمزور پڑ رہی تھی۔ کچھ پل دونوں خاموش رہے۔ کوثر بیگم دوسری کرسی کھینچ کر اُس کے سامنے بیٹھ گئیں۔ اُن کے بیٹھنے کے فوراً ہی بعد عسفان اپنی کرسی سے اُٹھا اور فرش پہ دوزانو بیٹھ گیا، اپنی گردن ماں کے گھٹنوں پہ رکھ دی۔

"یہ میرے ساتھ کیا ہوگیا امی!........ کیوں ہوگیا میرے ساتھ ایسا؟........ کیا گناہ کیا تھا میں نے کسی کا؟........ میں نے تو کبھی کسی کا برا بھی نہ چاہا تھا۔ پھر تقدیر نے کیوں اتنی کڑی سزا دی مجھ کو؟" اُس چھ فٹ کے مضبوط جسم والے بندے کا نازک دل اپنی ماں کی

گود میں آکے رو دیا تھا اور بے چین ماں کا دل اس سے کہیں زیادہ رو دیا تھا۔

"میرے بچے! قسمت میں یہی لکھا تھا۔" وہ اُس کے براؤن گھنے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگیں۔

"نتالیہ ایسی نہیں تھی امی! وہ کیوں ایسی ہوگئی؟ اُس کا وہ اظہار، وہ وعدے، وہ باتیں میں کس طرح بھلاؤں گا امی؟........ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی امی! پتہ نہیں اچانک اُسے کیا ہوگیا۔ اب تو میرے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں امی! اُس کی باتوں کا، اُس کی محبت کا میرے پاس تو کوئی گواہ بھی نہیں۔ وہ کیوں بدل گئی امی! وہ کیوں بدل گئی؟" بھاری مردانہ آواز میں روتے ہوئے اُس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اور پھر اِک یہی گود تو تھی کہ جس کی گرمی پا کر وہ کمزور پڑ جاتا تھا۔ یہیں اُس کی انا، اُس کی جنگ کی موت ہوتی تھی۔

"سب ٹھیک ہوجائے گا میرے لال! انزلہ بھی بہت اچھی لڑکی ہے، تمہیں بے حد خوش رکھے گی۔ بھول جاؤ گے بہت جلد اپنے ہر زخم کو، ہر غم کو۔ انگلینڈ جاؤ گے، وہاں سیٹل ہوگے تو دھیان بہت حد تک بٹ جائے گا بیٹے!" وہ ممتا بھری تسلی دینے لگیں۔

"انزلہ تو بہت اچھی ہے امی! لیکن میں اچھا نہیں۔ میں کہاں تک خود کو اور اُس کو دھوکے میں رکھوں گا؟........ امی! کیا واقعی نتالیہ کسی اور کی ہوجائے گی؟ اُس کی آنکھیں، اُس کی باتیں، اُس کا وجود کسی اور کا ہوجائے گا؟........ اُس پر میرا یا کسی اور کا حق نہیں ہو گا؟" وہ کسی بچے کی مانند اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر سوال کرنے لگا۔ سرخی مائل لکیر آنکھوں کے دونوں کونوں میں پڑ چکی تھی۔ کتنے ہی ٹوٹے بکھرے خوابوں کے عکس بھی تھے۔ اور ان خوابوں کے پار کہیں اب بھی نتالیہ کی موجودگی، اُس کی محبت تھی۔



"نہیں عباس! میں نے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔ کتنے دنوں بعد فون کیا ہے آپ نے۔ اور احسن بھائی کی منگنی بھی اٹینڈ نہیں کی۔" ماہا نے قدرے خفگی سے کہا تھا۔

"سمجھا کرو ناں ماہا! ڈیڈ نے دوبئی بلوایا تھا، کسی کولیگ کے بیٹے کی شادی پر۔ اور پھر تمہارے بھائی کی منگنی جتنی جلدی طے ہوئی، اتنی ہی جلدی ہو بھی گئی، اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے؟" عباس نے صفائی پیش کی تھی۔

"باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔" ماہا مسکرا دی تھی۔

"اچھا یہ بتاؤ، کیسی ہے تمہاری بھابی؟........ ہمیں نہیں ملواؤ گی کیا؟"

"ملواؤں گی........ ضرور ملواؤں گی........ بہت اچھی ہیں وہ۔ بالکل پریوں کے دیس

کی شہزادی جیسی۔ بھائی کی کلاس فیلو بھی تھیں اور اب اُنہی کے ساتھ پریکٹس بھی کرتی ہیں۔" ماہا نے کھلکھلا کے کہا۔

"بھئی اب تو اُن سے ملنے کا اشتیاق اور بڑھ گیا ہے۔" عباس نے کہا۔

"ایسا کریں عباس! آپ آج شام چکر لگائیں۔ میں احسن بھائی کو کہتی ہوں کہ وہ بھابی کو ساتھ لے آئیں۔ بڑا مزہ آئے گا۔" ماہا نے اُسے آفر کی۔

"اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟....... اسی بہانے تم سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" عباس کے اس جملے پر ماہا شرما دی اور فون بند کر دیا۔

اگلے ہی لمحے وہ احسن کا سیل نمبر ملا چکی تھی۔

"لیکن ماہا! نتالیہ سے اس طرح کی باتیں منوانا کم از کم میرے بس سے تو باہر ہے۔ ایسا کرو، تم خود ہی اُس سے بات کرلو۔" ماہا کی فرمائش کے جواب میں احسن نے کہا تھا اور اگلے ہی پل احسن نے اپنا نازک سا سیل فون نتالیہ کو تھما دیا۔

"بھابی! آج آپ پلیز ہمارے گھر آجائیں شام کو۔" ماہا نے کہا۔

"آج؟....... کیوں، آج کوئی ضروری بات ہے کیا؟....... اصل میں آج بہت کام ہے یہاں۔" وہ کوئی بہانہ سوچنے لگ گئی تھی۔

"میں نے کچھ نہیں سننا بھابی! بس آج آپ کو آنا ہی پڑے گا۔ کسی سے ملوانا ہے آپ کو۔" ماہا مسکرا دی تھی۔

"ماہا! پھر کبھی۔ پلیز!" اُس نے التجا کی تھی۔

"کوئی نہیں بھابی! میں اُس مہمان کو انوائٹ کر چکی ہوں۔ اگر آپ نہیں آئیں تو میں نے آپ سے بات نہیں کرنی۔" لاڈ بھری ناراضگی کے اظہار کے بعد ماہا نے فون بند کر دیا اور نتالیہ کچھ کہتی ہی رہ گئی اور مجبوراً ہی شام کو اُسے احسن کے ہمراہ اُس کے گھر آنا پڑا اور احسن بڑا خوش تھا۔ اُس کے مستقبل کا ہم سفر، اُس کی قسمت کا ستارہ اُس کے ہمراہ تھا۔ وہ گاڑی چلاتے ہوئے مستقبل میں رونما ہونے والے ان گنت لمحوں کے بارے میں سوچنے لگا کہ جن لمحوں میں اُسے نتالیہ کا ساتھ نصیب ہونا تھا، اُس کی خوشگوار رفاقت نصیب ہونی تھی۔ بظاہر وہ دونوں ہی خاموش تھے، لیکن احسن دل ہی دل میں بے حد مسرور تھا۔

اسٹیئرنگ وہیل پہ نہایت مشاقی سے اپنے ہاتھ چلاتا، وہ من ہی من میں گنگنا رہا تھا اور ریشمی سڑک پہ دوڑتی اُس کی سلور کرولا کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ گاڑی کے اندر اے سی کی خنک اور اک مخصوص خوشبو عجب سحر پیدا کر رہے تھے۔ سفر نہایت خوش گوار تھا۔ اپارٹمنٹ

ے باہر اُس نے گاڑی روکی۔

"تم اوپر چلو نتالیہ! میں بیس منٹ میں گاڑی پارک کر کے آجاتا ہوں۔" اُس کے ہنے پر وہ دروازہ کھول کے اُتری۔ کئی بار وہ احسن کے گھر آچکی تھی، اس لئے اُسے بخوبی استہ پتہ تھا۔

ابھی وہ چند سیڑھیاں ہی چڑھ پائی تھی کہ اُسے عقب سے کسی نے پکارا۔

"نتالیہ بھابی!"

وہ اس نامانوس آواز پہ حیرانی سے مڑی اور ٹھٹک گئی۔ وہ عباس رضوی تھا۔ عسفان کا وست، جس کے گھر عسفان اور اُس نے بارش کے موسم میں رات بھر کا پڑاؤ کیا تھا اور س کا علم کسی کو نہ تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھر کے سیڑھیاں عبور کرتا اُس تک پہنچا۔

"آپ یہاں نتالیہ بھابی؟....... عسفان کدھر ہے؟ کیسا ہے وہ؟....... کچھ عرصے سے میں دوبئ چلا گیا تھا، اس لئے عسفان سے ملاقات نہیں ہوئی۔" وہ اپنی ہی روانی میں لے گیا تھا۔ وہ ابھی تک خاموش تھی۔

"یہاں میرے متوقع سسرال ہیں۔ اُنہی سے ملنے آیا ہوں۔ مما اور افشاں آپ کو بے د یاد کرتے ہیں۔ ایک ہی ملاقات میں افشاں تو آپ کی دیوانی ہوگئی ہے۔" وہ بولے یا۔ تبھی احسن بھی سیڑھیاں چڑھتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ زردی رنگت اور درد کے کتنے ہی ائے چہرے پہ سجائے ہوئے نتالیہ کھڑی تھی اور مسکراہٹ بکھیرتا عباس رضوی۔

"ارے عباس! تم کدھر ہو بھائی؟" اور اگلے ہی پل وہ احسن سے بغل گیر ہو چکا تھا۔ تالیہ حیران تھی۔

"ان کو جانتے ہیں کیا آپ؟" وہ احسن سے مخاطب ہوا۔

"ارے انہی کو تو جانتے ہیں ہم۔ بھئی یہ نتالیہ ہیں۔ انہی سے تو میری منگنی ہوئی ہے۔ ہ منگنی کہ جس کو آپ نے اٹینڈ ہی نہیں کیا۔"

احسن کے اس دھماکے پر عباس حیران رہ گیا۔ کچھ اس طرح کا تعارف عسفان نے ھی کروایا تھا۔ وہ حیران سا کھڑا نتالیہ کو دیکھتا رہا۔ نتالیہ بھی چپ تھی۔

اور وہ پوری شام چپ ہی رہی۔ عباس اُس کے چہرے پر نجانے کیا تلاش کر رہا ھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، سب کو کچھ بتانا چاہتا تھا، لیکن اُس کی موجودگی میں وہ کہہ ہی نہ ایا۔ ماہا اُسے منگنی کی تصاویر دکھاتی رہی، فنکشن کی کتنی باتیں بتاتی رہی۔ لیکن وہ بنا کسی لچسپی کے سنتا رہا۔ کتنے سوال گردش کر رہے تھے اُس کے ذہن میں۔ عسفان اُس کا

بہت قریبی دوست تھا اور احسن اُس کا سالا۔ اُس کا ذہن بہت سے سوالوں کی گردش میں اُلجھا ہوا تھا۔

اُسی رات گھر آ کے اُس نے عسفان کو فون کیا تھا اور اگلے دن اُس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور عسفان نے اُسے برٹش قونصلیٹ کے باہر ملنے کا وعدہ کیا۔



برٹش قونصلیٹ کے باہر بنے پارک کے بنچ پر بیٹھے ہوئے عباس اُس سے مخاطب تھا۔

''سنا ہے، تمہاری منگنی ہوئی ہے عسفان! کیسی ہیں نتالیہ بھابی؟'' وہ انجان بننے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔

عسفان نے اِک ٹھنڈی آہ بھری۔ کتنی دیر وہ خلاؤں میں دیکھتا رہا۔ ''عباس! میری منگنی نتالیہ سے نہیں، انزلہ سے ہوئی ہے میری کزن ہے وہ۔''

''لیکن یار! تم نے تو نتالیہ کو ملوایا تھا ناں مجھ سے۔ اور میرا خیال ہے کہ تم سے محبت بھی کرتی تھی وہ۔'' ایک اور سوال۔

''پتہ نہیں، محبت کرتی تھی یا مذاق۔ لیکن جو بھی تھا، اُس کی چند دن کی محبت نے میری تمام زندگی تباہ کر ڈالی۔ اب شاید دنیا میں کسی جگہ بھی میں چین سے نہیں رہ پاؤں گا۔'' نارسائی اُس کے پور پور میں بس چکی تھی۔

''ایسا کیا ہوگیا ہے یار!'' عباس یقیناً متجسس تھا۔

''چھوڑو یار! یہ داستان بڑی طویل ہے۔ ویسے بھی، درد اگر حد سے بڑھ جائے تو اپنی وقعت کھو دیتا ہے۔'' عسفان نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

دوست ہوں تمہارا میں عسفی! اپنی پرابلمز مجھ سے تم ڈسکس کر سکتے ہو۔''

''بس پرابلم اتنی سی تھی کہ مجھے اُس سے محبت تھی۔ والہانہ حد تک۔ شاید محبت تو اُسے بھی تھی، لیکن کس حد تک، اس کا مجھے علم نہیں۔ لیکن اُس کا یوں اچانک ہی مکر جانا، ہر کسی کی ناراضگی برداشت کر کے بھی اپنے اُس وکیل دوست سے شادی کرنے کی ضد پر ڈٹے رہنا، کبھی کبھی تو مجھے شک میں مبتلا کئے دیتا ہے کہ اُسے مجھ سے محبت تھی ہی نہیں۔ جھوٹ تھا وہ سب...... چھل تھا...... فریب تھے وہ وعدے...... وہ ملاقاتیں...... وہ باتیں۔ یار عباس! زندگی اس حادثے نے بہت ڈسٹرب کر دی ہے۔ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ دنیا میں کہیں دل نہیں لگتا۔ گھر میں ہوتا ہوں تو لگتا ہے اس کے پاس ہو کر بھی پاس نہ ہونے کا احساس جان لے لے گا۔ اور گھر سے باہر ہوتا ہوں تو اپنی شکست سے خوف کھاتا

ہوں۔ میں بہت ٹوٹ گیا ہوں یار!'' عسفان کی آواز میں روہانسا پن تھا۔ فضا اِک بے بس محبت کی محرومی سے بوجھل ہونے لگی تھی۔ عسفان کا درد چارسُو پھیل رہا تھا۔ دوپہر کا وقت ہونے کے باعث گرمی کا احساس زیادہ تھا۔

''یہ عورت کی ذات بھی بڑی عجیب ہوتی ہے عسفان! چاہتی ہے تو ایسے ٹوٹ کر کہ دنیا بھر کی طاقتوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ اور ٹھکرا دے تو ایسی مضبوطی سے کہ کسی بھی طاقت کو پسپا کر دیتی ہے۔'' عباس کے دل میں نتالیہ کے خلاف غصہ ہی تو بھر گیا تھا۔

''چھوڑ یار! ٹوٹے دل کی کرچیاں بہت دُور تک بکھری ہوئی ہیں۔ کہاں تک ان کو سمیٹو گے؟ بس دعا کرتا ہوں کہ وہ جہاں رہے، جس کے ساتھ رہے، خوش رہے۔ کوئی بھولا بھٹکا آنسو بھی کبھی اُس کی آنکھوں کا راستہ نہ دیکھے۔'' عسفان نے سنبھلنے کی سعی کی تھی۔

''آگے کیا پروگرام ہے تمہارا؟...... کب کر رہے ہو شادی؟ اور کب ہے تمہاری نتالیہ کی شادی؟''

''مجھے تو ابھی کچھ وقت چاہئے اس صدمے سے گزرنے اور نکلنے کے لئے۔ انزلہ کی پڑھائی بھی ابھی باقی ہے۔ اور نتالیہ، سنا ہے جلد ہی کسی اور سے منسلک ہو جائے گی وہ۔ باقی میرا پروگرام پرسوں نکلنے کا ہے۔ شاید ہمیشہ کے لئے...... شاید کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔'' عسفان اُداس، ٹھہرے ٹھہرے پن سے بولا۔ عباس خاموش تھا۔ کیا بتاتا اُسے کہ وہ بھی ان لوگوں میں سے ہے کہ جن کی ہو جانے کے لئے اُس کی محبت نے اُسے تنہا چھوڑ دیا ہے، اُس کے ساتھ بے وفائی کی ہے، اُسے درد دیا ہے۔ کیا بتاتا اُسے کہ دوستی کے رشتے سے پرے عباس کا جو نیا رشتہ اُس سے جڑا ہے، وہ کیا ہے، کس زاویے سے ہے، کس طرف سے ہے۔ کیا بتاتا اس دوست کو کہ وہ اپنا سب کچھ کھو چکا تھا۔ تند طوفان کی تختی جس کے تنکوں کو لے اُڑی تھی۔ اُس کا آشیاں بکھیر چکی تھی۔ اور وہ اس طوفان میں ابھی تک پھنسا ہوا تھا اور جس کی تندی نے اسے بھی بکھیر کے چھوڑ دیا تھا۔ کیا کہتا وہ اس شخص کو۔



مرے ہم سفر!
میری آنکھ گرد سے اٹ گئی
میرے خواب ریت میں کھو گئے
میرے ہاتھ برف سے ہو گئے
وہ ہوا چلی

کسی شام ایسی ہوا چلی
کہ جو برگ تھے سرِ شاخِ جاں وہ گرا دیئے
وہ جو حرف درج تھے ریت پر، وہ اُڑا دیئے
وہ جو راستوں کا یقین تھے
وہ جو منزلوں کے امین تھے
وہ نشانِ پا بھی مٹا دیئے!

سبھی لوگ عسفان کے ہمراہ ایئر پورٹ جانے کو تیار تھے، سوائے نتالیہ کے۔ اور انز
اُسے کتنی دیر سے سمجھائے جا رہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں جانا چاہئے۔ کم از کم اس وقت کہ جب عسفان اتنی دُور جا رہے ہیں، تمہارا اُن کو الوداع کہنا بہت ضروری ہے۔''

انزلہ کی بات پر اُس کے دل میں اِک ٹیس سی اُٹھی تھی۔ وہ تو دُور ہو کے بھی اُس کے دل کے بہت قریب تھا۔ اُس کے دُور جانے، نہ جانے سے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔

''نہیں انزلہ!...... میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ بستر پر نیم دراز تھی۔

''تمہارا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ تم نہیں، تمہارے اندر کا گلٹ بول رہا ہے۔ تم ا بندے کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتیں۔ ڈرتی ہو تم ان آنکھوں کی سچائی سے، اُس دل شدتوں سے۔'' انزلہ چلائی تھی۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ بس میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' اُس نے آنکھیں چرائی تھیں۔

''تمہارے اور اُن کے درمیان اس ٹوٹے پھوٹے رشتے کے علاوہ اِک اور بھی رشتہ ہے۔ تم اُس کی خالہ زاد بھی تو لگتی ہو۔ اسی ناتے سے اُس سے مل لو۔''

''پلیز انزلہ! میرا کسی کے ساتھ کیا رشتہ ہے، کیا ناتا ہے، مجھے مت بتاؤ۔ میں اِک بار کہہ دیا، کہ مجھے نہیں جانا تو مجھے واقعی نہیں جانا۔'' وہ قدرے بلند آواز میں چیخی تھی۔

''ٹھیک ہے...... مت جاؤ۔ تمہیں اپنی من مانی کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ تمہارے دل سے تمام رشتوں ناتوں کی وقعت ختم ہو گئی ہے۔ لیکن ایک بات کا تو مجھے ہے کہ آج تمہارے وہاں جانے کی وجہ کوئی اور نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ تم عسفان کو جا ہوئے دیکھ نہیں پاؤ گی۔ کیونکہ اب بھی تمہارے دل کے کسی کونے میں اِک مرجھائی، کملا کلی زندہ ہے۔ اور وہ کلی عسفان کی محبت کی کلی ہے۔'' انزلہ غصے میں یہ کہہ کے کمرے چلی گئی، کمرے کا دروازہ زور سے بند کر کے۔ اور اُس کے جانے کے بعد وہ بلک بلک

چاہتی تھی۔ کسی کو آواز دینا، کسی کو بلانا چاہتی تھی، عسفان کے قدموں سے لپٹ کے رونا چاہتی تھی، اُس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لینا چاہتی تھی، مگر وہ مجبور تھی۔

اور پھر سب کے گھر سے چلنے جانے کے بعد وہ کمرے کی کھڑکی تک آئی اور فروسٹڈ کی کھڑکی کے اس پار اُس نے عسفان کو دیکھا تھا۔ پنک ٹی شرٹ اور براؤن پینٹ میں، تشنہ آنکھوں سے بار بار مُڑ کے دیکھ رہا تھا۔ ایسے کہ جیسے وہ پھر کبھی بھی اس جگہ کو، لوگوں کو نہیں دیکھ پائے گا۔ پھر کبھی لوٹ کر واپس نہیں آئے گا۔

وہ جا رہا تھا...... وہ اُسے پکارنا چاہتی تھی۔ آنسوؤں سے آنکھیں دُھندلائی جا رہی تھیں۔ عسفان نے اپنا ہینڈ بیگ کندھے پہ لٹکایا اور گاڑی کا دروازہ کھولا۔

''عسفان!'' نتالیہ کے گلے سے اِک رندھی ہوئی آواز نکلی، لیکن وہ آواز فروسٹڈ گلاس کھڑکی سے ٹکرا کر واپس آ چکی تھی۔ لیکن عسفان نے مڑ کر دیکھا تھا، جیسے کہ اُس نے کی دبی آہ، رندھی ہوئی کراہ سن لی ہو۔ عسفان کی نگاہ پل بھر کے لئے اسی کھڑکی پر ۔ وہ ڈر کے پردے کے پیچھے ہو گئی۔ پردہ ہلنے لگا اور عسفان نے اسے اپنا وہم سمجھ کر دیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا اور ایک مضبوط حصاروں والی چار دیواری میں مجبور گونگی محبت تنہا رہ گئی تھی۔

بورڈنگ وغیرہ کروا لینے کے بعد اُس نے مڑ کر شیشے کے اُس پار کھڑے اپنوں کے ں کو دیکھا۔ ایک ایک چہرے پہ پھیلے دُکھ کو الگ الگ پڑھا۔ اس گوہر یکتا کے خدوخال اش کیا، لیکن وہ واقعی نہ تھی۔ کہیں نہیں۔

اور جیسے ہی جہاز کی رفتار تیز ہوئی اور وہ زمین چھوڑنے لگا تو عسفان کا دل کیا کہ وہ ئے۔ زور زور سے روئے۔ وہ وطن چھوڑ رہا تھا۔ اپنے ماضی سے تمام رشتے توڑ کر اِک زمین پر قدم رکھ رہا تھا۔ لیکن نتالیہ؟...... اُس کے حلق میں اِک گولا سا اٹکا تھا۔ وہ ہی نہ پایا کہ یہ سب کیا ہو گیا تھا اور کیسے ہو گیا تھا؟ اس کی شروعات کہاں سے ہوئی اور ت نے اُس کے ساتھ یہ کیسا کھیل کھیلا تھا۔

جہاز کی کھڑکی سے سمندر کا نظارہ کرتے ہوئے اُسے وہ ساحل یاد آیا کہ جب اُس نے ل پر نتالیہ کے ساتھ بیٹھے بیٹھے اِک ریت کا گھروندا بنایا تھا اور وہ گھروندا زمین بوس ہو تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ انسان کی زندگی بھی ٹھیک اسی طرح ہے۔ وہ ریت کے گھر بناتا اور اچانک ہی وہ گھروندے زمیں بوس ہو جاتے ہیں۔ وہ اس کے لئے کس کو دوشی ائے۔ اپنے ہاتھوں کو یا قسمت کو؟ اور عسفان نے کہا تھا۔ ''اگر انسان کے ہاتھ ریت

محل بنانے میں ماہر ہوں تو؟"

اس پر ثنالیہ بولی تھی۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں، آپ کے ہاتھ اتنے ماہر ہیں؟"

اُس کے ہاتھ........ثنالیہ........اُس کا وطن!

جہاز دُور جا رہا تھا........دُور، بہت دُور!



اور پھر اسی شام اُسے کوثر خالہ نے فون کر کے اپنے گھر بلایا تھا۔ وہ پہلے ہی بہت منتشر سی تھی، بہت ٹوٹی بکھری سی تھی۔ اوپر سے اس گھر جانا کہ جہاں عسفان کی موجودگی ہمیشہ ہمیشہ خوشیوں کا باعث رہی تھی۔ اُس کے بغیر کتنا تنہا، کتنا اُداس ہوگا وہ گھر........وہ در و بام کہ جو عسفان کے لطیفوں سے مسکراتے تھے۔ جو اُس کے گیتوں کے سُروں سے جھوم اُٹھتے تھے، وہی در و بام کیسے ہوں گے۔

وہ دروازہ پھلانگ کر اندر آئی تو موت جیسی خاموشی اُس کی منتظر تھی۔ گھر قبرستان کی طرح ویران تھا، چپ تھا۔ کوثر خالہ اُسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح مسکرا دی تھیں۔ لیکن اُن کی مسکراہٹ بھی پھیکی سی تھی۔ اپنے من پسند اور لاڈلے بیٹے کی جدائی سے سوگوار مسکراہٹ۔ اُن کے اندر کے درد کی ترجمان مسکراہٹ۔

"بیٹا! چائے پیو گی؟" وہ دھیمے لہجے میں بولی تھیں۔ اُس نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"تمہیں یہاں بلانے کی اور کوئی وجہ نہ تھی بیٹا! بس عسفان نے تمہیں کچھ چیزیں دینے کو کہا تھا۔ اگر میں اُنہیں تمہارے پاس لے آتی تو شاید تمہاری ممانی کو برا لگتا، اس لئے تمہیں بلا لیا۔ جاؤ، عسفان کے کمرے سے اُٹھا لو۔" کوثر خالہ کے کہنے کے بعد وہ اُٹھی اور عسفان کے کمرے میں آئی۔

وہ مانوس سا کمرہ اب بھی اُس کی مہک سے بوجھل بوجھل سا تھا۔ کمرے کی فضا اب بھی اُس کی موجودگی کی گواہ تھی۔ وہ کمرہ، جو اُس کی محبت، اُس کے خوابوں کا امین تھا، جس کے بستر کی گرمی اُسے ماں کی طرح کی محبت کا احساس دلاتی تھی، جس کی کھڑکیاں دروازے اُس کے رازدار تھے۔ کمرے کی ایک ایک چیز نے عسفان کے گیت کے بولوں کو اپنے اندر رچا بسا لیا تھا۔ ثنالیہ کو ہر چیز چبھنے لگی تھی۔

اچانک اُس کی نظر کھڑکی پر گئی، جہاں سفید خالی پنجرہ لٹکا ہوا تھا۔ اس میں رنڑ طوطا تھا۔ اسی پنجرے کو درمیان میں رکھ کر اُس نے عسفان سے اپنی محبت کا اقرار کیا تھا، اُسے اپنا لینے کے خواب دیکھے تھے۔ اُس کی آنکھیں پل میں نم ہو گئیں۔

نیچے سبز رنگ کے فلور کشن پہ اُس کا گٹار آڑھا ترچھا سا پڑا تھا اور نیچے کارپٹ پر ٹل کا ایش ٹرے کہ جس میں کتنے سارے جلے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے اور راکھ پڑی ۔ اچانک اُس نے گٹار کو اُٹھایا اور اس کاغذ کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کی۔ اِک تار ، اِک مانوس سی آواز اُٹھی۔ یہ وہی گٹار تھا کہ جس پہ "مجھے تم سے محبت ہے" کے بول ا کرتے تھے۔ سفید کاغذ پہ اسی حاصل جاں کے ہاتھوں سے لکھی اِک ادھوری اور اُداس ریر تھی۔

"ثنالیہ!

پتہ نہیں کیوں بے اختیار ہی میں نے تمہارے نام کے ساتھ لفظ "میری" لکھ دیا تھا اور اسے خود ہی کاٹ دیا۔ میں بہت پہلے سے یہ سمجھتا آیا تھا کہ تم میری ہو، صرف میری۔ اور تمہارے نام کے آگے میں........میری........لگا سکتا ہوں۔

میں جا رہا ہوں........تمہاری دنیا سے بہت دُور۔ اب میری موجودگی تمہارے لئے باعث تکلیف نہیں ہوگی۔ اب میرا چہرہ دیکھ کر سارے لوگ تم سے ناراض نہیں ہوں گے۔ پتہ نہیں، تم مجھ سے ملنے آؤ گی بھی یا نہیں۔ پتہ نہیں، جانے سے پہلے میں تمہیں دیکھ بھی پاؤں گا کہ نہیں۔

تمہارے پاس تو میرا بہت سا ساماں ہے، ہزاروں خواب، ان گنت خواہشیں، کتنے سارے ارمان، کتنی ساری جاگی ہوئی چاندنی راتیں۔ لیکن میرے پاس ایسا کچھ نہیں تھا۔ اور جو کچھ تھا، وہ تمہیں دے کے جا رہا ہوں۔

میرا یہ گٹار........کہ جو تم نے مجھے تحفے میں دیا تھا۔ تمہارے بغیر میرے سارے سُر ادھورے ہیں۔ میں اس گٹار کے تاروں پہ بکھرے گیتوں اور محبتوں کا جواب نہیں دے پاؤں گا۔ اسے اپنے ساتھ لیتی جانا۔ اور وہ کھڑکی پہ لٹکا ہوا لاوارث پنجرہ۔ تمہارے رنڑ طوطے کو میں نے آزاد کر دیا۔ کیونکہ اُس میں تمہاری جان تھی اور تمہاری جان کو قید میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا ناں کہ انسان جس کو حقیقت سمجھتا ہے، اس کے لئے مرنا اور جینا ہی تو زندگی ہوتی ہے۔ اور میری حقیقت صرف تم ہو ثنالیہ!

میں اپنے نام کے آگے "تمہارا" لکھ سکتا ہوں۔ کیونکہ میں تمہارا ہوں۔

تمہارا........

عسفان........"

خط کی تحریر دُھندلا رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں اندھیرے کی زد میں تھیں۔ وہ کیا کر بیٹھی تھی۔ کسی کو خوشی دینے کے بدلے میں کسی کو کتنا دُکھ پہنچا چکی تھی۔ اُس نے جس دل کو توڑا تھا، وہ دل کتنا اچھا تھا۔ اُس نے جس شخص کو چھوڑا تھا، وہ شخص کتنا سچا تھا...... وہ زمین پر دوزانو بیٹھ گئی۔ گٹار کو اپنی بانہوں میں بھر کر روئے جا رہی تھی۔ جیسے کہ وہ گٹار عسفان میں تبدیل ہو جائے گا۔

پھر اُس نے ایش ٹرے سے سگریٹ کے ٹکڑے اُٹھائے اور ان سے عسفان کے لمس کو محسوس کرنے لگی۔ وہ ٹوٹ رہی تھی، بکھر رہی تھی۔

وہ طنابِ دل جو اُکھڑ گئی
وہ خیالِ جاں جو اُجڑ گئے
وہ سفیر تھے، اسی داستانِ حیات کے
جو ورق ورق تھی بھری ہوئی
مرے شوق سے، تیرے رُوپ سے
کہیں چھاؤں سے، کہیں دُھوپ سے
میرے ہمسفر! تُو مرے سفر کا شریک ہے
میں تیرے سفر کا شریک ہوں
یہ جو درمیان سے نکل گیا
اسی فاصلے کے شمار میں
اسی بے یقین سے غبار میں
اسی رہگذر کے حصار میں
تیرا راستہ کوئی اور ہے
میرا راستہ کوئی اور ہے



"اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے احسن! معاملہ اب بھی بگڑا نہیں ہے۔ اور پھر اُس دن تمہارا نکاح نہیں ہوا تھا کہ تمہیں کوئی فیصلہ لینے میں اُلجھن ہو۔" عباس، احسن کو حقیقت بتا چکا تھا۔ احسن خاموش تھا، جبکہ اُس کی والدہ اور ماہا حیران تھیں۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا عباس! ثنالیہ کو میں سالوں سے جانتا ہوں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو مجھے ذرا سی خبر تو ہوتی۔" احسن بولا۔

"یار میرے! عورت بڑی گھنی چیز ہوتی ہے۔ اس طرح کی باتیں وہ خود بھی چھپا کے رکھتی ہے۔ اور اگر تمہیں میرا یقین نہیں تو امی اور افشاں سے پوچھ لینا کہ وہ اس دن عسفان کے ہمراہ ہمارے گھر آئی تھی، اُس کی منگیتر کے حوالے سے۔ اور ان دونوں نے تمام رات ہمارے گھر گزاری تھی۔ اگر اُس کا عسفان سے کوئی رشتہ نہ ہوتا تو کیا وہ اس طرح سے اُس کے ساتھ گھومتی پھرتی؟ بارشوں میں بھیگتی؟ ...... اور پھر جو لڑکی اپنے کزن کو دھوکا دے سکتی ہے تو کل کو کیا تمہیں نہیں دے سکتی؟" عباس نے اُسے سمجھایا تھا۔

"مجھے بھی اُس کی ممانی زہرہ بیگم نے بتایا تھا کہ اُس کی ماں نے بھی دوسری شادی کر لی ہے اور اُسے اُن کے گھر چھوڑ دیا تھا۔ اگر ماں اس طرح کا قدم اُٹھا سکتی ہے تو کیا بیٹی نہیں اُٹھا سکتی؟" احسن کی والدہ بولی تھیں۔

"امی! اتنی جلدی کوئی بھی فیصلہ لینا کہاں کی سمجھ داری ہے؟ میں پہلے خود ثنالیہ سے بات کروں گا، پوچھوں گا اُس سے، پھر ہی طے کروں گا خود۔" وہ اٹل لہجے میں بولا۔ کچھ کچھ یقین تو اُسے بھی آ چکا تھا عباس کی باتوں کا۔ منگنی کے بعد ثنالیہ کا گریز کرنا، خاموش رہنا، اُس سے دُور بھاگنا، یہ باتیں گواہ تھیں کہ وہ اس منگنی سے خوش نہیں۔ اس پر کوئی رتی طاری نہیں ہوئی، کوئی خوشگوار احساس حاوی نہیں۔

"احسن! میرے خیال میں تمہیں جلد از جلد کوئی فیصلہ کر لینا چاہئے۔ ورنہ کل کو خود ہی پچھتاؤ گے۔ زندگی اتنی بھی مختصر نہیں ہوتی۔ اور پھر اس طرح کی باتوں کو کتنا نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟" عباس نے کہا۔

"میں تو کہتی ہوں، میں آج ہی فون کر کے رشتے سے منع کئے دیتی ہوں۔" اُس کی والدہ کچھ زیادہ ہی مشتعل تھیں۔

"پلیز امی!...... مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیں۔" احسن نے سختی سے کہا۔

"سوچ لو، اچھی طرح سوچ لو۔ لیکن یاد رکھو احسن! اگر تم نے اُس لڑکی سے شادی کی تو میری فیملی اور ماہا بھی اس شادی میں شرکت نہیں کرے گی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماہا اور میرا رشتہ بھی خطرے میں پڑ جائے" عباس اُسے دھمکی آمیز لہجے میں کہتا ہوا چلا گیا اور اُس کی کہی اتنی شدید بات پر سبھی حیران و ششدر رہ گئے۔ ماہا تو سسک اُٹھی۔

"پلیز احسن بھائی! آپ عباس کو روکیں۔ اُس سے کہیں کہ آپ اُس لڑکی سے شادی نہیں کریں گے۔ پلیز! بھائی! کچھ تو خیال کریں۔" وہ رو رہی تھی۔ احسن خاموش تھا۔ ماہا اپنی والدہ کے گلے سے لگ کے رو رہی تھی۔

''احسن! میں نے طے کرلیا ہے، وہ لڑکی اس گھر کی بہو کسی قیمت پر نہیں بنے گی۔ اور یہ میرا فیصلہ ہے۔'' ماہا کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے والدہ نے فیصلے کا یہ سنگین نقارہ بجایا تھا اور وہ دونوں لاؤنج سے چلی گئی تھیں۔

اور احسن...... فیصلہ کن گھڑیوں سے گزر رہا تھا۔ تو کیا واقعی نتالیہ کسی اور سے محبت کرتی تھی؟...... کسی اور کی منگیتر تھی؟...... اُس کی شامیں، صبحیں کسی اور کے ساتھ گزرتی تھیں؟...... تو کیا واقعی وہ جبراً اُس کے ساتھ منسلک کردی گئی تھی؟...... اُس کے ساتھ رشتے میں بندھنے کی اُسے کوئی خواہش نہ تھی؟ کوئی منشا نہ تھی؟...... اُس کی سوچ سے گزرنے لگے نتالیہ کے وہ انداز کہ جو منگنی کے بعد اُس نے اپنائے تھے۔ اُس کے کسی انداز، کسی بات سے یہ نہ لگتا تھا کہ وہ خوش ہے۔ اُس کے لہجے کی وہ نفرت، وہ گریز، وہ اجنبی پن...... احسن کچھ فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔



''مسز وجاہت کا فون آیا تھا۔ انور محمود کیس کی گواہی دینے کے سلسلے میں۔ میں نے اُسے کہا ہے کہ وہ کل تم سے آکر مل لے۔ اُس کے پاس کوئی ثبوت وغیرہ بھی ہے شاید۔ وہ دیکھ کے فائل میں انٹر کرلینا۔'' وہ احسن سے مخاطب تھی اور احسن اُس کے سامنے بیٹھا، اُس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔ مسلسل رونے اور جاگنے کی وجہ سے اُس کی آنکھیں سرخ تھیں اور حلقے بنے ہوئے تھے۔ وہ پہلے کی نسبت کافی دُبلی ہوگئی تھی اور رنگت بھی کملا گئی تھی۔

''تم کچھ کمزور لگ رہی ہو نتالیہ! صحت تو ٹھیک ہے؟'' وہ اُسے دیکھتے ہوئے بولنے لگا۔

''ہاں...... ٹھیک ہوں میں۔'' اُس نے کچھ خاص نوٹس نہ لیا تھا۔

''تمہارا وہ جو کزن تھا، کیا نام تھا اُس کا، ہاں...... عسفان...... کہاں ہے وہ آج کل؟'' احسن کے منہ سے نکلے اس نام پر وہ اُداس ہی تو ہوگئی تھی۔ کاغذوں کو دیکھتے دیکھتے وہ پل بھر کے لئے کھوگئی تھی۔ آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر منجمد ہوگئی تھیں۔

''نتالیہ!...... تم سے پوچھا ہے کچھ۔'' احسن نے ہاتھ لہرا کے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔

''ہاں، سن رہی ہوں میں۔'' وہ چونکی تھی۔

''تو بتاؤ ناں، کہاں ہوتا ہے وہ؟'' احسن اُس کے جواب کا منتظر تھا۔

''وہ پچھلے ہفتے لندن شفٹ ہوگیا۔'' مختصر سا اِک جواب آیا تھا۔

''کیوں......؟'' اِک اور سوال۔

''پتہ نہیں کیوں۔'' وہ صاف مکر گئی تھی۔

''تم سے اِک بات پوچھنا چاہتا ہوں، صاف صاف۔ گھما پھرا کے بات کرنے کی نہ مجھے عادت ہے اور نہ ہی ضرورت۔'' احسن نے صاف گوئی سے کہا۔ وہ متوجہ تھی۔

''کیا مجھ سے تمہاری منگنی جبراً ہوئی ہے؟...... کیا تمہیں عسفان سے محبت تھی؟...... کیا تم عسفان کی منگیتر تھیں؟'' سوالوں کے چند زوردار نشتر اُس کی سمت آئے تھے۔ نتالیہ کے دل کی دھڑکنیں تیزی سے دھڑکنے لگ گئی تھیں۔ وہ خاموش تھی۔

''بولو ناں نتالیہ! جواب دو۔ پلیز! بتاؤ مجھے، کیا تمہیں عسفان سے محبت تھی؟...... کیا تم اُس سے منسوب تھیں؟'' اُس کے لہجے میں اب سختی در آئی تھی۔

''کیوں پوچھ رہے ہو تم یہ سب؟...... کیا کروگے یہ سب جان کر؟'' وہ بے تاثر چہرہ لئے ہوئے بولی تھی۔

''کیونکہ میرے دل میں جو شک کی کونپل اُگی ہوئی ہے ناں، میں اُسے جڑ سے اکھاڑنا چاہتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''احسن! جن رشتوں کی بنیاد شک پہ ٹکی ہو، وہ کہاں تک چل سکتے ہیں بھلا؟''

''مجھے سچ سچ بتاؤ کہ عسفان سے تمہارا کیا رشتہ تھا؟ کیوں تم اُس کے ساتھ گھومتی پھرتی تھیں؟ شامیں اور راتیں گزارتی تھیں؟'' احسن کے اندر سے اِک کم ظرف، شکی مرد بول اُٹھا۔

''شٹ اپ احسن!...... تمہیں شرم نہیں آتی اس طرح کی بات کرتے ہوئے؟'' وہ چیخی تھی۔

''یہی سچ ہے نتالیہ احمر! کہ تم عسفان سے محبت کرتی تھیں۔ مجھ سے رشتے میں بندھنا صرف تمہاری مجبوری تھی اور جس طرح تم نے اُسے دھوکا دیا ہے، کل مجھے بھی......''

''بس احسن! بس......'' وہ ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکنے لگی۔ ''ہاں...... کرتی تھی میں عسفان سے محبت۔ بلکہ کرتی ہوں، دل و جان سے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارے لئے اُس کو ٹھکرایا ہے۔ غلط تھی میں کہ دوستی بہت سی مشکلوں کا حل ہوتی ہے۔ مشکلوں کا حل صرف اور صرف سچائی ہوتی ہے احسن مشکور! اور نتالیہ احمر کی سچائی یہ ہے کہ اسے عسفان سے محبت ہے۔''

وہ اشتعال انگیز لہجے میں بولی تھی۔ وہ غصے بھری سرخ آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

اُس کا یہ روپ احسن کے لئے اجنبی تھا۔

''تمہارے اور میرے رشتے کا کوئی مستقبل نہیں ہے ثنالیہ!'' وہ بولا۔

''نہیں چاہئے مجھے ایسا رشتہ احسن مشکور!...... نہیں ضرورت مجھے ایسے مستقبل کی کہ جس میں اعتبار نہ ہو، سچائی نہ ہو۔'' وہ پھٹ پڑی تھی۔ عرصے سے دل میں جمع درد بول پڑا تھا۔ رسوائی اور محرومی چلا اُٹھی تھی۔

''گڈ بائے ثنالیہ احمر!'' یہ کہہ کے احسن اُس کے کیبن کا دروازہ پھلانگ کر چلا گیا اور وہ نڈھال سی کرسی پہ ڈھے گئی۔ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے دیر تک روتی رہی۔ اپنے دل پہ جمے غم کے غبار کو دھوتی رہی۔

اور پھر گھر میں اِک ہنگامہ ہی تو مچ گیا تھا یہ سن کر کہ احسن مشکور نے ثنالیہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے اور یہ انکار احسن مشکور کی والدہ نے ممانی سے فون پہ کیا تھا۔ بس، پھر کیا تھا۔ اُس کی بے قصور کمزور ذات تھی اور ہر طرف سے منہ منہ کی باتیں تھیں۔ ان لوگوں کا لگایا ہوا الزام کہ ان کو ثنالیہ کے کردار پر شک ہے، ممانی زہرہ کے ہاتھ کیا آیا، وہ تو تل ہی گئیں اُسے طعنے دینے پر۔

''ارے میں تو پہلے ہی کہتی تھی، ارسل کے پاپا! کہ یہ لڑکی کوئی نہ کوئی گل کھلا کر ہی رہے گی۔ اور پھر اسے تو سبھی نے سر چڑھا رکھا تھا۔ من چاہی چیز کھاتی، من چاہا پہنتی، جہاں جانا ہوتا جاتی۔ اور مسز شکور تو کہہ رہی تھیں کہ اس نے اُن کے داماد کے گھر رات بھر قیام کیا تھا، عسفان کے ساتھ۔'' وہ با آواز بلند بولے گئیں۔ پہلی بار ہی تو اُنہیں موقع میسر آیا تھا، عمر بھر اُس کا بوجھ اُٹھانے کا بدلہ لینے کے لئے۔

''مما! پلیز...... چھوٹی سی بات کو غلط زاویے سے دیکھا ہے ان لوگوں نے بھی اور آپ نے بھی۔ اُس رات ثنالیہ اور عسفان بارش میں پھنس گئے تھے اور مجھے اس بات کا علم تھا۔'' انزلہ نے عرصہ پہلے چھپائی ہوئی بات بتائی تھی۔

''تم چپ رہو انزلہ بی بی! تمہارے اور تمہارے بابا کے بے جا لاڈ اور حمایت نے اُس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ اور تمہیں تو اُس کی حمایت کرنی ہی نہیں چاہئے کہ جس کے ساتھ اُس نے عشق کا پیچا لڑایا، وہ کوئی اور نہیں، تمہارا منگیتر ہے۔ عسفان تو اس طرح کا لڑکا ہے ہی نہیں۔ پَر تو اس چڑیا نے نکالے ہوں گے۔ تبھی تو وہ بے چارہ بچہ......'' ممانی ہائے ہائے ہی کرتی رہ گئیں۔ اندر کمرے میں بیٹھی انزلہ کے دل کی رگیں پھٹنے لگ گئی تھیں۔ احسن مشکور سے رشتہ ٹوٹنے کا اتنا افسوس نہ تھا جتنا کہ اپنی رُسوائی کا۔

تہی داماں تو وہ پہلے ہی تھی، لیکن تہمتوں کے طوفان ناقابلِ برداشت تھے...... تنہا تو پہلے ہی تھی، لیکن تنہا وجود کے تقدس کی پامالی وہ ٹوٹ رہی تھی۔

''میں نے اس کی پرورش میں، اس کی تربیت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ ہمیشہ اسے اولاد سے بڑھ کر چاہا، بہتر سے بہتر زندگی دی، تعلیم دی۔ لیکن پتہ نہیں کیا کمی رہ گئی ی پرورش میں۔'' مبشر حسین کا دل اور لہجہ نم اور اُداس تھے۔

''پاپا پلیز!...... کم از کم آپ تو ثنالیہ کو اس طرح مس انڈرسٹینڈ نہ کریں۔ وہ ایسی ی نہیں ہے۔'' انزلہ کے دل میں پھر اِک ٹیس اُٹھی تھی۔ وہی تو تھی اُس کی مزاج آشنا، ا کی اپنی۔

''کیسے نہ کروں میں مس انڈرسٹینڈ انزلہ! پہلے اس نے خود ہی عسفان سے شادی نے سے انکار کیا، سب کی ناراضگی کے باوجود اس نے اپنی ضد پوری کی۔ اور جب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو گیا تو پھر احسن سے بھی...... وہ لڑکی آخر کیا چاہتی ہے؟'' ماموں کی باتیں نشتر ہی کی طرح اُس کی روح میں چبھ کر اُسے لہولہان کر رہی تھیں۔ وں کا سہارا اُس کے لئے سب کچھ تھا۔ باپ کی سی شفقت اور حفاظت دی تھی انہوں نے۔ ہر موڑ پر آسرا بنے تھے وہ زندگی کا...... ہر منزل آسان کی تھی اُنہوں نے۔

اب اُنہی کی زبان سے یہ روح فرسا باتیں...... اُنہی کے لہجے میں اتنی نفرت، اتنی ارت، وہ خود کو اچانک ہی بہت چھوٹا محسوس کر رہی تھی۔ آنسوؤں کی لڑیاں تھمتی نہ تھیں۔ ڈوبنے کو تھا۔ سانسوں میں اشتعال سا تھا۔

''مبشر حسین! میں تو کہتی ہوں، بلاؤ اپنی بہن فائزہ بیگم کو اور پکڑاؤ اُسے اپنی بیٹی۔ خود شادی کر کے گھر آباد کر لیا، مصیبت ڈال گئی ہمارے گلے میں۔ مٹی پلید کر گئی ہماری۔ کل و یہ لڑکی بھاگ واگ گئی تو رُسوائی تو ہماری ہو گی ناں۔'' زہرہ بیگم بولے گئیں۔

''چپ ہو جاؤ تم...... بند کرو اپنی بک بک...... بہت سے بہتر حل بھی ہوتے ہیں ائل کے۔ انسان مشکلوں سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔'' مبشر حسین کا تحمل قابلِ دید تھا۔

''مما!...... پاپا!...... ثنالیہ اس گھر سے کہیں نہیں جائے گی۔ اور اگر اسے کچھ بھی کہا یا تو آپ لوگ ثنالیہ کے ساتھ ساتھ اپنی بیٹی بھی کھو دیں گے۔'' فیصلہ کن انداز میں کہتی ئی انزلہ، ٹیبل سے اُٹھ گئی تھی۔ اُس جیسی مضبوط ڈھال ثنالیہ کے لئے کوئی بھی نہ تھی۔ وہ ن بھی تھی، دوست بھی، غم خوار بھی اور شاید ہمدرد بھی۔ جب سے وہ ذی ہوش ہوئی تھی، تا اُس نے دیکھی بھی کہاں تھی۔ اُس کے قریب ممتا نام کی کوئی چیز تھی تو وہ کوثر خالہ کی محبت

تھی، یا پھر انزلہ کی چاہت۔ حد سے زیادہ اعتبار کرنے والے ماموں کے دل میں بھی بے اعتباری سر اُٹھا چکی تھی۔ ایسے میں اُس کا کون تھا؟ خون کا رشتہ تو اُس کا سب ہی سے تھا۔ لیکن ان رشتوں کی بنیاد جو تھی، اُس کی آمد بڑی دیر سے ہوئی۔

فائزہ بیگم اپنے سسرالی عزیز کی شادی کے سلسلے میں شہر سے باہر تھیں اور جب واپس آئیں تو یہ خبر اُس کی منتظر تھی جسے سننے کے بعد وہ رکی نہیں، نتالیہ سے ملنے بھائی کے گھر آ گئیں۔



وہ بے دلی سے کسی پرانے میگزین کے حروف کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ویران ویران آنکھیں، خواہشوں کے کھنڈروں کو چھان رہی تھیں۔ حروف و ہندسوں کی جگہ آنکھوں کے آگے بے رنگ دائرے رقص کر رہے تھے۔ لیمپ کی لائٹ کے علاوہ کمرہ اندھیرا تھا۔ باہر شاید آندھی کی زوردار ہوا چل رہی تھی۔ کھڑکی سے ہوا کا ٹکراؤ ہوتا تو شائیں شائیں کی آواز پیدا ہوتی...... باتھ روم کے ایگزاسٹ فین سے ہوا اندر آتی اور پردے کو ہلائے جا رہی تھی۔ اچانک ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور دھول اُڑاتی ہوا کے ساتھ فائزہ بیگم کی کمرے میں آمد ہوئی۔

اُس نے ماں کو دیکھا۔ بہت عرصے بعد تنہائی میں ایک بار تو دل کیا کہ اُن سے جا کے لپٹ جائے، ممتا کے گلے لگ کے زندگی کی ہر محرومی کا ہر آنسو بہا دے۔ اپنے آپ کو اس دامن میں چھپا لے کہ جس کی کوکھ میں اُس نے تخلیق کے مراحل طے کئے تھے کہ جس کی سانسوں کے ذریعے اُس نے دس ماہ سانسیں لیں، جس کے خون کے اندر اپنا وجود بنایا۔ مگر اُس کی آنکھوں میں چھپا کرب پل بھر میں ٹھنڈا پڑ گیا۔ پل بھر میں ہی وہ احساس اپنی موت آپ مر گیا۔ شناسائی کی روشنی پل بھر میں ہی اجنبیت کی چادر اوڑھے تاریکی پھیلانے لگی۔ وہ پل بھر میں ہی اِک عام سی عورت محسوس ہوئی، کہ جس سے اُس کا کوئی رشتہ نہ تھا، سوائے نام کے۔ وہ پل بھر میں اِک معمولی عورت لگنے لگ گئی۔ اُس نے آنکھیں چرا لی تھیں۔

"تم سے ملنے آئی ہوں نتالیہ! لیکن خدا کے لئے اجنبیوں جیسا سلوک مت کرنا۔" بے بسی کی سالم تصویر تھیں۔

"مجھے کہاں کرنا آتا ہے سلوک اجنبیوں سا؟ اور اجنبی تو آپ کے لئے میں ہوں۔ میرے لئے تو آپ کی ذات زندگی بھر سے زیادہ شناسا رہی ہے۔ ہر کوئی مجھے آپ ہی کے ذریعے تو پہچانتا آیا ہے۔" کرب، تمسخر، ہنسی...... کتنا کچھ ملا جلا تھا اُس کے لہجے میں۔

"آج یہاں میں صرف تم سے وجہ پوچھنے آئی ہوں کہ آخر تمہاری منگنی ٹوٹنے کی کیا وجہ ہے؟...... ایسی کیا بات ہو گئی تمہارے اور احسن کے بیچ؟" وہ اُس کی بے رخی نظر انداز کر کے بولیں۔

"آپ یہ پوچھنے والی کون ہوتی ہیں؟"

"تمہاری ماں......" سوال کے سرد ہونے کے باوجود سیدھا جواب آیا تھا۔

"ہونہہ...... یہ رشتہ بہت کچھ مانگتا ہے۔ توجہ، محبت اور قربانی۔ اور اس طرح کی کوئی چیز مجھے آپ سے نہیں ملی۔ اگر کچھ آپ کی طرف سے ملا ہے تو وہ ہے لوگوں کا طنز، طعنے، رسوائی، اکیلا پن، محرومی...... آپ مجھ سے کوئی سوال کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتیں۔ آپ کا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں۔ جس طرح احمر صدیقی آپ کے لئے مر گیا ہے، اسی طرح نتالیہ مر بھی۔" بہت ہی ظالم لہجے میں کہی گئی یہ بات نتالیہ کے منہ سے بے باکانہ نکلی تھی اور وہ عورت، جس نے پل پل احمر صدیقی کی شاد میں گزارا تھا، پل بھر کو لرز اُٹھی۔

"نتالیہ! خدا کے لئے، ایسی بات منہ سے مت نکالو۔ تم میرے لئے کیا ہو، یہ مجھے علم ہے۔ کس طرح تمہارے پاپا اور میں نے تمہیں اللہ سے مانگا تھا، یہ مجھے علم ہے۔ کیسے تمہاری پیدائش کے مشکل مرحلوں سے گزری تھی، یہ مجھے پتہ ہے۔ دنیا کے طعنے کیسے سہے، یہ مجھے پتہ ہے۔" وہ اندر باہر سے ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں۔ باہر کی آندھی میں کچھ اور شدت آ گئی۔ کھڑکی کا شیشہ ہلنے لگ گیا تھا۔

"یہ باتیں تو کچھ عرصہ تک برداشت کیں آپ نے۔ اور ان باتوں سے جان چھڑانے کے لئے شادی کر لی آپ نے اور مجھے ڈال دیا کسی اور کی گود میں۔ مجھے پالا کسی اور نے۔ جب میں نے چلنا سیکھا تو میرے ہاتھوں میں ماں کا نہیں، کسی اور کا ہاتھ تھا۔ جب میں نیند میں رات کو ڈرتی، تو مجھے سہارا دینے کے لئے میری ماں نہ ہوتی۔ احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہوتے میں بڑی ہوئی۔ اور بڑی ہونے کے بعد بھی میری ہر عادت آپ سے منسلک کی گئی...... وجہ جاننا چاہتی ہیں ناں میری منگنی ٹوٹنے کی؟...... تو وجہ آپ ہیں۔ ہاں فائزہ بیگم! وجہ آپ ہیں۔" نتالیہ نے اپنی اُنگلی کا اشارہ اُس کی سمت کیا تھا۔ آنکھیں تھیں کہ جھلملا رہی تھیں، گلے میں گولا سا اٹکا تھا...... میری بربادی کی، ناکامی کی وجہ آپ ہیں۔ صرف آپ۔ سنیں گی میری کہانی...... شروع سے...... تو سنیں۔

مجھے عسفان سے محبت تھی...... مانگا تھا...... چاہا تھا اُسے میں نے...... لیکن تہمت مجھ پہ لگی کہ میں آپ کی بیٹی ہوں، آپ ہی کی طرح مرد پھنساتی ہوں۔ میرا چال چلن اچھا

نہیں ہے۔ اپنے اوپر سے یہ تہمت ہٹانے اور ماموں کے احسانات کا بدلہ چکانے کے لئے
میں نے احسن مشکور سے شادی کرنے کے لئے ہاں کر دی۔ اور احسن مشکور کو جب مسلمان
اور میری محبت کا پتہ چلا تو اُس کم ظرف مرد نے شادی سے انکار کر دیا اور وجہ بنی میں...
تہمت لگی مجھ پر...... گنہگار ٹھہرائی گئی نتالیہ احمر۔ اور میرے ساتھ ساتھ آپ جو اپنی بیٹی
دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے اور ذلیل ہونے کے لئے چھوڑ گئیں...... لیکن اس کو دنیا کی گرم
ہواؤں سے بچا نہیں پائیں۔ میری محبت پائمال ہوئی ...... میں بدنام ہوئی...... صرف
اور صرف آپ کی وجہ سے۔''

وہ رو رو کے فرش پہ بیٹھ چکی تھی۔ اور پوری کہانی سن کے فائزہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو
آ گئے تھے۔ وہ سمجھ چکی تھیں کہ زہرہ بیگم ہی کا رچایا ہوا کھیل ہے۔ سو وہ فوراً سے بھی پہلے
لاؤنج میں آئیں، جہاں انزلہ سمیت زہرہ بیگم بیٹھی تھیں۔

''کیا ہوا فائزہ! مل لیا اپنی بیٹی سے؟...... سن لیں اس کی باتیں؟'' وہ بڑے معنی خیز
انداز میں بولی تھیں۔

''ہاں بھابی! سن لیں اس کی سب باتیں۔ جان لی ہر سچائی۔ اور اب میں جواب مانگ رہی
ہوں آپ سے کہ آپ نے اس کی یہ حالت کیوں بنائی ہے؟'' ممتا کے دھڑکتے دل نے
اپنی لختِ جگر کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا جواب مانگا تھا۔

''ائے ہائے...... ایسا کیا کر دیا میں نے؟...... میں نے تو ہمیشہ اسے اپنی بیٹی ہی
سمجھا۔ کبھی انزلہ اور اس میں فرق نہیں کیا۔ گن گن کے نوالے کھلائے ہیں ان ہاتھوں
سے۔'' زہرہ بیگم صفائی پیش کرنے لگیں۔

''اگر آپ نتالیہ اور انزلہ میں کوئی فرق محسوس نہ کرتیں تو اس کی قسمت کا ستارہ اس
سے چھین کے اپنی بیٹی کی جھولی نہ چمکاتیں بھابی!''

''کیا مطلب ہے تمہارا فائزہ؟'' وہ بھڑکی تھیں۔

''آپ نے کیا کہا تھا کہ عسفان کے رشتے سے نتالیہ نے خود انکار کیا ہے۔ حقیقت
یہ تھی کہ اسے آپ نے مجبور کیا تھا۔ اسے ہر ایک کی آنکھ میں خراب کرنے والی آپ ہیں
بھابی! اسے اس موڑ تک پہنچانے والی آپ ہیں۔'' وہ سختی سے بولی تھیں۔ انزلہ کی حیرانی
دیدنی تھی۔ اُس پر یقیناً یہ انکشاف بہت بھاری گزرا تھا۔ نتالیہ کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا
بات کے لئے۔ لیکن وہ تو یقیناً بے بس تھی۔ مجبور تھی۔ اور عسفان، وہ بھی نہ سمجھ پایا اپنی محبت
کی بے بسی کو۔

''ائے فائزہ!...... تمہاری بیٹی بھی تمہاری طرح کہانیاں بنانا جانتی ہے۔ پرورش کیسی
بھی کی ہو، خون تو پانی سے بھی گاڑھا ہوتا ہے۔ خود ہی عسفان سے عشق کی پینگیں
بڑھائیں، خود ہی اپنے دوست احسن مشکور کو ہمارے گھر بھیجا، خود ہی انکار کیا اور اب خود ہی
شادی سے مکر گئی ہے۔ کوئی تیسرا پسند آ گیا ہوگا۔'' ممانی طنز سے بولی تھیں۔

''بھابی!...... زبان سنبھال کے بات کریں آپ۔'' فائزہ بیگم نے باور کرایا۔

''سچائی تو کڑوی ہی ہوتی ہے فائزہ بیگم! کرتوت تمہاری بیٹی کے ٹھیک نہیں اور
قصوروار ٹھہراتی ہو تم مجھے۔'' ممانی بھڑکی تھیں۔

''لیکن بھابی......!''

''پلیز......'' ہاتھ کے اشارے سے فائزہ بیگم کو نتالیہ نے روکا تھا۔ اُس کی منتشر سی،
بکھری بکھری سی حالت انزلہ پہ بہت گراں گزر رہی تھی۔

''میری وجہ سے یا میرے دفاع میں کسی کو بھی بولنے کی ضرورت نہیں۔ میری قسمت
میں جو لکھا تھا، ہو چکا۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ میری ذات سے کسی کو کوئی تکلیف
پہنچی ہو تو مجھے معاف کر دیں۔ اور آنٹی! میں عنقریب ہاسٹل شفٹ ہو جاؤں گی۔ اب آپ
کے نوالے میرے گلے سے نہیں اُترتے۔ آپ کے کیے احسانات کا بدلہ میں نہیں چکا سکتی۔
لیکن یہ تو کر سکتی ہوں کہ اپنے منحوس وجود کو آپ سے دور کر دوں، سو وہ میں کر دوں گی۔''
آنسو پھسل پھسل کر رخسار بھگو رہے تھے۔ وہ جانے کے لئے پلٹی تھی۔

فائزہ بیگم اپنی معصوم بیٹی کو دیکھ رہی تھیں، جو بے گناہ ہی قصوروار ٹھہرائی گئی تھیں اور
انزلہ کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

وہ جاتے جاتے چکرا گئی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ ذہن شل ہو گیا
تھا۔ پاؤں لڑکھڑانے لگے۔

وہ گرنے لگی۔ فائزہ بیگم نے دوڑ کر اُسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اُس نے پل بھر کو
اپنی ماں کے خدوخال کو غور سے دیکھا اور پھر اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ موجودہ دنیا
سے دُور جانے لگی!



کتنی دیر سے موندی ہوئی آنکھیں کھلی تھیں۔ لاشعور سے ذہن شعور میں آ رہا تھا۔ دیر
تک بند رہنے والی آنکھیں روشنی کے روبرو ہوئیں تو پل بھر پلک جھپکنا دُشوار سا لگا۔ بے
رنگ دائرے سے چلنے لگ گئے۔ وہ وہیں تھی، جہاں بے ہوشی سے قبل تھی۔ رنڑ طوطے کا

خالی پنجرہ ہوا کے زور پہ ہلا جا رہا تھا اور چیں چیں کی آواز پیدا کر رہا تھا۔ پل بھر کو تو اُسے یہ محسوس ہوا کہ یہ ہوا دُور دیس سے آئی ہوئی ہے۔ کسی نے اُسے یاد کیا تھا شدت سے...... دل کے نہاں خانوں سے...... اُس کے سامنے انزلہ تھی، سامنے اسٹول پہ بیٹھی ہوئی، اُس کے لئے بے حد فکر مند۔ اُس کی آنکھیں کھلی دیکھ کے وہ مسکرائی تھی۔

"شکر ہے، تمہیں ہوش آ گیا...... پاپا نے ڈاکٹر بلوایا تھا، انہوں نے تمہیں نیند کا انجکشن دیا تھا۔ اور پتہ ہے، پورے بارہ گھنٹے بعد تم جاگی ہو۔" انزلہ کے کہنے پر اُس نے کھڑکی میں دیکھا، وہ صبح کا کوئی پہر تھا۔ شفاف دن تھا۔ پچھلے دن کے آندھی طوفان اور بارش کا کوئی نشان ہی نہ تھا۔

"تمہیں ضرور بھوک لگی ہو گی۔ فرزانہ سے کہہ کے سُوپ بنوا دیتی ہوں۔" انزلہ یہ کہہ کے اُٹھی اور کمرے کا دروازہ کھول کے فرزانہ کو آواز دی۔

پچھلے روز کی تمام باتیں اُسے یاد آ رہی تھیں۔ آنٹی اور ماں کے مابین ہوئی وہ تمام باتیں۔ وہ اُٹھی اور واش رُوم میں گئی۔

واپس آئی تو انزلہ گرما گرم بھاپ اُڑاتے سُوپ کو باؤل میں ڈال رہی تھی۔ وہ تاول سے چہرہ پونچھتی اُس کے قریب آ بیٹھی۔ وہ اُسے دیکھ کے مسکرا دی۔

"یہ لو...... یہ سُوپ پی لو اور اپنے ذہن کو ریسٹ دو۔" اپنی طرف بڑھا ہوا باؤل اُس نے لیا اور اسے آہستہ آہستہ پینا شروع کیا۔ خالی معدے کے اندر گرم گرم سُوپ کا جانا اُسے بہت بھلا لگ رہا تھا۔ وہ سُوپ پیتی رہی اور انزلہ اُسے دیکھتی رہی، بہت گہری آنکھوں سے۔

سُوپ پی کے وہ اُٹھی، الماری کے اوپر رکھا سوٹ کیس اُتارا اور الماری کھول کے اپنے کپڑے نکالنے لگی۔

"یہ کیا کر رہی ہو نتالیہ؟" انزلہ حیران ہوئی۔

"کوئی سوال مت کرنا انزلہ!...... میرے پاس کسی کے سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔" اُس کے حلق سے قدرے بھاری آواز برآمد ہوئی تھی۔ وہ سوٹ کیس کھول کے کپڑے ڈالنے لگی۔

"کیوں کر رہی ہو پیکنگ نتالیہ؟...... بتاؤ، کہاں جا رہی ہو تم؟"

"دنیا بہت بڑی ہے...... کہیں نہ کہیں تو پناہ مل ہی جائے گی۔" درازوں سے، ٹیبل سے، الماری سے، ہر جگہ سے وہ ضروری چیزیں اکٹھی کرنے لگی تھی۔

"وجہ پوچھ سکتی ہوں میں؟" انزلہ اُٹھ کے اُس کے قریب آئی تھی۔ اُس نے پل بھر کو رُک کر انزلہ کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ یہ غمخوار چہرہ بھی عسفان کی یاد دلا دیتا تھا۔ وہی اپنائیت، وہی رحم، وہی سچائی۔

"انزلہ! تم سب لوگ بہت اچھے ہو۔ بہت اپنے اپنے سے۔ ماموں، تم آنٹی۔ لیکن میں اتنی اچھی نہیں ہوں۔ مجھے تم لوگوں کے بیچ رہنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ میں نے ہمیشہ تم سب کا دل دُکھایا ہے۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا یہاں اس طرح اتنے حق سے رہتے ہوئے یوں تم لوگوں کو پریشان کرنے کا۔" اُس کے لہجے میں افسردگی تھی۔

انزلہ اُس کے چہرے کے بدلتے زاویوں پہ غور کرنے لگی۔ وہ، جسے اُس نے ہمیشہ سے اپنا سمجھا تھا، اپنا مانا تھا، جس کی خاطر وہ ہر کسی سے لڑتی آئی تھی، جس کے اندر کی محرومی کو اُس نے ہمیشہ اِک دوست کی حیثیت سے ختم کرنا چاہا تھا۔

"میں تمہیں روکوں گی نہیں نتالیہ! اور نہ تم سے ناراض ہوں گی۔ کیونکہ تم بہت گہری، بہت گھنی ہو۔ اپنے دل کے اندر بڑے سے بڑے درد چھپا لیتی ہو اور کسی کو ہوا تک نہیں لگنے دیتیں۔ عسفان کے معاملے میں بھی تم قصوروار نہ تھیں۔ لیکن سبھی سمیت عسفان نے بھی تمہارا قصور بنا لیا اور تم اپنی خوشی یا غم کی پروا کئے بغیر دوسروں کے احسانوں کا بدلہ چکانے کے لئے خدائی خدمت گار بن بیٹھیں، بنا یہ سوچے کہ اس سے تم پر یا عسفان پر کیا گزرے گی...... اور...... اور اب اس طرح سے جا رہی ہو، عسفان ہی کی طرح مجھے بھی چھوڑ کر۔"

نتالیہ خاموش سن رہی تھی۔ انزلہ کے گالوں پہ پھسلتے آنسوؤں کے قطرے اُسے تکلیف پہنچا رہے تھے۔

"مت روؤ انزلہ!...... پلیز! میرے لئے مت روؤ...... میں اس قابل نہیں ہوں کہ کوئی میرے لئے اپنے قیمتی آنسو ضائع کرے۔" نتالیہ نے التجا کی تھی۔

اُس نے اپنا سامان باندھا، سوٹ کیس اُٹھایا اور جانے کے لئے قدم بڑھائے۔ انزلہ کی آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے دُھندلانے لگیں۔

"نتالیہ!" اُس نے ڈوبتی آواز سے اُسے پکارا تھا۔ نتالیہ نے سوٹ کیس زمین پہ رکھا اور اُس کے گلے سے لپٹ گئی۔ دونوں کا ایک دوسرے سے لپٹ کے ضبط کرنا مشکل تھا۔ دونوں ہی آنسوؤں کے سیلاب کی زد میں تھیں۔ خون کے رشتوں سے بڑھ کر ان دونوں کے بیچ دوستی کا رشتہ تھا، شناسائی کا بندھن تھا، دلوں کے زاویوں کی ہمرنگی کا ناتا تھا۔ بچپن

سے لے کر آج تک زندگی کے پل پل کو اکٹھے گزارنے کا رشتہ تھا اور اتنے سارے رشتے ان دونوں کے بیچ کی ہم سازگی کو اور بھی مضبوط بنا گئے تھے۔

کتنی دیر ایک دوسرے سے لپٹ کے وہ روتی رہیں، پھر ثنالیہ نے خود کو اُس کی ہمدرد گرفت سے چھڑوایا تھا۔

"ماموں یا خالہ میرے جانے کا سبب پوچھیں تو مت بتانا۔ کچھ مت کہنا۔ کوئی صفائی، کوئی جواز نہ پیش کرنا۔ بس وہ خود ہی کوئی نہ کوئی نتیجہ نکال لیں گے۔ میں تمہیں اپنا نمبر یا پتہ وغیرہ دوں گی۔" اُس نے اپنے دونوں گالوں اور آنکھوں کو ہاتھوں سے رگڑ کے صاف کیا اور سوٹ کیس دوبارہ اُٹھا لیا۔

"مت جاؤ کزن!" آنسوؤں میں ڈوبی آواز تھی۔ لیکن آواز سے بالکل ہی الگ کھنکھاتا لہجہ وہی پرانا تھا۔ اُس نے پل بھر مسکرا کے انزلہ کے چہرے کی جانب پیار سے دیکھا تھا اور پھر خود کو مضبوط کر کے اپنے قدم آگے کی طرف بڑھا دیئے تھے اور انزلہ روتی آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ دل میں یہ عہد کئے کہ وہ اُسے اُس کی خوشیاں لوٹا کے رہے گی، اُسے اُس کی کھوئی منزل دلوا کے رہے گی، اُس کے ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں اپنی مٹھی سے اکٹھی کرے گی اور انہیں جوڑ کے رہے گی۔



عسفان کے گرد ثنالیہ کی محبت نے تقدس کا، روشنی اور یاد کا جو ہالا بنایا تھا، اس کو وہ کسی طرح توڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ پرچھائیں کی طرح اُس کے ساتھ ہوتی۔ وہ ہر جگہ اُس کا چہرہ پاتا۔ کبھی کھلتے گلاب کی پنکھڑی کے اوپر پھسلتی اوس کے آئینے میں وہ مسکراتی تو کبھی ڈھلتی رات کے ستاروں کے بیچ نظر آتی۔ کبھی کسی نظم کی سطر میں سے بوتل کے جن کی طرح نمودار ہوتی تو کبھی آسمان پہ پھیلے دھوئیں کی طرح ہواؤں میں تحلیل ہو جاتی، جہاں کہیں بھی اُس کا پاؤں پھسلتا وہ اُس کا ہاتھ تھام لیتی۔ وہ ہر جگہ اُسے ڈھونڈتا جیسے وہ سمندروں کی دوری پر نہیں، سانس کے بھی زیادہ نزدیک ہے۔ جیسے ہی وہ اُسے پکارے گا، وہ مسکرا کے اُس کے سامنے کھڑی ہو جائے گی۔ کبھی کسی باغ میں بیٹھی کسی پاکستانی لڑکی پہ نظر پڑتی کہ جس نے اپنی دراز چوٹی میں پھولوں والے ہیئر پن لگا رکھے تھے تو وہ پاگل ہو جاتا۔ یوں لگتا کہ جیسے وہ انجان لڑکی ثنالیہ میں تبدیل ہو جائے گی۔

کتنا بھولا بھالا ہوتا ہے انسان کا دل۔ وہ اُمید کا دامن کبھی بھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ وہ آسرے کو پکڑ کر آگے ہی آگے چلا جاتا ہے۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی

عسفان کو جیسے اِک اُمید سی تھی کہ ثنالیہ اُسے بلائے گی اپنے پاس۔ اپنے درمان، اپنے ہمدرد دوست کو وہ ضرور آواز دے گی۔

زندگی اسی طرح اُمید کے کٹھن راہ گزاروں پہ چل رہی تھی کہ انزلہ کی ایک فون کال نے جیسے رگ و پے میں اشتعال دوڑا دیا تھا۔ اس دن وہ اپنی یونیورسٹی سے ہو کے سیدھا فلیٹ پہ آیا تھا کہ جب پہلے سے بجنے والی فون کی گھنٹی نے اُسے متوجہ کیا۔ اُس نے اپنی فائل رکھی اور فون اُٹھا لیا۔

"عسفان! میں انزلہ بول رہی ہوں۔" ایئر پیس کی دوسری جانب انزلہ کی آواز گونجی۔ عسفان کی نظر دیوار پہ لگی گھڑی پہ ٹھہر گئی۔ پاکستانی وقت کے حساب سے رات کے دو بجے ہوں گے۔ وہ حیران ہوا۔

"انزلہ! تم .... اس وقت؟ .... سب ٹھیک تو ہے ناں؟" حیرانی اور فکرمندی کے ملے جلے احساسات تھے۔

"مجھے آپ سے جو بات کرنی تھی، اس کے لئے دن کا وقت موزوں نہ تھا، اس لئے رات کے وقت فون کیا ہے۔ کچھ ضروری انکشافات کرنے تھے آپ پر۔" انزلہ نے کہا اور پھر اُس نے ہر حقیقت عسفان کے گوش گزار کر دی۔

اپنی امی کا ثنالیہ کو مجبور کرنا، اپنے من کو مار کر بھی ثنالیہ کا احسن مشکور کے رشتے کے لئے حامی بھر لینا، عباس رضوی اور احسن کا رشتہ اور منگنی ٹوٹنے کے بعد کے حالات اُس نے سچائی کے ساتھ عسفان کو بتا دیئے اور وہ شخص گنگ سا کھڑا تھا۔ حقیقت نے آئینے کی سیدھی طرف اب آ کے دکھائی تھی۔ اب آ کے صداقت نے دروازے کھٹکھٹائے تھے اور وہ سارے جو خود کو عاقل، بالغ، ہوشیار سمجھتے آئے تھے، کتنے غلط تھے وہ سب۔ وہ سارے لوگ تو اکٹھے تھے، ساتھ تھے۔ تنہا تو وہ تھی۔ وہ اکیلی ذات، وہ لڑکی کہ جس نے بے بسی کی چادر اوڑھ کے بھی تہمتیں برداشت کیں، جس نے دل پہ درد بھی جھیلا، گھٹ گھٹ کے آنسو بھی پیئے، خواہشوں کا قتل ہوتے بھی دیکھا اور پھر بھی دوش اُسی کا قرار پایا۔ رشتوں کی عدالت میں اُسے سزائے سنگساری دی گئی اور وہ سنگساری تہمتوں کی سنگساری تھی۔ عسفان کی آنکھوں میں، دل میں، ذہن میں جھلملا رہی تھیں وہ آنکھیں کہ جن ستارہ آنکھوں نے آنسوؤں کا سیلاب اکٹھا کر رکھا تھا۔

اُس کی سماعتوں میں گونج رہے تھے وہ دلربا الفاظ .... "تمہاری محبت کے سامنے سے پہلے میں اکثر سوچتی تھی کہ میری زندگی کیا موڑ لے گی، کہاں جائے گی۔"

اُس کے ہاتھوں کو محسوس ہونے لگا وہ شناسا لمس کہ جسے ہاتھ میں تھامے وہ زبردستی بارش میں چلتا جاتا تھا۔

وہ آنکھیں........وہ ہاتھ........وہ الفاظ اُس کے تھے، صرف اُس کے، جسے انجانے میں ہی وہ کسی اور کو سونپ کے، اُنہیں تنہائیوں کی گہری فضاؤں میں دھکیل کے سات سمندر کا فاصلہ طے کر آیا تھا........ساری دنیا ایک طرف لیکن کیا محبت بھی اتنی نادان تھی کہ جو کچھ سمجھ ہی نہ پائی، اپنے ہی سینے کے اندر دھڑکتے دل کی زبان کو اپنی ہی رگوں میں دوڑتے لہو کے رنگ کو اپنی ہی آنکھوں میں پرورش پانے والے خوابوں کی صداقت کو۔ کیا ازالہ کر سکتا تھا وہ اس کرب کا، جسے ستالیہ نے خود پر جھیلا تھا؟ کیا بدلہ تھا اُن آنسوؤں کا جو اُن ستارہ آنکھوں سے بہہ کے رائیگاں گئے تھے، وہ محبت جو پامال ہوئی تھی، جسے وصال کے پھولوں کے بدلے ہجر کی راکھ نصیب ہوئی تھی۔

رائیگانی .... پائمالی........ ہجر........ کیا یہی دے سکتا تھا وہ ستالیہ کو؟........ وہ سوچنے لگا۔

"نہیں ستالیہ! نہیں........ میرے ہاتھ اتنے نادان نہیں کہ وہ تمہارے جوڑے ہوئے ریت محل کی حفاظت نہ کر پائیں۔ میں آ رہا ہوں ستالیہ!........ میں آ رہا ہوں۔" اُس کے دل سے اِک آواز اُٹھی تھی اور باہر محسوس ہونے والی آندھی کا شور قدرے گھٹ گیا تھا۔

"ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظُلم وستم کے کوہِ گراں
رُوئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ، کڑکے گی
جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بُت اُٹھوائے جائیں گے

ہم اہلِ صفا، مردودِ حرام
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اُچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
ہم دیکھیں گے!



زندگی اُس کے لئے بہت بے کار قسم کی چیز بن چکی تھی۔ اور پھر ایسی زندگی کہ جس کا کوئی رُخ نہ ہو، کوئی مصرف نہ ہو، بھلا کس کام کی ہوتی ہے۔ وہ ورکنگ ویمن ہاسٹل میں شفٹ ہو چکی تھی۔ روزانہ صبح کورٹ جاتی اور شام کو اس پناہ گاہ کی طرف آتی کہ جو اُس کی طرح کتنی ہی لڑکیوں کے لئے کسی رحمت سے کم نہ تھی۔

ورکنگ ویمن ہاسٹل کی تمام خواتین کی زندگیاں اِک عجیب قسم کی یکسانیت میں ڈھلی ہوتی ہیں۔ جذبے، احساسات، روّیے کتنے ملتے جلتے ہیں۔ رزق کی تلاش میں تمام دن سرگرداں رہنے کے بعد صرف چھت کے لئے وہ اِک جگہ اکٹھی ہوتی ہیں۔ ایک جگہ کہ جو اُن کی پناہ گاہ ہوتی ہے، اُن کا سایہ، اُن کا سائبان ہوتی ہے۔

تنہا تو ستالیہ احمر پہلے بھی تھی۔ لیکن اس قدر تنہائی اُس کا مقدر تھی اور تنہائی کی یہ حد اُس کے مقدر کی انتہا۔

اُس دن وہ کورٹ سے واپس آئی تو وارڈن نے اُسے بتایا کہ اُس سے کوئی خاتون ملنے آئی ہیں۔ وہ فریش ہو کر نیچے میٹنگ روم میں آئی۔ وہاں ترتیب سے رکھے سبز رنگ کے صوفوں پہ بیٹھی عورت اُس کی ماں تھی۔ اتنے دنوں بعد اپنی بے قصور معصوم بیٹی کو دیکھتے ہی فائزہ بیگم سے رہا نہ گیا اور دوڑ کے بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔ فائزہ بیگم کے سینے کے اندر جو دل دھڑکتا تھا، وہ وہی دل تھا کہ جس نے ستالیہ کی دھڑکنوں کو تین موسموں تک اپنے اندر سینچا تھا، اپنے خون سے تشکیل دیا تھا، اپنی کوکھ کی چھاؤں بخشی تھی۔ اور اسی دل کے جذبے

سے ہمیشہ انجان بنتی آئی تھی نتالیہ احمر۔

اولاد اور والدین کے جذبوں میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ ہر اولاد اپنے والدین کے جذبوں کو تب سمجھ پاتی ہے، جب خود والدین کا درجہ پاتی ہے۔ لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ فاصلے صدیوں پہ محیط ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور شاید یہ جنریشن گیپ، یہ نسلی فاصلے کبھی بھی، کوئی بھی طے نہ کر پائے گا۔

''کیسی ہو میری جان!'' فائزہ بیگم نے اُس کے رخساروں پہ ہاتھ رکھ کے پوچھا تھا۔

''ویسی ہی، جیسی ہمیشہ سے تھی۔'' ناراضگی، ضد، ہٹ دھرمی کتنا کچھ تھا اُس کے لہجے میں۔

''خدا کے لئے میری بچی! مجھے اب تو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اپنی یہ ناراضگی اب تو مجھ سے ختم کرو۔''

''میں نے آپ سے پہلے بھی کہا ہے کہ میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔ میری ناراضگی صرف اور صرف اپنی تقدیر سے ہے۔ اپنی قسمت کے بنانے والے سے ہے۔'' نتالیہ کے چہرے پہ کوئی تاثر نہ تھا۔

''نہیں ہوتے بیٹی! اپنے رب پاک سے ناراض نہیں ہوتے۔ وہ اگر کچھ چھینتا ہے تو بدلے میں اور بھی قیمتی چیزیں عطا کرتا ہے۔ سچ مان میری بچی!''

''لیکن میں نے اُسے صرف چھینتے ہی دیکھا ہے۔ مجھ سے تو اُس نے صرف چھینا ہی ہے۔ پہلے پاپا کو، پھر آپ کو اور پھر عسفان کو۔ میری زندگی تو صرف انتشار کا شکار رہی ہے۔ میں اس سے بھی ناراض نہ ہوں تو میں کیا کروں؟ میں کوئی مٹی کا بُت نہیں، کوئی کانچ کی گڑیا نہیں۔ انسان ہوں، جیتی جاگتی، سانس لیتی، محسوس کرتی ہوں میں تکلیفوں کو۔ حسیات رکھتی ہوں میں۔'' چمکیلی نمی نتالیہ کی آنکھوں میں ٹھہر گئی تھی۔

''میں تمہیں لینے آئی ہوں میری بچی! چلو میرے ساتھ۔ تمہاری ماں کے زندہ ہوتے ہوئے تمہیں یوں دربدر پھرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چلو میرے گھر۔'' فائزہ بیگم نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ماں کا گھر......آپ نے میرے علم میں اضافہ کیا ہے، یہ بتا کر کہ اس دنیا میں میری ماں بھی ہے، میری ماں کا گھر بھی ہے...... میں تو سمجھتی تھی کہ شاید احمر صدیقی اپنے ہمراہ میری ماں کو بھی لے گئے تھے۔'' وہ تمسخرانہ مسکرائی تھی۔

''خدا کے لئے نتالیہ! ایسا مت کہو۔ خدا کے لئے مجھے غلط مت سمجھو۔ فقط میری مجبوری

نے مجھے تم سے دُور رکھا۔ فقط کچھ مصلحتوں نے۔ ورنہ میں نے احمر صدیقی کی امانت کو جان سے زیادہ چاہا ہے، اس کی پل پل خبر رکھی ہے۔ اُس وقت تمہیں اپنے بھائی کو سونپنا میری مجبوری تھی میری بچی! لیکن اب میں تمہیں اس طرح نہیں دیکھ سکتی۔'' بے بس مامتا اپنے آپ کو بے قصور ثابت کروانے کے لئے تڑپ رہی تھی۔

''آپ پلیز یہاں سے چلی جائیے...... مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیجئے۔ پلیز!'' وہ ملتجی تھی۔

فائزہ بیگم اس سے آگے کچھ بھی نہ کہہ پائیں۔ اور سرد سا رویہ رکھتی نتالیہ، گیسٹ رُوم سے باہر جا چکی تھی۔



جناح ٹرمینل ایئرپورٹ کے ویٹنگ لاؤنج میں انزلہ تازہ پھولوں کا گلدستہ ہاتھ میں تھامے کینیڈا سے آنے والی فلائٹ کی منتظر تھی۔ دل میں ہزار طرح کے احساسات سر اُٹھائے کھڑے تھے۔

وہ عسفان کی منگیتر تھی......اور نتالیہ کی جان سے بھی زیادہ عزیز دوست۔ اُسے نتالیہ بھی عزیز تھی اور عسفان بھی......اور ان دونوں کی معصوم محبت پہ وہ جان لٹا دینے کو بھی تیار تھی۔ نہال ہونے کو بھی آمادہ تھی۔

عسفان چند لمحوں میں آنے والا تھا اور اُس نے اب کے بار نتالیہ کو اپنا کے جانا تھا اور نتیجتاً انزلہ اور عسفان کا رشتہ ٹوٹنا تھا۔

کیا انزلہ نے اس رشتے کو توڑنے کے لئے عسفان کو بلایا تھا؟...... پل بھر میں ہی انزلہ کی نظر اپنی اُنگلی میں جگمگاتے اُس رشتے کی جانب گئی، جو جانے سے پہلے عسفان نے انتقاماً اُسے پہنایا تھا۔ اس رشتے کی کیا اہمیت تھی، کیا وقعت تھی؟ کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔ رشتے تو دلوں میں بندھتے ہیں۔ محبت سے جوڑے جاتے ہیں۔ زبردستی کے رشتے تو فقط تصوراتی رشتے ہوتے ہیں اور تصور کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے؟

انزلہ نے انگوٹھی اُتاری اور اپنے پرس کا زپ کھول کے اس میں گرا دی۔ دل میں اِک ٹیس اُٹھی ضرور لیکن اُسے کوئی افسوس نہ تھا کہ جو وہ کرنے جا رہی تھی، وہ عمر بھر کے اطمینان کے لئے کافی تھا۔ اور پھر اطمینان ہی تو ضروری ہوتا ہے زندگی کے لئے۔

اناؤنسمنٹ نے اُس کا دھیان اپنی طرف کھینچا۔ اُس نے اپنے خیالات پہ قابو پایا اور چہرے پہ اِک ان مٹ مسکان سجا ڈالی۔

اگلے ہی لمحے وہ عسفان کے سامنے تھی۔ عسفان میں کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ وہی شوخی، وہی شرارت۔ لیکن یقیناً یہ احساسات ثنالیہ کے زندگی میں لوٹ آنے کی بدولت تھے۔ وہ گوہر یکتا کہ جو چھن گیا تھا، تقدیر کے کسی لمحے نے وہ پھر سے جھولی میں ڈال دیا تھا اور اب وہ تاعمر اپنا تھا۔ یہ احساس ہر احساس پہ حاوی تھا۔

''بہت اچھا لگ رہا ہے انزلہ! اپنے گھر واپس آنا۔ اور آنا بھی ایسے مقصد کے لئے، جو زندگی سے بھی زیادہ معنی رکھتا ہو۔ ہے کہاں وہ دشمن جاں؟'' عسفان گاڑی میں بیٹھتے ہی کھلکھلا کے بولا تھا۔

''ہاسٹل شفٹ ہوگئی ہے۔ میں نے لاکھ روکنے کی کوشش کی، مگر اُس نے میری ایک نہ سنی۔ یقین کریں عسفان بھائی! اُس نے بہت کچھ سہا ہے، بہت کچھ برداشت کیا ہے۔ لیکن اس کے بدلے میں جو اُسے ملا ہے، وہ ظلم ہے اُس پہ۔ وہ ہر خوشی سے محروم رہی ہے عسفان بھائی! پلیز اسے اس کے مقدر کی تمام خوشیاں دے دیجئے عسفان بھائی! پلیز۔'' انزلہ کی آنکھوں میں ثنالیہ تھی، اُس کا کرب تھا۔ انزلہ کی ذات کی گہرائی میں دُور تک عسفان کو ثنالیہ ہی محسوس ہوئی۔

''اگر مجھے ذرا سا بھی علم ہوتا کہ یہ پاگل لڑکی کیا کرنے جا رہی ہے تو میں...... تو میں...... لیکن اُس نے بھی تو حد ہی کردی۔ انزلہ کے احسانوں کا بدلہ۔ ہونہہ، کیا کوئی اس قدر اونچا ہو جاتا ہے کہ اپنی ذات کو فراموش کر کے کسی کے احسانوں کا بدلہ چکانے کے لئے یوں کمر کس لیتا ہے۔ زندگیوں کی قیمت لگا کے اُس نے یہ سودا کیا تھا انزلہ!''

''مجھے تو یہ سوچتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے کہ اس سب کے پیچھے میری مما تھیں۔ میری مما۔'' انزلہ نے کہا۔

''نہیں انزلہ! اس کے پیچھے صرف تمہاری مما نہیں، اور بھی کچھ لوگ ہیں۔ احسن مشکور۔ یہی نام تھا ناں اُس شخص کا؟'' وہ بولا۔

''ہاں!''

''پوچھوں گا میں تم سے احسن مشکور! کسی بے گناہ ذات کے اوپر کیچڑ اُچھالنے کا مطلب۔ پوچھوں گا میں تم سے۔'' وہ اپنے ذہن میں آگے کے پلان سیٹ کرنے لگا۔

کوثر بیگم اور ماموں کے لئے تو یہ سرپرائز ناقابلِ یقین تھا کہ عسفان لوٹ آیا ہے، اس طرح خاموشی سے، یوں چپکے چپکے۔ لیکن بہرحال وہ خوش تھے اپنے جان سے عزیز بچے کو یوں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کے۔

لنچ کرنے کے بعد عسفان نے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں سبھی کو جمع کر لیا اور انہیں ثنالیہ پہ بیتنے والی ہر ہر حالت کے بارے میں آگاہ کرنے لگا۔

''احسان کا بدلہ...... کیا واقعی ثنالیہ نے وہ سب کچھ اسی بنیاد پہ کیا؟...... میرا مطلب، عسفان کا رشتہ ٹھکرا کے احسن مشکور کو اپنانا۔ اور وہ سب کچھ؟'' مبشر حسین سراپا حیرت بنے کھڑے تھے۔

''ہاں پاپا!...... اُس نے واقعی ایسا کیا۔ صرف مما کی ایک چھوٹی سی بات کو لے کر۔'' انزلہ نے تائید کی۔

''تمہاری ماں سے تو میں ضرور پوچھوں گا۔ لیکن ثنالیہ...... مجھے بہت پہلے ہی یہ پتہ تھا کہ ثنالیہ جیسی سلجھی اور سمجھدار لڑکی کوئی بھی غلط حرکت نہیں کرسکتی۔ اور پھر عسفان کے لئے اُس کے اندر جو محبت تھی، وہ میں اُس کی آنکھوں میں ڈھونڈ چکی تھی اور یقیناً وہ محبت جھوٹ نہ تھی، دھوکا نہ تھی۔ اپنی محرومیوں کی دلدل میں دبتے دبتے اُس لڑکی نے اتنا بڑا قدم اُٹھالیا اور کسی کو بھنک بھی نہ لگنے دی۔'' کوثر بیگم کو اپنی اس اُداس آنکھوں والی بھانجی سے بے پناہ محبت تھی۔

''بس، اب تو جو ہوگیا، سو ہوگیا۔ جلد سے جلد اب ہمیں عسفان سے شادی کردینی چاہئے ثنالیہ کی۔'' مبشر حسین فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

''نہیں ماموں!...... ابھی نہیں...... ابھی مجھے کچھ لوگوں سے بدلے لینے ہیں۔ ابھی کچھ اُلجھے بکھرے سے سوالات ہیں، جن کے جواب حاصل کرنے ہیں اور پھر اُسے اپنانا ہے۔'' وہ پُرعزم دل میں کچھ ارادے بُن چکا تھا اور ان کی تکمیل کا منتظر تھا۔



احسن مشکور اُس کی آنکھوں کے سامنے کرسی پہ براجمان تھا۔ کچھ خفا خفا سا اور کچھ شرمندہ سا...... ملاقات تو اس سے قبل اُن کی ہو چکی تھی، منگنی پر۔ لیکن بات چیت اس سے قبل کوئی نہ تھی۔ پھر اس طرح عسفان کا اُس سے ملنے کورٹ آنا، اُسے بالکل کچھ سمجھ نہ آئی تھی۔

''کیا لیں گے آپ عسفان صاحب؟ ٹھنڈا یا چائے؟'' احسن مشکور مہمان داری کے اصول یاد کرتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

''ایڈووکیٹ احسن مشکور۔ ایم اے، ایل ایل بی۔'' اُس کے نام کا بورڈ ٹیبل سے اُٹھا کے عسفان نے غور سے پڑھا۔ ''میں یہاں ٹھنڈا لینے آیا ہوں اور نہ چائے۔ فقط کچھ

سوالات کے جوابات لینے آیا ہوں۔"

"کس طرح کے سوالات؟" احسن نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ "آپ کی ایک عدد بہن ہے ناں، ماہا مشکور، جس کی منگنی عباس رضوی سے ہو چکی ہے؟"

"جی ہاں!"

"آپ جانتے ہیں، عباس میرا بے حد گہرا دوست ہے۔ اگر میں ماہا کا اپنے ساتھ کوئی جھوٹا اسکینڈل بنا کے عباس کے سامنے پیش کروں اور آپ کی بہن کی منگنی ٹوٹ جائے تو آپ کو کیسا لگے گا؟" عسفان نہایت صفائی سے بولا۔

"شٹ اپ، مسٹر عسفان!" احسن چلایا۔

"یُو شٹ اپ، مسٹر احسن مشکور! اپنی بہن کی بات چلتی ہے تو ہر کسی کی غیرت جاگ اُٹھتی ہے۔ اور ثنالیہ احمر کسی کی بہن نہ تھی، کسی کی بیٹی نہ تھی، کسی کی اپنی نہ تھی؟ کیا سوچ کے تم نے اُس کا رشتہ بھیجا؟ کیا اُس کے لئے رشتوں کی کمی تھی یا محبت کی؟ سچ تو یہ ہے احسن مشکور! کہ تم اس لائق ہی نہ تھے کہ ثنالیہ احمر جیسی قابل اور اسپیشل لڑکی کو تم سے منسلک کیا جاتا۔ تم کیا جانو محبت کیا ہوتی ہے، اعتبار کیا ہوتا ہے، کسی کو اپنا کے اُس کی اچھائیوں، اُس کی برائیوں سے منسلک ہو جانا کیا ہوتا ہے۔ الزام لگایا تھا ناں تم نے ثنالیہ پر کہ اُس کا چال چلن اچھا نہیں؟ ثنالیہ جیسی لڑکی تم پر تھوکتی بھی نہیں۔ اگر وہ مجبور نہ ہوتی، اگر وہ خود داری کے اس امتحان سے نہ گزر رہی ہوتی جو اُس نے پار کیا...... تم تو فقط فرار کی اِک راہ تھے ثنالیہ کے لئے۔ محبت تو اُس نے مجھ سے کی تھی۔ تم تو فقط اُسے مجھ سے جدا کرنے کے لئے اِک کیل، اِک کانٹا ثابت ہوئے۔" عسفان کی منتشر آواز سے پورا کمرہ گونج رہا تھا۔ اتنے عرصے سے دل کے اندر چھپا غبار یوں اچانک ہی تو نکلا تھا۔

محبت کو اتنے عرصے تک دل میں دبایا گیا تھا اور محبت کا یہ خطرناک طوفان جب اُبھرا تھا تو دشت و دریا ایک کر کے چھوڑنے والا تھا۔

سہما سہما سا احسن مشکور کونے میں کھڑا تھا، اُس نے سنبھلنے کی سعی کی۔

"چلے جاؤ میرے آفس سے...... آئی سے، گیٹ آؤٹ فرام دی رُوم۔" وہ چلایا۔

"غصہ تو تم پہ اتنا ہے احسن مشکور! کہ تمہیں گولی مار دینے کو دل کر رہا ہے۔ لیکن بہر حال تمہارا گناہ قابلِ معافی ہے، اس لئے جا رہا ہوں۔" وہ اُسے غصے میں گھورتا ہوا باہر نکلا اور کورٹ کے کاریڈور سے گزرنے لگا۔ اچانک ہی اُس کی نظر ایک بورڈ پہ جا ٹھہری جہاں پہ ایڈووکیٹ ثنالیہ احمر کا نام کندہ تھا۔

کتنا اپنا اپنا، کتنا میٹھا میٹھا تھا یہ نام۔ شناسائی کے کتنے ہی موسم اپنے آپ میں سمیٹے مسکرا رہا تھا یہ نام۔ پل بھر کو وہ ٹھہر گیا۔ ثنالیہ کے آفس پہ تالا لگا تھا۔ وہ کچھ پریشان ہوا۔ کاریڈور میں سے کسی کا گزر ہوا۔ یہ غالباً کوئی ملازم تھا۔

"بات سنیں!" عسفان نے اُسے اشارے سے روکا تھا۔

"ہاں جی۔" وہ متوجہ ہوا۔

"یہ مس ثنالیہ احمر کے آفس پہ تالا کیوں لگا ہے؟ کیا آج وہ نہیں آئیں؟"

"نہیں صاحب! وہ اوپر کانفرنس ہال میں ہیں۔ وہ بہت ہی بڑا مقدمہ جیت گئی ہیں۔ اُسی کی فائنل ہیئرنگ کے بعد سبھی کانفرنس ہال میں جمع ہیں۔" وہ ملازم اُسے بتاتا ہوا آگے نکل گیا اور عسفان کے چہرے پہ اِک مسکان سی دوڑ گئی۔

"تم جیت ہی کی عادی بنی رہو ثنالیہ!...... تم ہر مقدمہ جیتو گی۔ تمہیں کوئی ہرا نہیں سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔" دل کے اندر اِک بازگشت سی سنی تھی عسفان نے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی گاڑی تک آ پہنچا۔



اگلا مرحلہ عباس رضوی سے ملاقات کا تھا کہ جس کے فلیٹ پہ اُس نے رات بھر پناہ لی تھی، مجبوری کے تحت۔ اور اسی مجبوری کا فائدہ اُٹھایا گیا تھا۔ ثنالیہ کی شفاف بہتے جھرنوں ایسی ذات پہ ہر سُو رنگ لگائے گئے تھے۔ اُسے ہر طرح سے پریشان کیا گیا تھا۔

عباس رضوی بظاہر مطمئن سا تھا۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ عسفان کس سلسلے میں اُس سے ملنے آیا ہوا تھا۔

"کب آئے کینیڈا سے عسفان؟ بتایا نہیں یار! کسی خاص سلسلے میں آئے ہو؟"

"شادی کرنے آیا ہوں یار! منگنی پہ تو تم آ نہ سکے تھے، اس لئے سوچا کہ شادی پہ سب سے پہلے تمہی کو دعوت دوں۔" عسفان طنزیہ لہجے میں بولا۔

"شادی...... کب کر رہے ہو شادی؟ کیا نام تھا تمہاری منگیتر کا؟" عباس ذہن پہ زور ڈالنے لگا۔

"ثنالیہ احمر۔" عسفان نے یاد دلایا۔

"ن...... ن...... ثنالیہ...... لیکن اُس سے تو تمہاری بات ٹوٹ گئی تھی ناں؟" عباس کی آنکھوں میں اِک تمسخر تھا، اِک کاٹ تھی۔

"وہی تو جوڑنے آیا ہوں یار! اور تمہارے احسان کا بھی شکریہ ادا کرنے آیا ہوں کہ تم

نے احسن مشکور کے دل میں غلط فہمی ڈال کے اُس کا رشتہ ختم کروا دیا ثنالیہ سے۔ سوچ رہا ہوں، یہ احسان کیسے اُتاروں تمہارا؟"

"ماہا سے تمہاری منگنی تڑوا کے؟"

"ہاں!" اب عسفان کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

"عسفان!" عباس چیخا تھا۔

"بھلا ہو مت عباس رضوی!...... اچھے دوست ثابت ہوئے تم۔ بہت وفاداری دکھائی تم نے۔ کسی پاک دامن عورت کے اوپر کیچڑ اُچھالتے ہوئے تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی؟ تمہارے گھر رات گزاری تھی ناں میں نے اور ثنالیہ نے۔ کیا دیکھا تھا تم نے ایسا کہ تم نے یہ برداشت نہ کیا کہ وہ لڑکی تمہارے سالے سے شادی کرتی۔ کیا اُس کے دامن پہ کوئی داغ تھا؟ کیا اُس کے اندر کوئی کمی تھی؟" عسفان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا یار! رشتہ توڑنے میں جلد بازی احسن مشکور نے کی تھی۔" عباس کچھ خجل سا ہوا۔

"لیکن کسی پاکباز لڑکی پہ کیچڑ اُچھالنے میں کمی تم نے بھی نہ چھوڑی۔"

"کم آن عسفان! وی آر گڈ فرینڈز یار! ہم بہت اچھے دوست ہیں۔" عباس نے مصالحت کی کوشش کی۔

"ہیں نہیں، تھے۔ عباس! ہم اچھے دوست تھے۔" طنزیہ انداز میں کہتا ہوا عسفان جانے کے لیے مڑا۔ "اور ہاں عباس! کبھی بھی، کسی بھی لڑکی کے دامن پہ رنگ لگانے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ تم بھی کسی کے بھائی ہو اور اگر کوئی اور تمہاری بہن کے ساتھ ایسا کرے تو تمہیں کیسا لگے گا؟"

وہ چلا گیا۔ اپنے پیچھے عباس رضوی کو شرمندہ شرمندہ سا چھوڑ کر۔



کافی دن گزر گئے تھے۔ بظاہر کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ زندگی اسی مخصوص رفتار میں ہولے ہولے رواں دواں تھی۔

عسفان کے آنے سے زندگی کی رنق لوٹ تو آئی تھی مگر ابھی تک کوئی بھی چیز معمول سے ہٹ کر نہ ہوئی تھی۔ اور تو اور، وہ ابھی تک ثنالیہ کو دیکھ بھی نہ پایا تھا۔ اَن مٹ گہرے رشتوں کے بیچ کچھ ایسی فصیلیں حائل ہو گئی تھیں کہ ملاقات کا تو فی الحال تصور بھی نہ تھا۔ لیکن کم از کم اپنی نظروں سے تو اُسے دیکھا جا سکتا تھا۔ دُور سے، فاصلے سے۔ اُس کے

چہرے کے چمکتے چاند کو فاصلے سے تو دیکھا جا سکتا تھا...... اُس کی کرنوں سے اپنی زندگی کو منور تو کیا جا سکتا تھا۔

بے چینی اور بے تابی نے اس قدر تڑپایا کہ وہ بستر سے اُٹھا، گاڑی کی چابی اُٹھائی اور گھر سے نکل پڑا۔ اتنا تو اُسے پتہ تھا کہ وہ ورکنگ ویمن ہاسٹل میں رہتی ہے۔ لیکن کیا وہ اس سے ملنے جا رہا تھا یا اُسے دیکھنے کی کوئی صورت نکل سکتی تھی شاید...... مگر کیسے؟...... زندگی من چاہی چیزوں کے ہو جانے کا تو نام نہیں ناں...... یہاں کون سی چیز اپنے بس، اپنی دسترس میں ہوتی ہے۔ مگر...... مگر یہ دل بھی ناں...... یہ دل بھی بڑی نادان سی چیز ہے۔

اُس نے چوتھے گیئر میں گاڑی دوڑانی شروع کی۔ اُس کا رُخ زہرہ ورکنگ ویمن ہاسٹل کی طرف تھا۔ اور پندرہ منٹ ہی میں وہ ہاسٹل کے مخصوص کریم کلر کے گیٹ کے باہر تھا۔ اُس نے گاڑی گیٹ کے عین سامنے کھڑی کرنے کے بجائے سائیڈ میں لگے درخت کے ساتھ ہی کھڑی کر دی۔

ہاسٹل کے اندر شام کے اس پہر زندگی رواں دواں ہو گی۔ تمام عورتیں اپنے دفتروں اور یونیورسٹیوں سے فراغت کے بعد واپس لوٹی ہوں گی اور ہر کوئی اپنی مرضی کے مطابق کسی مشغلے میں مصروف ہو گی۔ کچھ لڑکیاں کاریڈور میں گروپ کی شکل میں بیٹھی چائے کے کپ سے لطف اندوز ہو رہی ہوں گی تو کئی اپنے نئے لڑکے دوست کو فلرٹ کرنے اور اُسے بے وقوف بنانے کے قصے اپنی سہیلیوں کے گوش گزار کر رہی ہوں گی۔ کوئی انٹرنیٹ پہ چیٹنگ میں مصروف ہو گی تو کوئی ریڈیو پہ ایف ایم سن رہی ہو گی۔ عسفان نے پل بھر کو سوچا۔ "یہ لڑکیاں بھی ناں...... شادی سے قبل کتنی آزاد، کتنی انوکھی زندگی گزارتی ہیں۔ ہر مشکل، ہر رکاوٹ کو پاؤں تلے روند کے آگے نکل جاتی ہیں، مغرور ہواؤں کی مانند۔ اور جب کسی کو چاہتی ہیں تو اپنے غرور کو اپنے دوپٹے میں بند کر کے اپنے قدموں میں رکھ دیتی ہیں اور پھر تا عمر اُس کی غلامی کرتی رہتی ہیں۔ اُس کی زندگی، اُس کے معمولات، اُس کے گھر، اُس کے لوگوں کو اپنا بنا لیتی ہیں۔ اپنی ذات کو فراموش کر دیتی ہیں۔ یہ لڑکیاں کتنی پاگل ہوتی ہیں۔"

عسفان نے مسکرا کے سر کو جھٹکا۔

تبھی گیٹ کے عین سامنے اِک رکشہ آ کے ٹھہرا اور اُس میں سے کوئی لڑکی اُتری۔

عسفان کی توجہ پل بھر کو اُس طرف گئی اور آنکھیں جیسے اسی پہ ٹھہر گئیں۔ وہ نتالیہ تھی........
وہی نتالیہ جو اُسے اپنے دل کے اندر دھڑکنوں کی گہرائی میں دھڑکتی محسوس ہوئی تھی۔ وہی نتالیہ کہ جس کا وجود اُسے سات سمندر پار بھی اپنے سے بے حد قریب لگا کہ جس کی سانسیں ہمیشہ اُسے اپنی پلکوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ اتنے عرصے بعد اُس کے سامنے تھی۔

وہ رکشہ سے اُتری اور رکشہ والے کو پیسے دینے کے لئے اپنا پرس کھولا۔ عسفان نے فوراً اپنا موبائل فون نکالا اور اُس کی تصویر اُتار لی۔ وہ پل بھر کو ٹھہری، اپنی فائل پچھلی سیٹ سے اُٹھائی اور اندر جانے لگی۔ اگر وہ یونہی بے خیالی میں اپنی گردن موڑ کے دیکھتی تو شاید اُس کی آنکھیں عسفان کو دیکھ لیتیں۔ یا شاید وہ اس اندھیرے کونے میں چھپے، اپنے دل میں بے پناہ سچائیاں سمیٹے ہوئے لڑکے کے خدوخال کو پہچان لیتی۔ لیکن وہ نہ مڑی اور نہ رُکی بلکہ اپنی رفتار برقرار رکھتی ہوئی گیٹ عبور کر گئی۔ اور عسفان وہیں کھڑا رہا۔ چپ چاپ۔ بے حس وحرکت۔

اتنے عرصے بعد آنکھوں نے اس چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ چہرۂ نایاب، وہ گوہر یکتا........
پل بھر کو دل میں اِک ٹیس سی اُٹھی۔ اُس نے موبائل فون کو پھر کھولا اور اُس کی تصویر دیکھنے لگا۔ وہی خدوخال........ وہی رُوپ، وہی چہرہ، وہی بھولپن........ سب کچھ ویسا کا ویسا ہی تو تھا۔ پھر آخر کیا بدلا تھا؟

وہ گاڑی میں بیٹھا، ٹیپ ریکارڈر آن کیا۔ مغنیہ کی درد بھری آواز گونجی۔

پاس رہ کر بھی کوئی پاس نہ ہو
دل بھلا کس طرح اُداس نہ ہو
دھڑکنوں کو گمان ہونے لگا
وہ کہیں دل کے آس پاس نہ ہو

عسفان بار بار اُس کی تصویر کو دیکھ رہا تھا، اُسے آنکھوں میں مقید کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کس قدر پاس تھی، لیکن کس قدر دُور بھی........ آخر اس دُوری، اس فاصلے کی اور کتنی فصیلیں بیچ میں حائل تھیں۔

لیکن نہیں........ یہ فاصلہ عارضی ہے، یہ رُکاوٹیں عارضی ہیں۔ ہمیں ملنا ہے، ہمیں ایک ہونا ہے۔" دل میں اِک عہد باندھا جا چکا تھا۔ ارادوں کو پھر مضبوط کیا جا چکا تھا۔

خوش ہوئے بھی تو ایک ڈر سا لگا
آس کے ساتھ ساتھ یاس نہ ہو

آشیانہ نیا بنا تو لیا
بجلیوں کو میری تلاش نہ ہو

مغنیہ اپنی غزل گائے جا رہی تھی۔



"میں نہیں جانتا امی! بس آپ کسی طرح اُسے فائزہ خالہ کے گھر شفٹ کروالیں۔ اُسے آپ اور ماموں مما کے اُدھر لے جائیں۔" عسفان خاصے ضدی لہجے میں بولا تھا۔
"بات کی تھی میں نے فائزہ سے۔ کہہ رہی تھی کہ نتالیہ نہیں مانتی۔" کوثر بیگم، عسفان کے بالوں میں تیل ڈالتے ہوئے بولیں۔
"نہیں مانتی........ نہیں مانتی........ وہ ہوتی کون ہے، اس طرح ہر کسی پر اپنی مرضی کو یوں تھوپنے والی۔ امی! میں اس طرح اُس سے شادی نہیں کروں گا۔ اُسے اپنی امی کے گھر شفٹ ہونا پڑے گا۔ میں وہاں بارات لے جاؤں گا اور اُسے باعزت طریقے سے گھر لاؤں گا۔ آپ کل ہی ماموں کے ہمراہ جائیں۔ اور خدارا! اُسے یہ نہ بتائیے گا کہ یہ میں نے کہا ہے۔ اُسے بس کسی طرح مما کے فائزہ خالہ کے گھر لے جائیں۔ باقی جو بھی کچھ ہونا ہے، وہ ہو جائے گا۔" عسفان مسکرا دیا تھا۔
اور پھر عسفان ہی کی ضد سے مجبور ہو کر مبشر حسین اور کوثر بیگم نتالیہ سے ملنے ہاسٹل پہنچ گئے تھے۔
"ہم تمہیں لینے آئے ہیں نتالیہ!" مبشر حسین نے کہا۔
"لینے؟........ کہاں جانے کے لئے؟" وہ حیران ہی تو ہوئی تھی۔
"تمہاری امی کے گھر کے لئے۔ ہم سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ اپنے ماموں، خالہ اور امی کے ہوتے ہوئے تو اس طرح ہاسٹل میں رہو۔" ماموں نے کہا۔
"نہیں ماموں! میں کسی کے بھی گھر رہ کر کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی........ اپنے نحوست سے بھرے وجود کو بسے بسائے گھروں سے دُور رکھنا چاہتی ہوں۔" اُس کے لہجے میں اُداسی تھی۔
"بیٹیاں بھی کبھی ماں باپ پہ بوجھ ہوئی ہیں؟........ نتالیہ! یا تو تم نے ہم کو کبھی اپنا ہی نہیں سمجھا اور اگر سمجھا ہے تو پھر اس بے رُخی کی وجہ۔ بیٹا! ہمیں سچائی کا پتہ لگ چکا ہے اور یقین کرو کہ میں تم سے شرمندہ بھی ہوں۔ تمہارے ساتھ غلط ہوا ہے، ناانصافی ہوئی ہے۔ ہم نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔ ہمیں معاف کر دو بچی!........ ہمیں معاف کر دو۔" ماموں

نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا اور وہ اُن کے شفیق دامن سے لگ گئی تھی۔ نمی کے چند قطرے آنکھوں میں ٹپک گئے تھے۔

''آپ بہت اچھے ہیں ماموں!''

''بس، اب سب ٹھیک ہو جائے گا نتالیہ! چلو اپنا سامان لے آؤ۔ ہم ابھی کے ابھی فائزہ کے گھر چلتے ہیں۔'' کوثر خالہ نے اُسے پیار سے کہا۔

''نہیں خالہ!...... میں ایسا نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ روہانسی ہوئی تھی۔

''نتالیہ! ہم نے تمہاری چاہت کو بہت دھیان میں رکھ لیا۔ ہماری بھی کچھ چاہتیں ہیں تم سے وابستہ جنہیں تم اگنور نہیں کر سکتی۔ اسے میرا حکم سمجھو یا خواہش، لیکن تمہیں ابھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر نہیں تو یہ سمجھنا کہ تمہارا ماموں تمہارا کچھ نہیں لگتا۔'' ماموں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

نتالیہ حیران تھی اور پریشان بھی۔ ماموں نے اتنی سختی سے کبھی بات نہیں کی۔ انہوں نے ہمیشہ نتالیہ سے اُس کی منشا پوچھی ہے، ہمیشہ اُس کی خواہش کو ترجیح دی ہے، تو پھر آج ان کا ردِیہ کیوں؟...... دماغ میں سوالات ہزاروں تھے لیکن بہرحال یہ وقت کسی سوال کے جواب کا نہ تھا۔ اس وقت صورتِ حال کو سنبھالنے کی ایک ہی راہ تھی کہ وہ ماموں کی بات مان لے۔ لہٰذا اُس نے وہی کیا۔

اپنا مختصر سا زادِ راہ سمیٹا اور گاڑی میں بیٹھ گئی اور ماموں اور خالہ کے ہمراہ فائزہ بیگم کے گھر چلی آئی۔ اور اب یہ گھر اُس کی عارضی پناہ گاہ بن گیا تھا۔ رنجش تو اُس کی کسی سے نہ تھی۔ نہ فائزہ بیگم سے، نہ اُس کے شوہر اور بچوں سے۔ بس اپنی قسمت سے رنجش تھی، جسے وہ اب فراموش کر رہی تھی۔



''چھوٹی بی بی!...... بڑی بی بی کہہ رہی ہیں کہ نیچے آ جائیں۔ انزلہ بی بی آپ سے ملنے آئی ہیں۔'' ملازمہ کی دی ہوئی اطلاع پر وہ چونک کے اُٹھی تھی۔ انزلہ کا نام گویا اُس کے لئے تازگی کا باعث تھا۔ کتنا سارا عرصہ ہو گیا تھا انزلہ سے ملے۔ وہ، جو دوست بھی تھی، رازدار بھی تھی، عزیز از جاں بھی تھی۔ اُس سے تو رُوح کا ناتہ تھا۔

وہ دوڑ دوڑ کے سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ نیچے لاؤنج میں ہی سبز رنگ کے پرنٹڈ کاٹن کے سوٹ میں اِک نکھرا نکھرا وجود تھا۔ وہ انزلہ تھی۔ نتالیہ سے مل کر وہ بھی کھل اُٹھی تھی۔ دونوں پل ہی پل میں بغل گیر ہو گئی تھیں۔

''نتالیہ!...... میری جان!...... کتنا مس کیا میں نے تمہیں۔''

''تو کیا میں نے مس نہیں کیا؟ تم کیا جانو کہ تم میرے لئے کیا ہو۔''

''بس، اب اور الگ نہیں رہا جاتا۔ اب جلدی سے ہمارے گھر واپس آ جاؤ۔'' انزلہ نے کہا۔

''ارے تمہارے گھر کہاں؟ اب تو یہ تمہارے پڑوس میں آئے گی۔'' فائزہ بیگم نے مزاقاً کہا۔ نتالیہ حیران ہی تو ہوئی تھی۔

''اور پھپھو! یہ روزانہ ہاتھ میں کٹورا اُٹھا کے کچھ نہ کچھ مانگنے چلی آئے گی۔'' انزلہ اور فائزہ بیگم دل کھول کے ہنس رہی تھیں اور اُن دونوں کی یہ مبہم گفتگو نتالیہ کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ خاموش تھی۔ انزلہ نے اُس کی یہ حیرانی بھانپ لی۔

''نتالیہ! یہاں میں بے مقصد نہیں آئی، بلکہ بھیجی گئی ہوں۔ کوثر پھپھو نے کہا ہے کہ شادی کی شاپنگ تمہاری مرضی سے ہونی چاہئے۔''

''شادی؟...... کس کی شادی؟''

''اوہ...... لگتا ہے، انہیں فارملی بتانا پڑے گا۔ مس نتالیہ احمر! اب آپ عنقریب ہی نتالیہ عسفان بننے والی ہیں۔ اپنا بوریا بستر سمیٹ لیں اور ہمارے پڑوس کی شان بڑھانے آ جائیں۔'' انزلہ نے کھلکھلا کے کہا۔ نتالیہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

نتالیہ عسفان؟...... یہ کیا کہہ رہی تھی انزلہ؟ یہ کس انہونی کی جھلک دکھا رہی تھی اُسے؟ کیا یہ سب مذاق تھا یا حقیقت؟ اور اگر کوئی حقیقت تھی تو اتنی پرائی پرائی کیوں تھی؟

''میں ذرا کچن میں جاتی ہوں۔ تم دونوں باتیں کرو۔'' فائزہ بیگم جان کر وہاں سے اُٹھ گئیں اور انزلہ، نتالیہ کے چہرے پہ بکھرے سوالات کو پڑھ رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں، تمہارے دل میں بہت سے سوال ہیں اور ان تمام سوالوں کا میرے پاس فقط ایک ہی جواب ہے...... اللہ تعالیٰ کی ذات...... ہاں نتالیہ! یہ معجزہ ہی ہے اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی یوں سب کچھ بدل جانا...... پاک دامن عورت کا گواہ خود رب تعالیٰ ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے داغ دار ثابت نہیں کر سکتی۔ تم کہتی تھیں ناں نتالیہ! کہ تمہارا دنیا میں کوئی بھی نہیں۔ تم کیا جانو گی! تمہاری محافظ تو وہ ذاتِ کریم تھی۔ تمہارا اپنا تو وہ رب العالمین تھا۔ اور تمہارے اسی اپنے نے تمہاری قسمت میں عسفان کو لکھا ہے...... اُس عسفان کو، جسے تم نے چاہا ہے، جسے اپنا مانا ہے۔ تمہاری محبت میں اتنی طاقت تھی نتالیہ! کہ وہ عرش والا خود تمہاری محبت کا امین بن گیا۔ عسفان بھائی لوٹ آئے ہیں نتالیہ! تمہیں

اپنانے کے لئے۔ تمہارا ہونے کے لئے۔"

انزلہ کا لہجہ محبت سے بھرپور تھا۔ ثنالیہ اُس کی باتیں سن کر خود پہ ضبط نہ کر پا رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ وہ انزلہ کے کندھے سے لپٹ گئی۔

"بس میری جان! بس۔ اب اچھے دنوں کی منتظر رہو۔ دُکھ کے دن بیت گئے۔ اب سُکھ کے موسم تمہارے منتظر ہیں...... محبت کی جیت ہوئی ہے...... اس کی تکمیل ہوئی ہے۔"

انزلہ کے لفظ اُس کے وجود کے چاروں طرف روشنی بکھیر رہے تھے۔ عرصے سے دل پہ چھائے تاریک پردے ہٹنے لگ گئے تھے۔ زندگی اُسے ہر طرف سے مسکراتی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اور تکمیل کا یہ احساس فقط محبت ہی کے دم سے تھا۔ وہ محبت جو اپنی ہوتی ہے۔ سانسوں سے بھی قریب تر لگتی ہے۔ آج اُسے اپنے ذہن و دل کے ہر ہر گوشے میں ہزار طرح کی بازگشتیں سنائی دے رہی تھیں اور محبت کی یہ بازگشت انہی میں سے ایک تھی۔

"محبت چلچلاتے گرم صحراؤں میں
ٹھنڈی چھاؤں کی مانند
محبت اجنبی دنیا میں اپنے گاؤں کی مانند
محبت مورتی ہے
اور کبھی جو دل کے اندر میں کہیں پر ٹوٹ جائے تو
محبت کانچ کی گڑیا
محبت جھلملاتی آنکھ میں برسات ہوتی ہے
محبت نیند کی رُت میں حسیں خوابوں کے رستوں پر
سلگتے، جاں کو آتے رتجگوں کی گھات ہوتی ہے
محبت جیت ہوتی ہے
محبت مات ہوتی ہے
محبت ذات کی تکمیل ہوتی ہے
۔محبت ذات ہوتی ہے!!"

◆◆○◆◆

بندھن میرج گارڈن کے وسیع و عریض ایریا میں شادی کی بھرپور جگمگاہٹ تھی۔ ہال کو کسی ماہر ڈیکوریٹر نے اپنے نت نئے آئیڈیاز سے سنوارا تھا۔ جگمگ کرتی روشنیاں نہایت ترتیب سے سجائی گئی تھیں۔ ریڈ اور گولڈن کے کمبی نیشن کا اسٹیج نہایت دلفریب لگ رہا تھا۔

پیچھے لگے ریڈ سلک کے پردے انتہائی حسین تاثر پیش کر رہے تھے۔

عسفان کے بھائی اور انزلہ کی سہیلیاں سارے ہال کے شور ہنگامے میں مصروف تھے۔ یہ نکاح اور ولیمے کی ملی جلی تقریب تھی۔ مہمانوں کی تعداد گو زیادہ نہ تھی، لیکن جتنے لوگ تھے، یوں لگتا تھا تمام شہر کی پُر رونق ہستیاں جمع ہوں۔ عسفان اسٹیج پہ بیٹھا اپنے کولیگز اور دوستوں سے خوش گپیوں اور فوٹو گرافر کو پوز دینے میں مشغول تھا۔ نکاح ہو چکا تھا لیکن ہال میں ابھی تک دُلہن کی آمد نہیں ہوئی تھی۔

کافی دیر کے کڑے انتظار کے بعد ہال میں اِک شور سا اُٹھا۔

"دُلہن آ گئی...... دُلہن آ گئی۔"

سبھی لوگوں کی نظریں داخلی دروازے کی جانب دوڑ گئیں، جہاں سے خوب صورت لباس میں خوشبوؤں اور رنگوں میں بسی دُلہن کی آمد تھی۔

شاکنگ پنک لہنگے اور اورنج چولی میں ملبوس، خوب صورت میک اپ میں، گجروں، چندن اور گلاب میں لپٹی مہک کو تھامے وہ ثنالیہ عسفان علی تھی۔ اپنے محبوب کا ساتھ ملنے پہ نازاں۔ اُس نے تقدیر سے یہی اطمینان، یہی اپنا پن تو مانگا تھا۔ وصال کے انہی پھولوں کی تمنا ہی تو کی تھی۔ یہی تو وہ پھول تھے، جنہیں اُس نے ہجر کی راکھ میں اُگایا تھا اور یہی پھول اتنے نکھرے نکھرے، اتنے کھلے کھلے بن گئے تھے۔

اپنے ہم سفر کے ساتھ زندگی کا نیا سفر شروع کرنے جا رہی تھی، اُس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اُس کے ملبوس سے پھوٹتی مانوس خوشبو میں من ڈوبا جا رہا تھا۔ دماغ ہال میں موجود ہوتے ہوئے بھی بہت دور تھا۔ اُسی ہم سفر کی باتوں میں۔

"اگر انسان کے ہاتھ ریت محل تعمیر کرنے میں ماہر ہوں تو......
سن لو کہ کچھ مرد مختلف بھی ہوتے ہیں......
میری رُوح بھی تمہارے دل کے پنجرے میں بس چکی ہے......
انسان جس چیز کو صداقت سمجھتا ہے، اس کے لئے زندہ رہنا اور فنا ہونا ہی تو سب کچھ ہوتا ہے۔"

اُس کی گزری باتیں ثنالیہ کی سماعتوں میں شور مچا رہی تھیں۔ کتنی محبت کرتا تھا ناں اُس سے عسفان۔ کتنا خیال رکھتا تھا اُس کا۔ اور وہ...... اُس نے کبھی اُس کی محبت کا جواب محبت سے نہ دیا تھا۔ کبھی اُس کی کسی بات کو گہرائی میں نہ لیا تھا۔

وہ انکھیوں سے اُس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اُس کے اِس مختلف رنگ و رُوپ سے لطف

اندوز ہو رہا تھا۔ فوٹو گرافر اپنے ماہرانہ انداز اور زمانے کی پرکھی آنکھوں سے ان دونوں کے مختلف پوز لے رہا تھا اور ان دونوں کی فیلنگز کو سمجھ رہا تھا۔

رخصتی ہو گئی...... ثنالیہ، عسفان کے گھر آ گئی۔ اُسی کمرے میں انزلہ اُسے بٹھا گئی کہ جو کمرہ اُسے کبھی بے حد پسند تھا۔ کیونکہ وہ عسفان سے منسلک تھا۔

نہایت نفاست سے سجائی گئی سیج تھی۔ فریش گلاب اور موتیے کے پھولوں کی لڑیاں۔ کیا یہی وصال کے پھول تھے؟...... شاید ہاں!

کارپٹ شاید تبدیل کیا گیا تھا لیکن گلاب کی پتیوں سے اُس کے رنگ کا پتہ نہ لگتا تھا۔ کونا کونا مہک رہا تھا۔ روشنی ہلکی لیکن پُرسکون تھی۔

اچانک اُس کا دھیان اِک مانوس آواز پہ گیا۔ یہ آسٹریلوی رنڑ طوطوں کی چہک تھی...... کھڑکی کے عین درمیان وہی سفید پنجرہ ٹنگا تھا اور اس کے اندر سبز اور سفید رنگ کے طوطوں کی جوڑی تھی۔ پنجرے کے اوپر بھی پھولوں کی لڑیاں سجی تھیں۔

اپنے بھاری بھرکم لہنگے کو سنبھالتی وہ اُن تک گئی اور اُنہیں حیرت سے دیکھنے لگی۔

''تمہیں یقیناً حیرت ہو رہی ہو گی کہ یہ کہاں سے آئے۔'' اپنے عقب سے اُسے آواز آئی۔ عسفان کب چپکے چپکے کمرے میں داخل ہو چکا تھا، اُسے پتہ ہی نہ لگا۔

''پنجرہ تو تم انزلہ کو دے گئی تھیں اور ایک طوطا میرے پاس تھا جو کہ میں امی کو دے گیا تھا۔ اور امی نے میری ہی طرح اُس کی دُلہن بھی ڈھونڈ لی۔ جب میں واپس آیا تو یہ مجھے بھی اسی طرح ہی ملا۔'' وہ پنجرے کی دوسری جانب کھڑا ہو گیا۔ اب ان دونوں کے درمیان وہ پنجرہ تھا، جس کی سفید جالی میں سے دونوں ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ بہت واضح طور پر بے حد قریب سے کچھ دیر دونوں ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ اور پھر عسفان نے ہولے ہولے اپنے ہونٹ کھولے۔

''مجھے تم سے محبت ہے۔'' اسی انداز میں پہلی بار عسفان نے اسی جگہ یہ بات کہی تھی۔ اور اس کے بعد کتنے فاصلے، کتنی دُوریاں ان کا مقدر بنیں۔ ثنالیہ مسکرا دی تھی۔

درمیان سے عسفان نے پنجرہ ہٹایا اور اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے سے قریب کر لیا۔ بہت قریب...... اور وہ بھی اپنے جیون کے ہر غم کو، ہر محرومی کو فراموش کر کے اُس کے کندھے سے لگ گئی تھی۔ وہ کندھا کہ جو اُس کا محافظ تھا، اُس کا اپنا تھا۔

ہجر کی راتیں ڈھل چکی تھیں۔ سُکھ کے سورج چڑھ گئے تھے۔

◆◆○◆◆

''ثنالیہ! بھئی جلدی کرو۔ ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔ کہیں بارات نہ آ گئی ہو۔'' عسفان نے باتھ روم کے دروازے پر ناک کرتے ہوئے کہا۔

''مما!...... جلدی کرو۔ انزلہ خالہ بارات کے ساتھ چلی نہ جائیں۔'' ننھا عدیل بھی باپ کی نقل اُتارتے ہوئے ناک کر رہا تھا۔ ثنالیہ اچانک نکلی۔ جلدی جلدی میں اپنی سبز ساڑھی کو سنبھالتی ڈریسنگ تک آئی اور میک اپ کٹ نکالی۔

''ایک تو تم دونوں باپ بیٹا ہر وقت جلدی مچاتے ہو۔ چلو جاؤ، جا کے گاڑی میں بیٹھو۔ میں بس پانچ منٹ میں آئی۔'' وہ جلدی جلدی جیولری پہن کر بولی۔

''پاپا! عورت کے پانچ منٹ مطلب؟''

''ایک گھنٹہ۔'' عسفان نے جواب دیا اور دونوں نے تالی ماری۔ ثنالیہ کو غصہ آیا۔

''جاؤ تم دونوں۔'' اُس نے گھورتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں چلے گئے۔ اُس نے تیار ہوتے ہوئے سوچا۔

''آج انزلہ کی شادی ہے۔ ہماری انزلہ کی۔ جس نے ہماری شادی کو ممکن بنایا۔ سچ، اگر وہ نہ ہوتی تو منزل شاید آسان نہ ہوتی۔ رب تعالیٰ بھی ناں کسی کسی انسان کے اندر اپنی محبت بھر دیتا ہے، جسے وہ دوسرے انسانوں میں بانٹتا رہتا ہے۔ اللہ کرے، انزلہ کو اپنے نصیب کی تمام خوشیاں عطا ہوں۔ آمین۔''

تیار ہو کے وہ کمرے سے نکلی تو موبائل پہ بیل ہوئی۔ انزلہ کے نمبرز بلنک کر رہے تھے۔

''کہاں ہو تم یار! جانتی ہو ناں کہ میں تمہارے بغیر ہال میں نہیں جاؤں گی۔ فوراً سے بھی پہلے آ جاؤ۔'' انزلہ چیخ رہی تھی۔

''آ رہی ہوں میری جان!...... آ رہی ہوں۔'' اُس نے جلدی جلدی فون رکھا اور گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کے بیٹھ گئی۔

زندگی میں اطمینان تھا تو زندگی کا ہر رنگ خوب صورت تھا۔ زندگی اِک نئی ڈگر، اِک موڑ پہ تھی۔ کوئی محرومی نہ تھی، کوئی ہجر نہ تھا۔ بس وصال ہی کے پھول تھے، جن کی خوشبو سے زندگی مہکی مہکی سی تھی۔



میرے ہاتھوں کی لکیروں میں سمانے لگے

"سنا تھا کہ محبت دبے پاؤں دل کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے، اتنی خاموشی سے کہ ہمیں خود اس کی آمد کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ ایسی طلسماتی چیز ہے کہ ہمیں اس کی موجودگی کا احساس تب ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے پنجے مکمل طور پر گاڑ چکی ہوتی ہے۔ کیا تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اریج!" شازمہ نے محبت کی طویل اور شاعرانہ وضاحت پیش کی تو اریج مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

"نہیں شازمہ! ہماری اریج اتنی شاعرانہ نہیں۔ یہ تو سائنٹفک مائنڈ رکھتی ہے اس کے لئے آنکھوں کا ملنا دو آئٹمز کے ملنے کے برابر ہے اور محبت کا ہونا سیل بننے کے۔" کرن کے کہنے پر شازمہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اریج جو اتنی دیر سے ان کی چھیڑ چھاڑ کو برداشت کر رہی تھی، اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"جانے دو بدتمیزو! تم لوگ دوست کہلانے کے لائق ہی نہیں۔ اتنی سچائی سے میں تمہیں اپنی فیلنگز بتا رہی ہوں اور تم لوگ اس قدر نان سیریس ہو۔"

اریج نے اپنی فائل، ہینڈ بیگ اور آنچل کو سمیٹا اور ہولے ہولے چلنے لگی۔ اُسے روٹھتا دیکھ کر شازمہ اور کرن بھی اُٹھ گئیں اور اسی کے ساتھ ہولے ہولے چلنے لگیں۔

"اچھا سوری یار! بتا، آگے کیا ہوا؟ وہ شرمیلا بندہ کچھ بولا بھی کہ نگاہِ یار کے سامنے ٹائیں ٹائیں فش ہوگیا؟" شازمہ نے شرارتی آنکھوں سے دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

"بول ناں، کیا ہوا ہے پھر مرزا وصی احمد کی داستانِ وفا کا؟" کرن نے لمبا نام لے کر کہا۔

"مقبرہ بنا اُس کی محبت کا۔ یار! تم لوگ سیریس ہی نہیں ہوتے ہو۔ میں اس سے بدلہ لینے کے چکر میں ہوں اور تم لوگ مجھے کوئی مشورہ نہیں دے رہے ہیں۔ بھول

گئیں اُس دن اُس مرزا صاحب نے جو بدتمیزی کی تھی، مجھے اپنی تذلیل کا بدلہ لینا ہے۔ اُس کے بولے ہوئے اس جملے کا حساب لینا ہے اس امیر سے۔ ابھی تو میں نے اُسے اپنی محبت کے جال میں پھنسانا شروع کیا ہے۔ جانتا نہیں وہ کہ اس کے مقابل بھی اریج کمال ہے۔ ہمیشہ ہر بازی جیتنے والی۔" اریج کی آواز میں بلا کا تفاخر تھا۔ مرزا وصی احمد کے گھمنڈ کو ختم کرنا تھا۔ آخر اُس نے جرم بھی تو ایسا کیا تھا۔ پہلی بار اریج کمال کو کسی نے ڈبیٹ میں ہرایا تھا اور نہ صرف ہرایا تھا بلکہ اسٹیج سے ٹرافی وصول کرنے کے بعد وہ اُس کی طرف آیا اور بڑی شان سے گردن تان کر بولا۔

"ہاں تو مس اریج کمال! جن عورتوں کے حقوق کے بارے میں آپ ڈائس پر کھڑے ہو کر چیخ چیخ کر بولیں اُنہی عورتوں کو ہرا دیا ہم مردوں نے۔ آپ کے لئے اب اچھا یہی ہو گا کہ آپ مجھ سے شادی کر لیں اور میری جیتی ہوئی ٹرافیوں کی صفائی کیا کیجئے گا اور پھر مجھ سے اپنے حقوق مانگئے گا۔" یہ کہہ کر وہ دوستوں کی سیٹیوں اور تالیوں میں اُسے دیکھتا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا اور اُسی دن سے اریج کمال نے اُس سے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

بہت سوچنے کے بعد اُس کے ذہن میں ایک حل نکلا۔ وہ یہ کہ وہ وصی احمد کو محبت کے جال میں پھنسا کر ہی اپنی تذلیل کا بدلہ لے سکتی ہے۔ اور پھر اُس نے محبت کی ایکٹنگ شروع کر دی تھی۔ بہت مہارت سے، بہت صفائی سے وہ وصی احمد کا تعاقب کرتی، اسے کتنی دیر دیکھتی رہتی۔ اُسے یہ احساس دلانے کے لئے کہ وہ اُسے پسند کرتی ہے اور وصی احمد کا پورا گروپ اریج کے اس والہانہ انداز پر دانتوں میں انگلیاں دیتا۔

پہلے تو خود وصی احمد نے اس بات کو سرسری کیا لیکن جب اُسے یونیورسٹی گئے ہوئے دو دن ہو چکے تھے، سخت بخار کی وجہ سے اُس نے چھٹی کی تھی۔ تبھی گھر آ کر کامران نے اُسے بتایا۔

"یار مرزا! وہ مغرور ڈبیٹر آج تمہارا پوچھ رہی تھی۔"

"کون مغرور ڈبیٹر؟" وصی احمد نے ذہن پر زور ڈالا۔

"یار! اتنے بھولے مت بنو۔ میں اریج کمال کی بات کر رہا ہوں، جسے چار سال میں پہلی بار کوئی ہرا سکا ہے۔ یار! لوگوں نے تو اُسے نہ صرف تقریر میں بلکہ دل سے بھی ہارتے دیکھا ہے۔ ہر وقت دیدار مرزا کے لئے تڑپتی رہتی ہے۔ آج تو بڑی پریشانی سے مجھ سے دریافت کیا کہ "وصی احمد دو دن سے نظر کیوں نہیں آئے۔" کامران نے لڑکیوں والی آواز بنا کر کہا تو وصی احمد مسکرا دیا۔

"اچھا، پھر تُو نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے تمہاری بیماری کے اوپر وہ مرچیں چھڑکیں، وہ مرچیں چھڑکیں کہ وہ قاتل نظر مقتول بن گئی۔ پریشانی کے وہ سائے لرزے اُس ماہ وش کے چہرے پر کہ میں آپ پریشان ہو گیا۔ پھر جب اُس نے اسی پریشانی سے تمہارا فون نمبر پوچھا تو مابدولت نے خود کو سنبھالتے ہوئے اُسے تمہارا سیل فون نمبر پکڑا دیا۔" کامران نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"کیا؟......تُو نے اُسے میرا سیل فون نمبر دیا؟......عجیب احمق انسان ہو یار! وہ فراڈ بھی تو کر سکتی ہے۔" وصی احمد اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔

"ارے نہیں یار! وہ تو تمہارے سحر میں، تمہاری زبردست پرسنالٹی کے جادو میں ایسی مبتلا ہوئی ہے کہ اُسے دن میں بھی تارے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ خود اپنا آپ بھول بیٹھی ہے پیارے! دیکھنا، کس طرح وہ اپنا اظہارِ محبت سیل پہ ایس ایم ایس میسج کر کرتی ہے۔" کامران مزے لے لے کر بولا۔ وصی احمد کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

"یار کامران! وہ بڑی گہری لڑکی ہے۔ اور ویسے بھی جو ڈیبٹر ہوتے ہیں ناں، اُن کی دو نہیں، دو سو آنکھیں ہوتی ہیں۔ وہ مخالف کی کمزوری کو بہت باریکی سے نوٹ کرتے ہیں اور پھر اسی جگہ گھاؤ لگاتے ہیں۔ اُس کی یہ ادائیں، یہ تیور محض دھوکا بھی تو ہو سکتا ہے۔" وصی احمد اپنی چھٹی حس اور عقل مندانہ نظریے کے زیرِ اثر بولا۔

"لیکن پیارے! یقین مان، اس طرح سے وہی لڑکی ری ایکٹ کر سکتی ہے، جو کہ عشق میں تن من تیاگ چکی ہو۔ مجھے تم سے زیادہ پتہ ہے۔ پوری سترہ لڑکیوں کو دل دے چکا ہوں میں۔" کامران نے اپنے کالر جھاڑے۔

"یار! عورت ذات بڑی الگ چیز ہوتی ہے۔ آج تک کوئی بھی تجھ جیسا مرد نہیں سمجھ پایا اس وجودِ زن کو۔ پچاس پچاس سال لوگ عورت کے ساتھ شوہر کی حیثیت سے گزار لیتے ہیں، پھر بھی نہیں سمجھ پاتے۔ یہ اریج کمال کی شخصیت بہت اُلجھی ہوئی ہے۔ میری تو سمجھ سے باہر ہے۔" وصی احمد کشن اُٹھا کر سیدھا بیٹھ گیا۔

"اچھا یار! تُو بیٹھ کر سوچ اپنی اریج کمال کے بارے میں۔ میں تو چلا گھر اپنے۔ اتنے اتنے دنوں بعد گھر جاتا ہوں کہ گھر والے صورت دیکھ کر کہتے ہیں، کون ہو تم۔" کامران یہ کہہ کر اُٹھا اور اپنے مخصوص انداز میں دوڑتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا اور وصی احمد اُس قاتلانہ خدوخال اور اداؤں کی مالک لڑکی کی سحر خیز باتوں میں کھویا رہا۔ کل تک جو آنکھیں

اُس کی طرف جان لینے کے سے انداز میں دیکھتی تھیں، آج وہی آنکھیں جان دینے پہ اُتر آئیں۔ بے یقینی کی دُھند وصی احمد کے چاروں طرف پھیلی تھی۔



بخار کی دوائیوں نے کچھ زیادہ ہی سلا دیا تھا۔ اگر سیل فون کی بیل نہ بجتی تو شاید ابھی اور سوتا رہتا۔ اُس نے بہ دقت تمام آنکھیں کھولیں اور سیل فون کا بٹن پش کیا۔

"ہیلو......وصی احمد اسپیکنگ۔"

"وصی احمد! طبیعت کیسی ہے؟" بہت میٹھا، بہت مدھم لہجہ تھا۔ وصی احمد کی آنکھیں کھل گئیں اور مانوس سی آواز پر اُٹھ کر بیٹھ گیا لیکن انجان بنتے ہوئے بولا۔

"کون بول رہا ہے؟"

"نہیں پہچانا؟ حیرت ہے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ ہماری آواز لاکھوں میں شناسا ہو گی۔ آپ نے تو بہت مایوس کیا مرزا صاحب۔ اریج کمال بات کر رہی ہوں۔" اُسی مدھرتا سے وہ بولی۔

"اوہ، آپ، دشمن جاں، کہئے کیسے یاد کیا؟" وصی احمد نہایت رُکھائی سے بولا۔

"یاد تو اُن کو کیا جاتا ہے جن کو لمحہ بھر کو بھول پائیں۔ آپ کوئی بھولنے والی چیز ہیں وصی احمد؟" یہ ذو معنی لہجہ دراصل انتہائی تنفر سے بولا گیا تھا۔

"خیریت؟ آج بڑی شیرینی ٹپک رہی ہے آپ کے لہجے سے اریج کمال صاحبہ! آج تک تو صرف نفرت ہی تھی مجھ سے۔"

"وصی احمد! آج تک ہم جب بھی ملے، صرف لڑے جھگڑے ہیں۔ کوئی اچھی بات ہم میں نہ ہوئی۔ کوئی اچھی یاد ہم نے نہ چھوڑی۔ لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ہمیں دوستی کر لینی چاہئے۔ دیکھیں وصی احمد! نہ میرے دل میں آپ کے لئے کوئی برائی ہے اور نہ آپ کے دل میں ہو گی۔ پھر لڑنے جھگڑنے سے کیا حاصل؟ چلیں پرانی باتوں کو فراموش کر کے نئے رشتے استوار کرتے ہیں۔" اریج نہایت پیار سے بولی۔

"میں آپ کو سمجھ نہیں پا رہا اریج! سچائی وہ تھی، جو آج تک میں نے دیکھی، یا یہ ہے جو آپ آج مجھے دکھا رہی ہیں؟" وصی احمد کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں اپنے آپ کو سمجھنے کا ہی تو موقع دے رہی ہوں آپ کو۔ مجھ سے ملئے، دوستی کیجئے، مجھ سے بات چیت کیجئے، پھر فیصلہ کیجئے گا کہ میرا سچا روپ کون سا ہے۔ ملنا چاہیں گے مجھ سے؟" اریج کمال کے اس سوال پر وصی احمد ایک دم چونکا، پھر مسکرا کر بولا۔

"ضرور......کہاں ملیں گی؟"

"کیفے جہان کے اندر آپ کا انتظار کروں گی۔ کل شام چھ بجے۔ آئیں گے آپ؟"

"ضرور آؤں گا۔" وصی احمد نے بے ساختہ کہا۔

اریج کمال نے فون رکھ دیا اور شازمہ اور کرن کو وکٹری کا نشان دکھایا۔



"یہ اتنی بن ٹھن کے کہاں جا رہی ہو اس وقت تم؟" سلمان نے سجی سنوری اریج کو دیکھا تو پوچھ لیا۔ سبز جارجٹ کے پرنٹڈ سوٹ پر بال کھولے، ہلکی جیولری پہنے وہ نہایت دلفریب لگ رہی تھی۔

"سلمان! ذرا مجھے صدر تک ڈراپ کر دو گے؟ بسوں میں چڑھ کر میں جانا نہیں چاہتی۔" اریج نے اپنے اکلوتے ماموں زاد کو اچانک آتے دیکھ کر کہا۔

"تمہیں کیا کام پڑ گیا صدر میں؟" وہ نہایت آرام سے صوفے پر ڈھے گیا۔

"تم سیدھی طرح بتاؤ، تم مجھے ڈراپ کر رہے ہو کہ نہیں؟ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ جلدی جلدی سینڈل پہنتے ہوئے بولی۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ کسی سیمینار میں پہنچنا ہے کیا مہمانِ خصوصی کو؟" سلمان نے اُسے چھیڑا۔ اُس نے اس کی کوئی پروانہ کی اور ہینڈ بیگ اُٹھا کر کمرے سے جانے لگی۔

"ماما! میں باہر جا رہی ہوں۔ ایک گھنٹے تک آ جاؤں گی۔" والدہ کو مطلع کرنے کے بعد وہ جلدی جلدی سیڑھیاں اُترنے لگی۔ ابھی اُس نے عجلت میں گیٹ کراس کیا ہی تھا کہ سلمان اپنی بائیک اسٹارٹ کرتا ہوا اُس تک آ گیا۔

"بیٹھ جاؤ شرافت سے۔" وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"اُس وقت کیوں غرور دکھا رہے تھے، بدتمیز انسان؟" اریج بنا کسی احتجاج کے بیٹھ گئی۔

"بس ایسے ہی، تمہیں چھیڑنے میں مزا بہت آتا ہے۔ تمہارا غصیلا چہرہ بہت دلفریب لگتا ہے۔" وہ بائیک کو اِدھر سے اُدھر ہلکورے لینے کے سے انداز میں لہرانے لگا۔ "ویسے ایک بات کہوں اریج کمال! اگر تم اس طرح ہر وقت غصے میں منہ نہ پھلاؤ تو تمہارا چہرہ اچھا خاصا خوب صورت ہے۔ بس ذرا ناک اونچی ہے اور ٹیڑھی بھی۔" سلمان نے اُسے چڑانے کے لئے مزید گرہ لگائی۔

"اوشٹ اپ سلمان!...... خاموشی سے ڈرائیو کرو۔ کہیں اللہ کی پیاری نہ بنا دو مجھے۔" وہ اُس کی چوڑی پیٹھ پر مُکا رسید کرتے ہوئے بولی۔

شہر کی صاف ستھری سڑکوں سے دوڑتی دوڑتی بائیک صدر بازار کی مصروف اور تنگ سڑکوں پر آ چکی تھی۔ شام کا وقت ہونے کے باوجود بھی بازار خاصا بھرا ہوا تھا۔ ایک مارکیٹ کے سامنے اریج نے بائیک رُکوائی۔

"یہاں؟...... لیکن یہاں تو صرف جیولری کی دُکانیں ہیں اریج!" سلمان نے اردگرد کی دُکانوں کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہیں اس سے کیا؟ میں چاہے جیولری کی دُکانوں سے شاپنگ کروں یا برتنوں کی۔ تم سے صرف میں نے لفٹ مانگی تھی، مشورہ نہیں۔" سختی سے یہ کہتی اریج اپنا بیگ سنبھالتی اُتری اور جیولری کی جگمگاتی دُکانوں کی قطاریں عبور کرتی لوگوں کی بھیڑ میں کہیں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ سلمان اُسے جاتا دیکھتا رہا۔ پھر کافی دیر کے بعد اُس نے اپنی بائیک اسٹارٹ کی اور واپسی کا راستہ لیا۔

وہ کافی دیر دُکانوں کی قطاروں کو عبور کرتی پیدل چلتی کیفے پہنچی تھی۔ کیفے شہر کے بیچوں بیچ لیکن بازار سے ہٹ کر تھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو چھ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ جلدی جلدی ٹیبل سلیکٹ کرنا چاہی تو ایک ٹیبل پر مرزا وصی احمد کی موجودگی نے اُسے چونکا دیا۔ وہ خود کو سنبھالتی اور اپنے بھرپور سراپے کا جادو جگاتی اُن مخصوص ٹیبل تک پہنچی۔ نظروں میں محبت کی روشنی جگمگا کر اُس نے وصی احمد کو دیکھا اور بڑے معصومانہ انداز میں مسکرا دی۔ اُس کی یہ ادا وصی احمد کو لرزا گئی۔ حالانکہ وہ ابھی تک شک کی کیفیت سے دوچار تھا، اریج کمال کے اس روّیے کے متعلق۔

"وقت کے پابند ہو وصی احمد!" وہ مخصوص ادا سے مسکرائی۔

"میں تو سمجھا تھا کہ آپ میری منتظر ہوں گی اریج کمال! لیکن شاید انتظار کرنا عورتوں کی خوبی نہیں۔" وصی احمد نہایت کھرے انداز میں بولا۔

"خیر چھوڑیں اس بحث کو۔ یہ بتائیں، اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ کافی کمزور ہو گئے ہیں دو ہی دن میں۔ کیسے روگ لگا بیٹھے؟" اریج اپنا پرس رکھ کر نہایت بے تکلفی سے بولی، جیسے عرصے سے دونوں میں دوستی قائم تھی۔

"آپ کو یہ جان کر شاید دُکھ ہوگا کہ میں اب کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" وہ گہری نظروں سے اُسے دیکھ کر بولا۔

"مجھے آپ نے ہمیشہ غلط سمجھا ہے اور آج بھی غلط ہی سمجھ رہے ہیں مرزا صاحب! میری آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ آپ ایک اچھے آدمی ہیں، اچھی فیملی سے تعلق رکھتے

ہیں، میرے کلاس فیلو ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔" وہ کمال مہارت سے اُسے یقین دلانے لگی۔

اس لمبی تمہید، تعریف پر وصی احمد مسکرا دیا۔ یہ مسکراہٹ بہت گہری اور تمسخرانہ تھی، جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ آنکھیں اور یہ نظرِ کرم۔

"بس بس، اریج کمال! مجھے اتنی حیرت میں مبتلا نہ کریں۔ آپ کی زبان اور میرے لئے اتنی میٹھی۔ پہلے فون پر اتنی اچھی طرح سے میری طبیعت پوچھنا، پھر یہاں پر بلانا اور اب اتنے اچھے الفاظ میں میری تعریف۔ پلیز اریج کمال! پلیز۔ آئی ایم اے نارمل ہیومن۔ مجھے سر کے بل آسمان تک نہ اُٹھائیں۔" وہ نہایت صفائی سے اپنے خدشات کا اظہار کرنے لگا۔ "یہ بتائیں، آپ لیں گی کیا؟ چائے یا کافی؟" اُس نے فوراً ہی بات کا رُخ بدلا۔

"نہیں، نہیں مرزا وصی احمد! میں نے آپ کو مدعو کیا ہے تو آدابِ میزبانی بھی مجھے ہی نبھانے دیں۔ ویٹر!" وہ اُنگلی کے اشارے سے ویٹر کو بلانے لگی۔ باوردی ویٹر ٹیبل کے قریب آیا۔ "اب بتائیں، کیا منگواؤں آپ کے لئے؟"

"کافی۔" وہ بے تکلفاً بولا۔

"ایک کافی اور میرے لئے ایک فریش لیمن اسکوائش لائیں۔ ساتھ میں دو سینڈوچ بھی۔" وہ مینو کارڈ سے آرڈر سلیکٹ کر کے ویٹر کو بلانے لگی اور باوردی ویٹر روبوٹ کی طرح رسمی حرکات کر کے چلا گیا۔

"ہاں تو اریج! کیوں بلایا تھا آپ نے مجھے؟" وہ باتوں باتوں میں اپنے مطلب پر آ گیا۔

"کیوں؟...... کیا میں اپنے روّیے کی معافی مانگنے کے لئے، پرانی رنجشوں کو مٹانے کے لئے یا پھر نئی دوستی کا نیا تعلق استوار کرنے کے لئے آپ کو بلا نہیں سکتی؟" اُس کی آنکھوں میں دل کے نرم کونوں کی ترجمانی تھی۔ کچھ ایسے جیسے کہ محبتوں کی کونپل اندر کہیں پھوٹ پڑی ہو۔

"روّیے کی معافی، رنجشوں کی تلافی اور دوستی؟ اریج کمال! میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔ یہ وہ لڑکی کہہ رہی ہے، جسے اپنی جیت پر غرور ہے۔ جس کی گردن فتح کا بوجھ اُٹھانے کی عادی ہو چکی ہے۔" اس مجسّمے سے انسان پر ابھی تک بے یقینی چھائی تھی۔ ویٹر ٹرے اُٹھائے اُن کی ٹیبل تک آیا۔ کافی اور اسکوائش وہ ٹیبل پہ سجا کے چلا گیا۔

"سچ کہوں وصی احمد! تو یہ غرور اب ٹوٹ چکا ہے۔ فتح کے بوجھ سے تنی گردن کو اُس دن آپ کی جیت نے ہرا دیا ہے۔ جھکایا تو نہیں، لیکن شکست ضرور دی ہے۔ لیکن یقین مانیں، یہ شکست میرے لئے کسی شرمندگی اور دُکھ کا باعث نہیں۔ یہ شکست میرے لئے ایک ناقابلِ فراموش احساس لائی ہے وصی احمد! اگر میں اُس دن ہارتی نہیں تو شاید میں کبھی اپنے دل کو جتا نہ پاتی۔ اور اگر میرا دل نہ جیتتا تو مجھ پر یہ کبھی نہ کھلتا کہ......" وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

"کہ؟" وصی احمد منتظر تھا۔

"کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے وصی احمد!" اُس نے انکشاف کر دیا اور وہ کافی پینے کے لئے منہ تک لایا کپ تھامے، گُنگ سا اُسے دیکھتا رہ گیا۔ اریج کے پھول سے گال بلش ہو کر سرخ پڑ گئے تھے۔ روشن آنکھوں کے اوپر پلکوں کی گھنی جھالر گر پڑی تھی۔ یہ لمحہ اقرار کا تھا یا تکرار کا، وصی احمد جان ہی نہ پایا۔ وہ تو اس اچانک دھماکے پر حیران و پریشان تھا۔

"آپ...... آپ ٹھیک تو ہیں اریج کمال؟" وہ قدرے بے یقینی سے بولا۔

"کمال ہے مرزا صاحب! آپ کو یقین کیوں نہیں آتا؟ اتنی دیر سے میں اپنی غلطی کا اعتراف کر کے آپ کو بتا رہی ہوں کہ میں بدل چکی ہوں اور سب سے بڑھ کر میں نے اظہارِ محبت بھی کر لیا، جو کہ میں نے کبھی کسی کے آگے نہیں کیا۔ آپ کو ابھی تک یقین نہیں آیا۔ کیا میں اپنا دل چیر کے دکھاؤں کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے؟" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"اریج!" وہ حیرانی سے دیکھنے لگا۔

"ہاں وصی احمد! دو دن سے آپ کی طبیعت کی خرابی کا سن کر میں کتنی بے چین رہی، اپنے پچھلے روّیے پر کتنا روئی۔ آپ سے مجھے محبت ہو گئی ہے۔ آپ میرے اردگرد رہنے لگے ہیں وصی احمد مرزا!" یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھیں چھلکنے لگیں اور وہ اپنا آپ سنبھالتی، اپنا بیگ اُٹھا کر کیفے کی حدود پھلانگ کر دروازہ کراس کر گئی۔ وصی احمد اُس کے اس اجنبی روّیے پر کتنی دیر حیران سا بیٹھا رہا۔



"پیار بھی عجیب شے ہے
اضطرار میں مضطر
انتشار سے خالی
اختیار سے باہر"

"یار مرزا! مان لے، تیری صورت اُس کے من مندر میں سما چکی ہے اور اُس کے چاروں طرف تیرے ہی نام کی گھنٹیاں کھن کھن بج رہی ہیں۔ اب تُو اپنی توجہ اُس پر مبذول کر دے اور اُس کی مانگ میں ستارے بھر دے۔" صائم نے پہلے نظم کا بیڑہ غرق کیا اور پھر بڑی ادا سے بولا۔

"میں تو اُسے اتنے دنوں سے یہی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں، مگر یہ نواب ابن نواب سمجھے، تب ناں۔" کامران نے اپنے شکوؤں کا ڈبہ کھولا۔

"لیکن یار! وہ لڑکی میری سمجھ سے باہر ہے۔ اُس کا وہ دلربا انداز، وہ والہانہ پن، وہ مجذوبوں کی سی باتیں اور پھر وہ دیوانہ وار اظہارِ محبت، وہ آنسو، کیا وہ سب جھوٹ تھے یا پھر میرا دل ہی بے یقینی کے اضطراب کی وجہ سے اُسے محض دھوکا سمجھ رہا ہے؟" وصی احمد ہاں اور ناں کے بیچ لٹکا ہوا تھا۔

"ابے تُو پاگل ہے مرزا! کوئی بھی لڑکی اور خاص طور پر اریج کمال جیسی اکھڑ اور مغرور لڑکی کسی کو اس طرح بلا کر اظہارِ محبت اور اقرارِ شکست نہیں کر سکتی۔ تُو اُس کا یقین کر لے۔ وہ بے چاری ماری گئی ہے۔" سنجیدہ سے دوست شہروز نے اُسے پیار سے سمجھایا۔

"میرا خیال ہے، میں خود کو کچھ وقت دیتا ہوں اور اُسے بھی۔ اگر وہ فراڈ ہو گی تو کچھ ہی دنوں بعد اُس کا یہ جنوں جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔" وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے۔



اُدھر اریج اپنی سہیلیوں کو اپنی زبردست ایکٹنگ اور اُس کے تاثرات کے قصے سنا رہی تھی۔

"پتہ ہے، جیسے ہی میری آنکھوں سے آنسو چھلکے، اُس کے ہاتھ میں کافی کا کپ ڈگمگانے لگا۔ وہ تو کافی پینا ہی بھول گیا تھا۔ میری باتوں نے اُسے مکمل طور پر اُلو بنا دیا تھا۔" یہ کہہ کر اُس نے زوردار قہقہہ مارا۔ سہیلیاں بھی ہنس پڑیں۔

"ہائے، بے چارہ۔ اریج! کہیں وہ سیریس نہ ہو جائے۔" کرن اپنا خدشہ ظاہر کرنے لگی۔

"پاگل! یہی تو میں چاہتی ہوں کہ وہ سیریس ہو جائے۔ میری محبت میں ایسے مبتلا ہو کہ تمام کی تمام کشتیاں جلا دے۔ ہر طرف اُسے میرا چہرہ نظر آئے۔ اُس کی سماعتیں میری ہی آواز سنیں، میری ہی باتوں کی رم جھم اُس کے کانوں میں رس گھولے۔ وہ میرے نام پہ

سانس لے۔ وہ میری محبت میں اتنا آگے جائے کہ اُسے بدنامی اور بربادی کا کوئی ہوش نہ ہو۔ اور جب وہ بالکل بے بس ہو جائے تو تب میں اُسے اُس کی اوقات یاد دلاؤں کہ وہ میرے لئے صرف ایک مخالف ساتھی ہے اور مرد ہے۔ جسے میں نے اپنے حُسن اور دماغ کے بل بوتے پر ہرایا ہے۔ اور پھر اُسے یقین دلاؤں گی کہ وہ اس قابل ہے ہی نہیں کہ میں اُس سے شادی کر کے اُس کی جیتی ہوئی ٹرافیاں صاف کروں۔" اریج بڑے فاتحانہ انداز میں بولی۔

"اس لڑکی کے ارادے تو بڑے خطرناک لگ رہے ہیں مجھے۔ خدارا! اُس بے گناہ پر رحم کرو۔ اُسے اتنا بھی مت پاگل کرنا کہ وہ تمہیں گنوانے کے غم میں خودکشی کر لے۔" شازمہ نے ایک اور پہلو سامنے رکھنا ضروری سمجھا۔

"تم فکر مت کرو۔ وہ اتنا بھی بہادر نہیں۔ بس تم لوگ دیکھتی جاؤ میرے ماہرانہ انداز اور اُس کی ناتجربہ کار سوچیں۔" اریج نے بڑے غرور سے کہا اور آنے والے دنوں کی پلاننگ کرنے میں جت گئی۔



"زندگی بھی کبھی کبھی کیسے رُوپ دکھاتی ہے۔ جس چیز کو ہم اپنی زندگی کی حقیقت سمجھ کر اُسے اپنانے کی تگ و دو میں دن رات ایک کر دیتے ہیں، وہی حقیقت کچھ اس طرح کی ٹھوکر لگا دیتی ہے کہ ہم گنگ کھڑے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اور کبھی وہ چیز ہمارا خواب نکلتی ہے، جسے ہمیشہ ہم نفرت کی نگاہ سے ہی دیکھتے آتے ہیں۔ ہماری نظریں اتنا دھوکا کیوں کھاتی ہیں وصی احمد؟" اریج اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں وصی احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی اور وصی احمد نے بھی اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ مسلسل اسی تگ و دو میں تھا کہ کہیں سے کوئی مکر کا سایہ، کوئی جھوٹ کی لہر کوند کے آئے اور اس کے فریب کا سارا کھیل ختم کر دے۔ لیکن اُسے اتنی کوشش کے بعد بھی ایسا کوئی نشان مل نہ پایا تھا۔

"مجھے ایسا کیوں لگتا ہے وصی احمد! کہ تمہیں میری تمام کی تمام باتیں جھوٹ لگتی ہیں۔ تم مجھے، میری باتوں اور میرے پیار کو چھلاوا سمجھتے ہو؟" وہ اس کھوئے کھوئے انداز والی آنکھوں میں نظریں گاڑے بولی، جن آنکھوں میں اتنے دنوں کی کوشش کے باوجود بھی محبت اور دیوانے پن کا کوئی عکس نظر نہ آیا تھا۔

"میرے پاس تمہارے ڈھیر سارے سوالوں کے جوابات نہیں اریج!" وہ صاف مکر

'کیوں، ڈائس پہ کھڑے ہو کر تو خوب تڑتڑا کے جواب دیئے تھے میرے مخالف۔ اب کیا ہو گیا؟' وہ دل ہی دل میں سوچ گئی، پھر کچھ سوچ کر بولی۔

''محبت کے سوال کوئی اتنے پیچیدہ بھی نہیں ہوتے کہ ان کے جواب ڈھونڈنے میں اتنا عرصہ لگ جائے۔ محبت کوئی اتنی بھید بھری چیز نہیں۔'' وہ زبردستی مسکرائی۔

''اپنی تعلیم پہ بھی توجہ دو پاگل لڑکی! فائنل ایگزام سر پر ہیں، کہیں اس میں بھی بازی مار نہ جاؤں۔'' وصی احمد نے بھی مسکرانے کی ایکٹنگ کی۔

''اس شرط پہ کھیلوں گی پیا پیار کی بازی
جیتوں تو تجھے پاؤں، ہاروں تو پیا تیری''

اُس نے بڑے دیوانے پن سے یہ شعر پڑھا اور وصی احمد ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گیا۔

اریج کے صداقت سے پُر رویے سے وصی احمد کا دل موم کی طرح پگھلنا شروع ہو گیا تھا۔ اُس نے ہر زاویے سے اُسے پرکھا، ہر طرح سے اُسے جانچا، کتنے ہی دن اُس سے ملاقات ترک کی، کتنے دن اُس سے سختی برتی لیکن وہ محبت کی چٹان ٹوٹنے میں نہ آئی۔ اُس کے اس طرح کے جذبوں نے وصی احمد کے دل میں بھی محبت کا ایک اشتعال سا برپا کر دیا تھا۔ وہ پسیج چکا تھا۔ اور پھر اریج کا معصوم حُسن، دلربا چہرہ، جادوئی آنکھیں پتھر کو بھی موم کر سکتی تھیں۔ ایسے میں وصی احمد کے دل میں یہ خوش گمانی جنم لے چکی تھی کہ اریج کمال جیسی پری پیکر لڑکی اُس سے دیوانہ وار محبت کرتی ہے۔ ایسی محبت جو کہ اُس کی کرختگی سے سوختہ جاں نہیں بن سکتی۔

اریج کمال کی محبت نے وصی احمد کے لئے اور کوئی راستہ نہ چھوڑا تھا۔ اُس نے اپنی سچائی اور پیار کا ایسا جال بچھایا کہ وصی احمد مرزا کہیں فرار پا ہی نہ سکا، کہیں پوشیدہ ہو ہی نہ سکا۔ وہ نئے راستے کھوجتی گئی اور وصی احمد ان راستوں پر چلتا گیا۔ وہ محبت کی چاندنی بکھیرتی گئی اور وصی احمد اس چاندنی میں اپنی منزل کا سراغ ڈھونڈتا گیا۔ محبت کی کونپل دل میں پھوٹ چکی تھی۔ وفا کا پروانہ سر اُٹھا چکا تھا۔ اریج کے معصوم عشق نے سارے شک و شبہات کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ اب اریج وصی احمد کے لئے اِک چالباز، کرخت لڑکی نہیں بلکہ نازک جذبات و احساسات سے گندھی اِک پیاری سی لڑکی تھی۔ وہ کتنا بے قرار تھا اس وقت کے لئے کہ جب وہ اریج کے سامنے اپنا دل کھول کر کہے کہ بس، اب اور امتحان نہیں لیا جاتا تمہاری صداقتوں کا۔ تمہارے دیوانے پن نے وصی احمد کو پگھلا دیا۔ اب اور ستایا نہیں جاتا تمہیں۔ تمہاری محبتوں نے ہر غرور کو پاش پاش کر دیا ہے۔ تم نے اپنی محبت کا جادو

کچھ اس طرح بکھیرا ہے کہ اب میری محبت تمہیں تڑپتا نہیں دیکھ سکتی۔ آؤ کہ ہر رنجش بھلا کر نئی چاہتوں کے نئے راستوں پر اپنے قدم رکھیں۔ آؤ کہ خواہشوں کے چراغ جلائیں۔ آؤ کہ ہم ایک دوسرے کے بن جائیں۔''

دو دن سے وہ کالج نہیں آئی تھی اور اُس کی بے قراری زوروں پر تھی۔ نہ اُس نے کوئی فون کیا، نہ کہیں بات کی۔ ایک خدشے نے سر اُٹھایا، کہیں وہ ناراض تو نہیں ہو گئی؟ محبت میں محبوب کی ناراضگی موت کی سی لگتی ہے۔ کہیں میں نے اُسے بد دل تو نہیں کر دیا اپنی طرف سے؟ کہیں میری کرختگی اور سوختہ روی نے اُس کے دل کو ٹھیس تو نہیں دیا؟ ....

انہی خدشوں کا دامن تھامے وہ اریج کی سہیلیوں شازمہ اور کرن کی تلاش میں نکل آیا۔ کلاس کے بعد وہ دونوں سیڑھیوں پر خوش گپیوں میں مصروف نظر آئیں۔ وہ جلدی سے اُن کے پاس پہنچا اور سلام و جواب کے بعد مقصد کی طرف آیا۔

''اریج دو دن سے نظر نہیں آئی۔ خیریت تو ہے؟'' وہ بڑے پریشان کن لہجے میں بولا۔ آنکھوں کی پریشانی نے دونوں لڑکیوں کو محظوظ کر دیا۔

''اریج بے چاری تو پچھلے تین دنوں سے شدید بیمار ہے۔ دو دن ہسپتال میں رہی ہے۔'' کرن دُکھ بھری شکل بنا کے بولی۔

''کیا ہوا ہے اُسے؟'' وصی احمد چاہ کر بھی اپنی پریشانی چھپا نہ پایا۔

''اُسے بہت شدید ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے۔'' کرن نے جلدی سے کہہ دیا۔

''نہ، نہ.......اصل میں تین دن پہلے اُسے پیٹ میں شدید درد ہو گیا تھا۔ الٹرا ساؤنڈ کرانے پر پتہ چلا کہ اُسے اپینڈکس ہو گیا ہے، بہت خطرناک۔ جو اگر پھٹ گیا تو وہ مر بھی سکتی ہے۔'' شازمہ نے اور بڑی بیماری بیٹھے بیٹھے تیار کر لی۔

''اپینڈکس؟'' وصی احمد کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''فوری طور پر اُس کا آپریشن کرنا پڑا۔ پرسوں رات اُس کا آپریشن ہوا۔ ہم دونوں موجود تھیں ہسپتال میں۔ بے چاری بے ہوشی میں بھی وصی احمد، وصی احمد پکارتی رہی۔'' شازمہ کی اداکاری زبردست تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے اُس کی؟ وہ ٹھیک تو ہے ناں؟'' آخری جملے نے وصی احمد کے دل میں اریج کمال کی محبت کئی گنا زیادہ بڑھا دی تھی۔

''مت پوچھیں اُس کی طبیعت۔ گرم دوائیوں اور ڈرپ کی بوتلوں کی وجہ سے اُسے ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے۔ اُوپر سے کھانا پینا بھی بند ہے۔ صرف سُوپ اور کھچڑی کھا سکتی ہے۔

آج اُسے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا ہو گا لیکن علاج ابھی اور چلے گا۔'' کرن نے وصی احمد کے غم میں اور اضافہ کر دیا۔

''میں اُس سے مل سکتا ہوں؟'' وصی احمد اضطراب زدہ چہرہ بنا کر بولا۔

''ہاں، ہاں...... کیوں نہیں۔ آج شام آپ میرے ساتھ چلئے گا۔ مل لیجئے گا اُس سے۔'' شازمہ نے فوراً پیشکش کر دی۔

''اوکے شازمہ! میں آج شام تمہیں تمہارے گھر سے پک کر لوں گا۔ اور پلیز! آپ دونوں اریج کا خیال رکھئے گا۔ میرے لئے وہ بہت قیمتی ہے۔'' دُکھ بھرا لہجہ، مضطرب آنکھیں، افسردہ چہرہ۔ یہ سب شازمہ اور کرن کو ہنسنے پر مجبور کر رہا تھا۔ شازمہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

یہ کہہ کر وہ جیسے ہی گیا اور نظروں سے اوجھل ہوا، شازمہ اور کرن نے زوردار قہقہہ لگا کر اتنی اچھی اداکاری پر ایک دوسرے کو داد دی۔



''کیا؟...... اپینڈکس کا آپریشن؟...... یار! میں نے تم لوگوں کو کوئی چھوٹی سی خطرناک بیماری کا نام لینے کو کہا تھا۔ یہ اتنی خطرناک بیماری کہاں سے پیدا کر دی تم لوگوں نے مجھ میں؟ اور بیٹھے بٹھائے آپریشن بھی کروا لیا۔'' اریج، شازمہ اور کرن کی زبانی ساری روداد سن کر اُچھل پڑی۔

''میں نے نہیں، شازمہ نے یہ بیماری گھڑی تھی۔'' کرن صاف مکر گئی۔

''نہیں اریج! کرن نے صرف ٹائیفائیڈ کہا تو میں نے سوچا، یہ تو معمولی سا بخار ہوتا ہے، اس لئے میں نے اپینڈکس کا کہہ دیا۔ ویسے یار! جب میں نے اُسے بتایا کہ تم آپریشن کے بعد بے ہوشی میں اُسی کا نام پکار رہی تھیں تو بے چارہ بے قرار ہو اُٹھا۔ اضطراب اُس کی رگ رگ میں دوڑ گیا۔'' شازمہ نے وضاحت سے بتایا تو اریج فاتحانہ خاموشی سے مسکرا دی۔

''ہاں اریج! اتنی پریشان سی شکل بنائی اُس نے اور پوچھا۔ ''میں اُس سے مل سکتا ہوں؟'' کرن نے لاچار سی شکل بنا کر وصی احمد کی نقل اُتاری تو اریج اور شازمہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''اچھا، وہ تو سب ٹھیک ہے...... اب یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ دو دن سے گھر میں پڑی بور ہو رہی ہوں۔ اور یہ اپینڈکس کے مریض کیا کرتے ہیں؟ کیسے چلتے ہیں؟

کیسے لگتے ہیں؟'' اریج نے ایک ساتھ کئی سوال پوچھ لئے۔

''اریج! مجھے زیادہ تو نہیں پتہ، لیکن میری کزن آمنہ کا آپریشن ہوا تھا تو وہ پیٹ کے دائیں طرف ہاتھ رکھ کر دھیرے دھیرے چلتی تھی، اور بس۔'' کرن نے معلومات فراہم کیں۔

''ارے، تم اپنے اُس ڈاکٹر کزن سے کیوں نہیں پوچھ لیتیں؟ آخر اُس کی ڈاکٹری کب کام آئے گی؟ بلکہ تم اُسے نقلی ڈاکٹر بنا کر یہاں بلا بھی سکتی ہو۔'' شازمہ نے ایک اور آئیڈیا دیا۔

''کون، سلمان؟ ارے ہاں، مجھے تو اس کا خیال ہی نہیں آیا۔ میں ابھی اُسے بلاتی ہوں۔'' اچھا آئیڈیا ملتے ہی اُس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ دوڑ کر کارڈلیس فون اُٹھایا اور سلمان کا سیل فون نمبر ڈائل کیا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے سلمان کی آواز آئی۔

''سلمان! میں اریج بول رہی ہوں۔''

''بولئے، بولئے اریج کمال صاحبہ! کہئے، کیسے مزاج ہیں؟'' سلمان نے بڑی خوش دلی سے کہا۔

''سلمان! آج مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔ پلیز آ جاؤ۔'' اریج نے نہایت پیار سے کہا۔

''کیوں، خیریت؟'' سلمان کو حیرانی ہوئی۔

''سب بتا دوں گی۔ پہلے مجھے اپینڈکس کے آپریشن کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرو۔ کب ہوتا ہے، کیسے ہوتا ہے، کتنی دیر میں اس کا آپریشن ہوتا ہے، مریض کی شکل کیسی ہو جاتی ہے، کہاں درد ہوتا ہے اور کس طرح کی دوائیاں کھلائی جاتی ہیں؟'' اریج نے ایک ہی سانس میں سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

''اپینڈکس...... اپینڈکس ایک آنت کو کہتے ہیں جو کہ ہر کسی کے معدے کے ساتھ ہوتا ہے۔ کسی بھی وجہ سے یہ پھول سکتا ہے اور فوراً اسے آپریٹ کر کے نکالنا ہوتا ہے۔ مائنر آپریشن ہوتا ہے، آدھے ایک گھنٹے کا۔ کھانا پینا بند کرا دیا جاتا ہے۔ ڈرپس لگتی ہیں، انجیکٹ کیا جاتا ہے۔ شکل مریض کی کمزور سی، مرجھائی سی ہو جاتی ہے۔ پیٹ کے نچلے حصے میں بائیں طرف درد ہوتا ہے۔ دوائیاں درد کو روکنے کی اور طاقت کی کھلائی جاتی ہیں۔'' سلمان نے اسی رفتار سے اریج کے ہر سوال کا جواب دے دیا۔

"اچھا، اب ایک گھنٹے تک میرے گھر پہنچو۔ ڈرپس، انجکشن، درد کی دوائیوں، سُوپ کے ساتھ۔ اور ہاں، اپنا وائٹ گاؤن اور اسٹیتھیسکوپ بھی لیتے آنا۔ آج ہی مجھے تمہاری ڈاکٹری کی ضرورت ہے۔" اریج نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا اور شازمہ اور کرن کو وکٹری کا وی دکھایا۔



وصی احمد مرزا نے چھوٹے سے نفیس گھر کے زینے پھلانگے، سیدھے ہاتھ پر بنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ سامنے بستر پر نیم دراز سراپے کو دیکھا۔ کملایا چہرہ، مرجھایا سراپا، پپڑیوں میں لپٹے شربتی ہونٹ، آنکھوں کے گرد سیاہ ظالم حلقے، بکھرے بال، بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑی ڈھیروں دوائیاں، سیرپ کی بوتلیں اور گولیوں کے پتے۔ دائیں مخروطی ہاتھ میں کینولا کی بے دردسوئیاں اور اُن سے جڑی ایک شفاف ڈرپ کی بوتل۔ اس نیم تاریک کمرے کا ماحول کتنا مرجھایا مرجھایا سا تھا۔ کتنا بکھرا بکھرا سا تھا۔ وصی احمد کمرے کی حدیں پار کرتا اُس چھوٹے سے بیڈ کی طرف آیا۔ ساتھ ہی رکھی کرسی پر ہولے سے بیٹھ گیا۔

"اریج!" اُس نے قدرے مدھم لہجے میں اس نام کو آواز دی۔ اُس کے اس طرح پکارنے پر اریج نے ہولے ہولے آنکھیں کھولیں۔ بڑی بڑی کشادہ آنکھوں میں کتنے خواب جگمگاتے تھے، کتنے رنگ مسکراتے تھے۔ ایسے رنگ، جو قسمتوں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیں۔ ایسے رنگ، جو اُداسیوں کا احاطہ کر کے انہیں مسکرانے پر مجبور کر دیں۔ ایسے رنگ، جو وفاؤں کو مجبور کر دیں، آپ کی راہوں میں بچھ جانے کو۔

"وصی احمد!...... آپ آ گئے وصی احمد؟ میں...... میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ آپ نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟" اریج کے ہونٹ اس انداز سے ہل رہے تھے کہ گویا وہ زبردستی بولنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"مجھے آج ہی پتہ لگا اریج! یقین مانو، آج ہی کرن اور شازمہ سے پوچھا تھا۔ اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" وصی احمد نے اپنا ہاتھ اُس کی پیشانی پر رکھ دیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ دو ہونٹ ہلکے ہلکے کھلنے لگے۔

اُس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
رُوح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

"زندہ ہوں...... پتہ نہیں کس طرح بچ گئی۔ کوئی ضرورت تو نہ تھی سانسوں کی۔ پتہ نہیں خدا نے کیوں واپس لوٹا دیں۔" ان جملوں کی اُداسی نے وصی احمد کو اندر تک لرزا دیا۔

"ایسا کیوں کہتی ہو اریج؟...... پلیز! ایسا مت کہو۔ دُکھ ہوتا ہے مجھے۔" وصی احمد نہایت پیار سے گویا ہوا۔

"کیوں، آپ کو کیوں دُکھ ہوتا ہے وصی احمد؟ آپ کو جذبات کی قدر کرنی آتی ہے؟ آپ کو وفاؤں کا جواب دینا آتا ہے؟ آپ تو مندروں میں سجی اس مورتی کی طرح ہیں کہ جن کے آگے مانگنے والے مانگ مانگ کر چلے جاتے ہیں لیکن اس پتھر کے وجود پر اثر نہیں ہوتا۔ جب آپ کسی کے پیار کو نہیں سمجھ سکتے تو کسی کے درد کو کیا خاک سمجھیں گے؟" اریج نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں الفاظ ادا کیے اور جذباتی داؤ مارا۔

"ایسی کوئی بات نہیں اریج! ایسا کیوں سوچتی ہو تم؟ اگر میں تمہاری وفاؤں کو نہیں سمجھتا تو تمہاری تکلیف پہ اتنا بے قرار بھی نہ ہوتا۔ اگر مجھے تمہاری چاہ کا ادراک نہ ہوتا تو میں اس اپنے پن سے یہاں نہ آتا۔" وصی احمد نے صفائی پیش کی۔

"اپنا پن؟...... وصی احمد! اپنا پن تو مادی چیزوں سے ہوتا ہے۔ انسانوں سے تو اپنا پن نہیں، محبت کی جاتی ہے۔ وہ محبت، جسے محبت کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔" اریج اُسے سمجھاتے سمجھاتے رو پڑی۔ اُس کی آنکھوں سے موتی ٹپک پڑے۔

"اتنی اُداسی کی باتیں کیوں کرتی ہو پاگل! تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں، تم جو کہو گی، میں وہی کروں گا۔ تمہاری محبت نے مجھے بالکل بدل دیا ہے۔ تم نے مجھ میں ایک نیا وصی احمد پیدا کیا ہے اریج! پرومس میں ویسا بھی نہیں کروں گا۔ تم بس جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔" وصی احمد نے مسکرا کر اُس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ تبھی دروازے پر ہلکی سی ناک ہوئی۔ اریج نے دھیرے سے یس کہا تو سلمان، کرن سمیت اندر آ گیا۔ سفید کلر کا گاؤن پہنے، اسٹیتھیسکوپ اُٹھائے، آنکھوں پہ چشمہ لگائے، بالوں کو پاؤڈر سے سفید کیے۔ وہ واقعی معمر ڈاکٹر لگ رہا تھا۔ وہ شان سے چلتے ہوئے بیڈ کے پاس آیا۔

"یہ ڈاکٹر سلمان ہیں وصی احمد! انہوں نے ہی میرا آپریشن کیا تھا۔ یہ مشہور سرجن ہیں یہاں کے۔" اریج نے تعارف کرایا۔ سلمان نے وصی احمد سے ہاتھ ملایا، پھر اپنی کارروائی شروع کر دی۔ انجکشن نکالا، اس میں دوائی بھری اور اریج کے قریب لے آیا۔ وصی احمد اس طرح بیٹھا تھا کہ اُسے صرف ڈاکٹر سلمان کی پیٹھ ہی دکھائی دے رہی تھی۔ سلمان نے انجکشن اریج کو لگانے کے بجائے تکیے میں ٹھونس کر گھسا دیا۔ اریج نے ہلکی سی آہ کی۔ ڈاکٹر سلمان نے بی پی اور ٹمپریچر چیک کیا اور اریج سے مخاطب ہوا۔

"گڈ...... اب آپ کا بی پی نارمل ہے اور بخار بھی بہتر ہے۔" سلمان نے کمال

اداکاری سے کہا۔ اریج مسکرا دی۔

''بہت بہادر بچی ہے یہ۔ اتنا سب کچھ ہونے پر تو لڑکیاں بہت اپ سیٹ ہو جاتی ہیں۔ آپ؟''

''وصی احمد۔'' وصی احمد نے اپنا تعارف خود کرایا۔

''اوہ...... تو آپ ہیں مسٹر وصی احمد۔ آپ ہی کا نام اریج بے ہوشی میں پکارتی رہی۔ لگتا ہے، بہت محبت ہے ان کو آپ سے۔'' سلمان نے نہایت ذومعنی لہجے میں کہا۔ وصی احمد نے اریج کی جانب دیکھا۔ سلمان کے جانے کے بعد وصی احمد نے بھی اجازت مانگی۔ اس کے جانے کے بعد اریج، کرن اور شازمہ زور زور سے ہنستی رہیں اور ان باتوں کو دہرا دہرا کے خوش ہوتی رہیں۔



''یار! وہ واقعی مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔ مجھے اُس کی کسی ادا، کسی انداز میں ریاکاری یا کھوٹ کا سایہ بھی نظر نہیں آتا۔'' وصی احمد مسکرا کر بولا۔

''یہی تو میں تمہیں اتنے عرصے سے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں مرزا! لیکن آپ ہی تھے کہ مانتے نہ تھے۔'' کامران نے اس کی تائید کی۔

''لیکن یار مرزا! یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟ کیا اُس نے اظہار کیا اس بات کا؟'' ناصر اب بھی مطمئن نہ تھا۔

''آف کورس یار! اُس جیسی غیر معمولی لڑکی نے خود اعتراف کیا ہے۔ اس کی عیادت کو میں اس کے گھر بھی گیا تھا۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں بھی مجھے پکارتی رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جو رنگ اُترے تھے، وہ ناقابل بیان ہیں یار! وہ مجھے دھوکا نہیں دے رہی۔ میرا یقین کرو۔'' وصی احمد اُنہیں یقین دلاتے ہوئے بولا۔

اسی یقین نے ان دونوں کے بیچ محبت کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ وصی احمد مرزا نے کبھی خیال وخواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ وہ کسی لڑکی سے اس حد تک بھی محبت کر سکتا تھا۔ وہ تو اس دیوانی لڑکی کی بے پناہ چاہتوں کی بارش میں نہا چکا تھا۔ پورا پورا بھیگا ہوا تھا اور اریج نے بھی کچھ ایسی سچائیوں کے رنگ اُسے دکھائے کہ وہ بے بس ہو گیا۔ ہاتھوں میں اریج کا بھیجا ہوا خط تھا اور آنکھوں میں نئے دنوں کی ہزاروں خواہشیں تھیں۔ ایک ایک لفظ وفاؤں کی مہک پھیلاتا اُسے رُوح تک معطر کرتا جا رہا تھا۔

''میرے ہاتھوں کی لکیروں میں سمانے لگے

کیسے چھینیں گے تجھے مجھ سے زمانے والے

آج آپ کی یاد بڑی شدت سے آ رہی ہے۔ ایسا آخر کیوں ہوتا ہے کہ کوئی انسان اس قدر لازم وملزوم بن جاتا ہے کہ سانسیں بھی اُسی کی اساس لگنے لگتی ہیں۔ محبت ایسے کیوں مجبور کر دیتی ہے کہ ہنسنا، رونا، اُداسی، خوشی ہر معاملہ ایک ہی انسان کی دسترس میں ہو جاتا ہے۔ آج کل میرا پڑھائی میں بالکل دھیان نہیں لگتا۔ پتہ نہیں، میں ایگزام کیسے دوں گی۔ کتاب کھولوں تو ایک ہی مسکراتا ہوا چہرہ نظروں کے آگے چھایا رہتا ہے اور وہ ایسے چھیڑتا ہے کہ ایک لفظ بھی پڑھ نہیں پاتی۔ مجھے لگتا ہے آپ کا ارادہ امتحان میں بھی مجھ سے مقابلہ کر کے اوّل آنے کا ہے۔ اور یہاں بھی مجھے ہرانے کا ہے۔

خط کے شروع میں جو شعر ہے، وہ میں نے تخلیق کیا ہے۔ پہلی بار زندگی میں سوچ رہی ہوں کہ یہ اسی کے نام کر دوں، جس کے لئے لکھا ہے۔ اور وہ آپ ہیں۔

آپ کی اپنی

اریج کمال''

خط پڑھ کر کتنی دیر وصی احمد کے چہرے پر مسکراہٹ رہی اور اریج کے محبت بھرے لہجے پہ پیار آتا رہا۔



''طوطا پھنس تو پوری طرح چکا ہے، بس اب پَر کاٹنے باقی ہیں۔'' اریج فون پر کرن سے باتیں کر رہی تھی اور اپنی تازہ فتح پہ خوش ہو رہی تھی۔

''لیکن اریج! اب آگے کی کیا پلاننگ ہے، یہ بتاؤ۔'' کرن کی بے تابی اُس کے الفاظ سے ظاہر تھی۔

''بس اور ایک ہفتہ انتظار کرو۔ ٹھیک سات دن بعد اس کہانی کا کلائمکس دیکھنا۔ لیکن اسی ایک ہفتے میں وہ میرے گھر بارات لانے پر بھی تیار ہو جائے گا۔'' اریج نے نہایت شاطر لہجے میں یہ کہا اور فون بند کر دیا۔ کچھ دیر سوچا اور وصی احمد مرزا کے سیل فون کے نمبرز پش کئے۔ وصی احمد نے اریج کا نمبر سیل فون کے اسکرین پر جھلملاتا ہوا دیکھا تو فوراً بٹن آن کر دیا۔

''ہاں اریج! بولو، کیسی ہو؟''

"میں آپ سے فوراً ملنا چاہتی ہوں وصی!" اریج نے نہایت روہانسی آواز بنائی۔

"لیکن...... لیکن کیا ہوا اریج؟" محبت سے لبریز لہجہ اریج نے اتنی دور سے بھی محسوس کرلیا۔

"میں فون پر کچھ نہیں بتا سکتی۔ آپ...... آپ آج ہی مجھ سے ملیں۔" وہ آنسوؤں سے تر آواز بنانے کا ڈرامہ کرنے لگی۔

"اریج! دیکھو، روؤ تو نہیں۔ اچھا ایسا کرو، ٹھیک ایک گھنٹے بعد مجھ سے نیشنل پارک میں ملو۔ اور پلیز! پریشان مت ہو۔" وصی احمد نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا اور اُس نے اوکے کر کے فون بند کردیا اور اگلی ملاقات کے لئے ڈائیلاگز تیار کرنے لگی۔

نیشنل پارک میں وہ پہنچی تو وصی احمد اُس کا منتظر تھا۔ وہ نہایت پریشان کن چہرہ بناتی اُس تک آئی اور بنچ پر بیٹھ گئی۔

"اب بتاؤ اریج! ایسا کیا تھا، جو تم مجھے فون پر نہیں بتا سکتی تھیں، جس نے تمہیں اس قدر پریشان کر رکھا ہے؟" وصی احمد فوراً ہی پوچھ بیٹھا۔

"وصی! میں آپ کو کیسے بتاؤں؟ پتہ ہے، امی نے میرا رشتہ طے کردیا ہے، میرے کزن حماد سے۔ اسی ماہ منگنی کی رسم طے پائی ہے۔" اریج نہایت دُکھ بھرے لہجے میں بولی۔ وصی احمد چونک اُٹھا۔

"لیکن کیا تم سے کچھ پوچھا نہ گیا؟ کیا تمہیں اس کی کوئی خبر نہ تھی؟ اچانک...... اچانک کس طرح ہوگیا یہ؟" وصی احمد پریشان ہوگیا تھا۔

"نہیں وصی! مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ امی نے خود ہی فیصلہ کر لیا اور بعد میں مجھے خبر کی۔ اب...... اب کیا ہوگا وصی؟" اُس کی آنکھوں سے ایک آنسو گرا اور اُس کا گال بھگو گیا۔

"تم روؤ نہیں اریج! میں آج ہی اپنے ماما، پاپا سے بات کرتا ہوں۔ تم میری ہو، تمہیں مجھ سے کوئی علیحدہ نہیں کرسکتا۔ وہ لوگ یقیناً کچھ کریں گے۔ تم کسی اور کی نہیں ہوسکتیں۔" گورے سے، بھاری ہاتھ نے اُس کا نازک ہاتھ تھاما اور وفا کا اقرار کیا۔

"لیکن انکل آنٹی کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟" وہ اپنے آنسو پونچھ کر بولی۔

"میں اُن کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ میری خوشی ان کے لئے سب سے ضروری ہے۔ کوئی تمہاری اُنگلی میں ایک انگوٹھی پہنا کے تمہیں مجھ سے جدا نہیں کرسکتا۔" وہ نہایت پیار سے بولا۔

"مجھے تمہاری جدائی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں مر جاؤں گی تم سے دُور رہ کے۔" وہ پھر روہانسی ہوگئی۔

"تو کیا میں رہ پاؤں گا زندہ؟ پگلی! اگر انگوٹھی پہنانا مُہر لگانے کے مترادف ہے تو یہ کام اس حماد سے پہلے میں کروں گا۔ تم اُداس مت ہونا۔" وصی احمد نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر پیارا سا اظہار کیا اور وہ مسکرا دی۔



ہر کسی کے نقش میں چہرہ تمہارا دیکھنا
چونکنا کچھ دیکھ کر اور پھر دوبارہ دیکھنا
آسماں پر دُکھ اُترتے ہیں زمیں کے شام کو
دُھوپ چہروں پر ڈھلے گی تب ستارا دیکھنا

"تم نے مجھے پکا پکا شاعر بنا دیا ہے اریج!" اپنی نوٹ بک کے پچھلے کاغذ پر لکھا شعر پڑھ کر وصی احمد بولا۔

"شاعری چھوڑیں، یہ بتائیں، انکل آنٹی سے بات کی؟" اریج خاصی جھنجلاہٹ سے بولی۔

"پاپا سے تو نہیں، میں نے ممی سے بات کی ہے۔ بڑی مشکل سے، بڑی اداکاری سے اُنہیں راضی کرلیا ہے۔ اب وہ پاپا کو راضی کرلیں گی۔"

"تم اسی طرح کچھوے کی چال چلتے رہنا اور حماد مجھے بیاہ کر لے جائے گا۔" اریج نے خفگی ظاہر کی۔

"ارے ایسی کی تیسی۔ دیکھتا ہوں کوئی کیسے لے جاتا ہے تمہیں مجھ سے چھین کر۔" وصی احمد نے ڈائیلاگ مارا۔

"تم یونہی کہتے رہنا۔ اس اتوار کو وہ لوگ انگوٹھی پہنانے آرہے ہیں۔" اریج نے بہت غمگین صورت بنائی۔

"اریج! کل تم انوائیٹڈ ہو۔ شام چار بجے میں تمہیں لینے آؤں گا۔ تمہارے اپنے گھر کے باہر سے۔" وصی احمد نہایت سنجیدگی سے بولا۔

"لیکن کہاں جانے کے لئے انوائیٹڈ ہوں؟" اریج جھنجلا اُٹھی۔

"کل وصی احمد مرزا اور اریج کمال کی منگنی سیریمنی ہے۔ اگر انگوٹھی پہنانا، اپنا بنانے کی نشانی ہے تو وہ میں تمہیں کل پہنا دوں گا۔ تیار رہنا۔" یہ کہہ کر وصی احمد اُٹھا اور سیڑھیاں

کراس کرتا چلا گیا۔ اریج حیرانی اور تفاخر بھری مسکراہٹ سے اُسے دیکھتی رہی۔ تبھی شازمہ اُس کے پاس آ بیٹھی۔

"کیا ہوا؟ مسکرا کیوں رہی ہے؟"

"کل میں مرزا وصی احمد کی محبت اُس کے منہ پر تھوکوں گی۔ کل اریج کمال اس مغرور شخص سے جیت جائے گی۔" اریج نے فاتحانہ انداز میں پیشین گوئی کی۔



بلیک کلر کی گاڑی ساحل سمندر کے قریب ایک اکیلے کونے میں رُکی تھی۔ سورج کے ڈھلنے میں ابھی وقت تھا۔ دُور کہیں کہیں لوگ نظر آ رہے تھے۔ لہروں کا ہلکا ہلکا شور گاڑی کے بند شیشوں کو چیر کر سنائی دے رہا تھا۔

"اریج! آج میں اپنی اور تمہاری محبت کو ایک رشتے میں باندھنے جا رہا ہوں۔ میں نے تمہیں ہماری منگنی پر انوائٹ کیا تھا ناں؟" پیار بھرے لہجے میں وصی احمد نے سرگوشی کی۔

"لیکن ہماری منگنی میں تو کوئی بھی نہیں آیا۔" وہ بڑے ناز سے بولی۔

"آئے ہیں ناں۔ یہ سمندر، آسمان، سورج، یہ کاسنی رنگ کی شام، ڈھیر سارے پرندے، بے قرار موجیں، تشنہ کنارہ، یہ سب ہماری ہی خوشی کے ساتھ ہیں۔" وہ بہت شاعرانہ انداز میں بولا۔

"اس رشتے میں بندھنے سے پہلے کیا میں اپنے اطمینان کے لئے آپ سے کچھ سوال پوچھ سکتی ہوں؟" اریج مسکرا کے بولی۔

"ہوں....... پوچھو!" وہ بھی مسکرا دیا۔

"کتنی محبت کرتے ہیں آپ مجھ سے؟" وہ سوال کر کے متوجہ ہو گئی۔

"مجھے خود نہیں معلوم۔ لیکن بس یہ جانتا ہوں کہ میری زندگی میں کبھی کوئی اس طرح میری کسک نہیں بنا۔ تم میری روح کے اندر سمانے والی پہلی چاہت ہو۔" وہ ایک جذب کے ساتھ بولا۔

"اگر میں تم سے دُور ہو گئی تو؟" ایک اور سوال آیا۔

"زندگی بے کار ہو جائے گی۔ تم نہ ملیں تو جان دے دوں گا، جی نہیں پاؤں گا۔" اُس کی شفاف آنکھوں میں کتنے عکس دوڑ گئے۔

"مجھ سے جیت پاؤ گے وصی احمد؟" لہجے میں بدلے کی بُو بھی تھی۔

"دنیا بھر سے جیت سکتا ہے وصی احمد لیکن تم سے کبھی نہیں۔ میں ہار گیا ہوں تمہارے

آگے۔ تم جیت گئی ہو۔" وہ سر جھکا کے بولا۔ "اچھا، اب بہت سوال جواب کر لئے۔ لاؤ، اپنی اُنگلی اور پہنانے دو مجھے محبت کی یہ نشانی۔ سوچنے دو مجھے اپنی چاہتیں۔ کر لینے دو مجھے ہر اقرار۔"

سبز رنگ کی چھوٹی سی ڈبیہ میں چھوٹا سا ہیرا جھلملا رہا تھا۔ وصی احمد نے اریج کا ہاتھ تھاما اور والہانہ پن سے یہ شعر کہا۔

"میرے ہاتھوں کی لکیروں میں سمانے لگے
کیسے چھینیں گے تجھے مجھ سے زمانے والے"

ابھی انگوٹھی اُس کی اُنگلی میں ڈالنے ہی کو تھا کہ اریج نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"ایک منٹ وصی احمد مرزا!....... ایک منٹ۔ سارے انکشافات تم ہی کرتے رہو گے، مجھے موقع نہیں دو گے؟" وہ نہایت بدلے بدلے لہجے میں بولی۔ "آخر ہار گئے ناں مجھ سے؟ اعتراف شکست کر لیا ناں۔ تسلیم کر لیا ناں کہ تم مجھ سے کبھی جیت نہیں سکتے۔ صرف ایک مہینے کے اندر اندر میں نے تمہارا سر اپنے آگے جھکا دیا ناں وصی احمد! ایک عورت سے کبھی مرد نہیں جیت سکتا۔ عورت مرد کو صرف اپنی مسکراہٹ ہی میں برسوں تک مقید کر سکتی ہے۔ میں چاہتی تو اس ڈرامے کو اور بڑھا سکتی تھی۔ لیکن مجھے تمہارے اتنے ہی پاگل پن کی ضرورت تھی۔"

وصی احمد نہایت حیران آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ انگوٹھی پکڑے اُس کا ہاتھ ساکت سا رہ گیا تھا۔

"کون سا ڈرامہ؟....... یہ کیا مذاق ہے اریج؟"

اریج نے ایک لمبا سا قہقہہ مارا۔ "مذاق یہ نہیں وصی احمد! مذاق تو وہ تھا، جس کے ذریعے پچھلے ایک ماہ سے میں تمہیں بے وقوف بنا رہی تھی۔ محبت کا کھیل کھیلا اور اچھے کھلاڑی کی طرح تمہیں اس میدان سے آؤٹ کر دیا۔ تم کیا سمجھتے ہو، اریج کمال کو تم سے محبت ہو گئی ہے؟ کتنی شان سے اُس دن کہہ رہے تھے کہ تم مجھ سے شادی کر کے اپنی جیتی ہوئی ٹرافیاں صاف کرواؤ گے۔ کتنی جلدی میرے جھوٹ کے پیچھے چل دیئے۔"

وصی احمد پر اُس کے یہ انکشافات جان لیوا تھے۔ یعنی اریج نے اُسے دھوکا دیا، جھوٹ بولا۔ اُس کی محبت، اُس کا اپنا پن، اُس کی سچائیاں سب چھلاوا تھیں۔ آخر کیوں؟ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس توہین پر وصی احمد اُسے تھپڑ مارتا۔ لیکن یہ سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی تو اریج کمال تھی، جس نے زندگی میں پہلی بار اُس کے دل میں محبت کی شمع روشن کی تھی۔ پہلی بار

اُسے چاہتوں سے آشنا کروایا تھا۔ وہی دشمن جاں کتنے ظالم لہجے میں اُس سے گویا تھی۔

''زندگی بے کار ہو جائے گی ناں تمہاری میرے بغیر۔ جان دے دو گے ناں اپنی۔ جاؤ، جا کر اسی سمندر میں ڈوب جاؤ۔ میں تمہیں نہیں ملنے والی۔ میں آج تمہیں خود ٹھکراتی ہوں۔'' اریج نے نہایت توہین آمیز الفاظ میں کہا۔ وصی احمد کی آنکھوں میں شدتِ جذبات سے سرخی اُمڈ آئی تھی۔ اُس نے گاڑی اسٹارٹ کی، ریورس گیئر لگایا، ایکسلیٹر پر پاؤں رکھا، بیک کر کے سیدھا گاڑی دوڑانے لگا۔

''کہاں جا رہے ہو وصی احمد؟...... گاڑی روکو۔ جانے دو مجھے۔'' اریج چیخنے لگی۔

لیکن وصی احمد گاڑی دوڑاتا رہا، دوڑاتا رہا۔ رات کے سائے شہر میں اُتر آئے تھے۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس ہر طرف روشن تھیں۔ وہ شاہراہوں پر گاڑی تیز رفتار سے دوڑاتا رہا۔

''روکو وصی احمد!...... اُتارو مجھے۔'' اریج چلاتی رہی۔

دیر تک انجان علاقے کی سڑکوں پر گاڑی بھاگتی رہی۔ پھر ایک انجان بنگلے کے آگے اُس نے گاڑی روک دی۔ خود اُترا اور دوسری طرف سے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا، اریج کی کلائی پکڑی اور اُسے گھسیٹتا ہوا لے جانے لگا۔

''کیا کر رہے ہو وصی احمد!...... چھوڑو مجھے۔'' وہ چیختی رہی۔ لیکن وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے اُسے گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا۔ یہ وصی احمد کا وہ بنگلہ تھا، جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ پارٹیز وغیرہ منانے آتا تھا۔ ڈیڈ نے اُسے یہ اُس کی 23 ویں برتھ ڈے پر گفٹ کیا تھا۔ سارے گھر کے لاک کھولتا، وہ اُسے ایک کمرے میں لے آیا اور اُسے بستر پر پھینک دیا۔ نازک سا وجود جھٹکے سے گر پڑا۔

''اریج کمال صاحبہ!...... اگر میں چاہوں تو ابھی، اسی وقت تمہیں تمہارے اس جھوٹ کی سزا دے سکتا ہوں، تمہیں اپنے مرد ہونے کی برتری دکھا سکتا ہوں، تمہیں پامال کر سکتا ہوں۔ لیکن میں ایسا کروں گا نہیں۔ کیونکہ میں نے تم سے سچی محبت کی ہے۔ تمہیں اپنا مانا ہے۔ تمہاری طرح ڈرامہ نہیں کیا، اداکاری نہیں کی۔ تم کیا سمجھتی ہو، میں ان لڑکوں میں سے ہوں، جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہیں، ہر لڑکی پر جان فدا کرتے ہیں، جو سڑک چھاپ عاشق ہوتے ہیں۔ نہیں اریج کمال! نہیں...... تم نے غلط سمجھا ہے مجھے۔ یہ جھوٹ، مکر، اداکاری، تم عورتوں کے خون میں ہوتی ہے۔ ہم مرد ایسے بد ذات نہیں ہوتے۔ میں چاہوں تو اسی وقت تمہیں تمام عمر کے لئے شکست دے سکتا ہوں۔ لیکن میں ایسا کروں گا نہیں۔ تم نے ایک معمولی سے تقریری مقابلے میں ہارنے کی سزا میرے جذبات سے کھیل

کر دی۔ میں پوچھتا ہوں، کیا حق تھا تمہیں میری محبتوں کو بیدار کرنے کا؟ مجھے اپنی چاہتوں کا یقین دلانے کا؟ مجھے اپنا بنانے کا؟'' وہ نہایت غصے میں الفاظ ادا کرنے لگا۔ اریج کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر ہو چکا تھا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے ...... چلی جاؤ ...... اور دوبارہ کبھی کسی کے جذبات کے ساتھ نہ کھیلنا۔ کسی کے ساتھ جھوٹ بول کر اُس کی سچائیوں کو رُسوا نہ کرنا...... چلی جاؤ'' وصی احمد تھکے تھکے وجود کے ساتھ صوفے پہ ڈھے گیا۔ اریج اپنا وجود سنبھالتی اُٹھی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس گھر سے نکل کر سڑک پر آئی تو قدم ایک ایک من بھاری لگا۔ ندامت نے اُسے گھیر لیا تھا۔ دل کے نہاں خانوں میں محبتیں سر اُٹھا چکی تھیں۔ اُس شخص کی خاطر، جس سے آج تک اُس نے صرف نفرت کی تھی، جسے ہمیشہ ہرانا چاہا تھا، اُس کی خاطر، اُس کی وفاؤں کی خاطر دل میں شمعیں جل اُٹھی تھیں۔



''اچھا...... تو یہ بدلہ لیا تم نے مرزا وصی احمد سے۔ پہلے اُس کے دل میں محبت جگائی اور پھر اُس کی محبت کا اس طرح مذاق اُڑایا۔ اریج! تم انتہائی خود غرض اور ظالم لڑکی ہو۔ جتنی معصوم تم چہرے سے لگتی ہو، اتنی ہو نہیں۔ تمہارے اندر دل نہیں، پتھر ہے پتھر۔'' سلمان، اریج کی زبانی تمام داستان سن کر اُس پر پھٹ پڑا۔ ''اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تمہاری نیت کیا ہے تو اُس دن میں تمہارے جھوٹ میں شامل ہوتا ہی نہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم اس طرح مذاق ہی مذاق میں کسی کے سچے جذبات سے کھیل رہی ہو۔'' وہ انتہائی غصے میں تھا۔

''سلمان! میں تو تم سے اپنی بات شیئر کر رہی تھی اور میں تو وصی احمد سے صرف اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔'' وہ نہایت شش و پنج میں مبتلا تھی۔

''تو لے لیا ناں بدلہ۔ اب جاؤ، گردن تان کے اپنی فتح کے قصے سب کو سناؤ۔ تم تو اس سے جیت گئی ہو ناں، اُس کی ہار کی خوشی مناؤ۔ یہ دو تین دن سے بزدلوں کی طرح کمرے میں بند کیوں ہو؟ کالج کیوں نہیں جا رہیں؟'' سلمان نے اُس کی کمزوری گویا پکڑ لی۔

''نہیں سلمان! میں اُسے فیس نہیں کر سکتی۔'' اریج نے سچ ہی بول دیا۔

''تمہیں پتہ ہے، تم اُسے فیس کیوں نہیں کر سکتی ہو اریج! کیونکہ تم اُس سے محبت کرنے لگی ہو۔ تم نے تو اُس کا دل اپنے جھوٹ سے جیتا تھا، لیکن وہ تمہارا دل اپنے سچ سے جیت چکا ہے۔ وہ چاہتا تو وہ اپنی اس توہین کا بدلہ اُس دن تم سے لے سکتا تھا اور شاید کوئی اور ہوتا تو ایسا کر بھی لیتا۔ تم سے پوری عمر کے لئے جیت سکتا تھا وہ۔ لیکن اُس نے اعلیٰ ظرفی کا

ثبوت دیا۔ اُس کے اس ظرف نے تمہارے مغرور دل کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا ہے اریج کمال!" سلمان لفظ بہ لفظ سچ ہی بول رہا تھا اور اریج اُس کی ہر بات سن رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب حقیقت ہے۔

"میں اُس سے معافی مانگوں گی۔ منالوں گی اُس کو۔" دل میں اِک اور اُمید نے سر اُٹھایا۔

"بھول جاؤ اریج کمال! وہ بار بار تمہارے ہاتھوں بے وقوف نہیں بنے گا۔ وہ بہت اچھا انسان ہے۔ تمہاری طرح بے قدر و بے حس نہیں۔ میں نے سڑک چھاپ عاشقوں کے بارے میں تو سنا تھا، لیکن آج تمہاری طرح کی فلرٹ لڑکی کو پہلی بار دیکھا ہے۔"

"بس کرو سلمان!........ بس کرو۔ میں وصی کو منالوں گی، اُسے اپنی سچی محبت کا یقین دلا دوں گی۔ اُسے اپنا لوں گی سلمان!" اب اریج بلک بلک کر رو دی۔ سلمان کو اب اُس پر کچھ رحم آنے لگ گیا تھا۔ تبھی فون کی گھنٹی نے بجنا شروع کیا۔

"ہیلو!" سلمان نے فون اُٹھالیا۔

"میں........ میں شازمہ بات کر رہی ہوں۔ اریج سے بات ہو سکتی ہے؟" دوسری طرف سے شازمہ کی پریشان کن آواز آئی۔

سلمان نے ریسیور روتی ہوئی اریج کے سامنے کر دیا۔ اُس نے اپنے آنسو پونچھے اور ریسیور تھاما۔

"ہیلو!"

"ہیلو اریج! کہاں ہو تم....؟ اتنے دنوں سے کالج کیوں نہیں آئیں؟" شازمہ بے قرار ہو اُٹھی۔

"وہ، بس طبیعت کچھ بہتر نہ تھی۔" اریج نے مختصراً جواب دیا۔

"تم اپنی طبیعت کا ماتم مناتی رہنا۔ پتہ ہے، تمہاری وجہ سے کیا ہو گیا ہے؟" شازمہ نے اُسے جھڑکا۔

"کک........ کیا ہو گیا ہے؟" اُس کی دھڑکن تیز رفتاری سے دوڑنے لگ گئی۔

"اریج! وصی احمد نے زہر کھا کر خودکشی کر لی ہے۔" شازمہ نے چبا چبا کر الفاظ ادا کیئے۔

"کیا؟" حیرت سے اُس کی آواز حلق ہی میں پھنس گئی۔

"ہاں........ تمہاری اداکاری نے، تمہارے بدلہ لینے کے ارادے نے اُس کی جان

لے لی ہے اریج! وہ مر چکا ہے۔ تم نے کسی کا اکلوتا چراغ چھین لیا ہے اریج! تم انتہائی ظالم ہو۔ انتہائی ظالم۔" شازمہ اُس پر اپنا غصہ نکالے جا رہی تھی لیکن اس میں مزید کچھ بھی سننے کی سکت نہ تھی۔ اُس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ چکا تھا۔ آنسو آنکھوں کی دہلیزیں پھلانگ کے گرتے ہی چلے جا رہے تھے۔

وہ تیز رفتاری سے اُٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اُس کے اندر کچھ ٹوٹنے لگا۔ چھناکے سے ہونے لگ گئے۔ دھڑ........ دھڑ........ دھڑام۔ یعنی واقعی اُس نے وصی احمد کو مار ڈالا۔ وصی احمد کی معصوم، صداقت سے بھری محبت کا قتل کر ڈالا۔ اُس نے، اریج کمال نے وصی احمد کی جان لے لی۔ کیونکر........ کس طرح........ وہ اتنی بے درد کیسے ہو گئی؟........ وہ قاتل کیسے ٹھہر گئی؟........ کیا منہ دکھائے گی وہ اپنے خدا کو، جس نے محبت جیسا مقدس جذبہ بنایا۔ اس جذبے کی پناہ گاہ دلوں کو ٹھہرایا۔ اُس نے اسی دل کو توڑ ڈالا۔ اسی پناہ گاہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ یعنی وہ شمع، جو کہ کسی کے گھر میں انجانے کتنی منتوں مرادوں کے بعد روشن ہوئی ہو گی، اتنی جلدی بجھ گئی، اسے تاریک کرنے والی اریج کمال ہے۔ اگر ایک بار........ صرف ایک بار وہ وصی احمد کے آگے اپنا اقرار کرتی، وفا کا اظہار کرتی تو شاید........ تو شاید وہ بچ جاتا۔ وہ بچ سکتا تھا۔ لیکن وہ تو بدک کے، ڈر کے بیٹھی رہی۔ ہمت نہ تھی سامنا کرنے کی۔ لیکن کیا اُس کی موت کی خبر سننے کی ہمت تھی اُس میں؟ نہیں، نہیں، نہیں۔ وہ اپنی ہی نفی کرنے لگ گئی تھی۔



"اریج! دروازہ کھولو۔ بیٹا! دو دن سے تم نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ ضد مت کرو۔ مجھے اپنی پرابلم بتاؤ۔" اُس کی ماما کتنی دیر سے دروازہ کھٹکھٹائے جا رہی تھیں۔ آخر کو اُکتا کر اُسے دروازہ کھولنا ہی پڑا۔ والدہ اُس کی حالت دیکھ کر چونک اُٹھیں۔ روئی روئی سرخ آنکھیں، بکھرے بال، مرجھایا چہرہ۔ وہ تو اریج کمال کا سایہ لگ رہی تھی۔ اُس کا ایسا کیا لٹ گیا تھا کہ وہ اس قدر ٹوٹ چکی تھی۔

وصی احمد کی یکطرفہ، صداقت آشنا محبت نے اُس کی رگوں کو مقید کر لیا تھا کہ اس کے جانے کے بعد وہ کھل کر سانس ہی نہ لے پا رہی تھی۔

وصی احمد کا نہ ہونا گویا چاند، سورج تاریک ہونے اور پھولوں کے بے رنگ ہونے جیسا تھا۔ احساسات کے کتنے اژدھوں کی گرفت میں تھی وہ۔ پچھتاوے اور ملال کے کتنے آکٹوپس اسے جکڑے ہوئے تھے۔

"ارتج بیٹا! مجھے بتاؤ، تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیوں تم نے دو دن سے خود کو بند کر رکھا ہے؟ باہر کیوں نہیں نکلتی ہو؟ اتنا کس بات پر رو رہی ہو؟" بے قرار ماما اپنی اکلوتی بچی کی اُداسی پر غم زدہ تھیں۔

"کچھ نہیں ماما! بس طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔" اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا ہے طبیعت کو ارتج؟ اس طرح منتشر میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ تمہیں تو آج تک کبھی سر درد بھی نہیں ہوا بیٹا! اب ماما کیا جانتیں اُس کے محبت کے انتشار کو۔ اُس کے اندر اُٹھتے طوفان کو وہ کیسے بھانپتیں؟ وہ ماما کو کیسے بتاتی کہ اُس کے معصوم دل نے کیسا پاپ کر دیا ہے، اُس سے کیسا جرم سرزد ہو گیا ہے۔

"ہم بتاتے ہیں آنٹی! اس کے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔" جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتا سلمان آ گیا، جو کہ ماں بیٹی کی تمام باتیں سن رہا تھا۔

"نہیں سلمان! پلیز۔" ارتج نے ملتجی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

"کیوں چھپاؤں میں آنٹی سے کہ تم نے ٹرم ٹیسٹ میں تھرڈ پوزیشن لی ہے، فرسٹ نہیں۔" سلمان نے بہت صفائی سے جھوٹ گھڑ لیا اور ارتج خاموش ہو گئی۔

"تھرڈ پوزیشن؟ تو اس میں اتنی اُداسی کی کیا بات ہے؟ فیل تو نہیں ہوئی ناں۔" ماما نے مسکرا کر کہا۔ پھر سلمان اُنہیں کچھ مزید باتوں میں اُلجھاتا اندر کچن میں لے گیا اور وہ وہیں دروازے پر چپ چاپ کھڑی رہی، اس سوچ میں کہ اس طرح کے جھوٹ ماما کے دل کو تو تسلی دے سکتے ہیں لیکن اس کے دل کے لئے کون سا بہلاوا کارگر ثابت ہو گا۔ اب وہ کون سی دلیل دے کے اپنے دل کو مطمئن کرے گی۔ اس دل کو جو وصی احمد سے بدلہ لینے پر تلا تھا۔ اُسے شکست دینے کی آرزو رکھا کرتا تھا۔ لیکن وصی احمد نے تو مر کے اُسے شکست دے دی۔ اُس کے اندر محبت پیدا کر کے وہ خود کو امر کر گیا۔

کچھ ہی دیر میں سلمان گاجر کھاتا ہوا کچن سے نکلا اور اُس کی طرف دیکھ کے بولا۔

"چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہمیں کہیں جانا ہے۔"

"کہاں؟" وہ افسردہ سے لہجے میں بولی۔

"کہیں باہر۔ تمہیں اس طرح گھر پر بیٹھ کر روتے رہنے کا شوق ہے۔ آنسو کہیں باہر بیٹھ کر بھی بہائے جا سکتے ہیں۔" وہ گاجر چبا کر بولا۔

"ماما اجازت نہیں دیں گی۔" وہ بہانہ گھڑ کے بولی۔

"میں اجازت مانگ چکا ہوں۔ اُٹھو، تیار ہو۔" وہ اُسے گھسیٹتا ہوا کمرے تک لے گیا

اور اُسے نہ چاہتے ہوئے بھی تیار ہونا پڑا۔

سلمان بہت آہستہ سے بائیک چلا رہا تھا۔ سمندر کی لہریں روڈ سے بھی نظر آ رہی تھیں اور بہت رومانی سا منظر دکھا رہی تھیں۔ اُس کے دل میں کئی طوفان اُٹھنے لگے۔ اُس دن وصی احمد بھی تو اُسے یہیں لایا تھا، اُس کی اُنگلی میں ایک رشتہ ڈالنے کے لئے، اُسے اپنا بنانے کے لئے۔

"کسے یاد کر رہی ہو؟......وصی احمد کو؟" سلمان نے طنزیہ سوال کیا۔

"تمہیں اس سے کیا۔ میں کسی کو بھی یاد کروں۔ کم از کم تمہیں تو نہیں کر رہی۔" وہ ناراض ہو کر بولی۔

"ہاں، مجھے بھی تم مرنے کے بعد یاد کرو گی۔ یہ تو تمہاری عادت ہے ارتج! کہ تم زندہ انسانوں کو رُلاتی ہو اور مرنے والوں کے لئے روتی ہو۔" سلمان نے مزید اُسے تنگ کیا۔

"سلمان! تم کیوں اس طرح مجھے تنگ کر رہے ہو؟ تمہیں میری حالت کا اندازہ نہیں۔" وہ روہانسی ہونے لگی۔

"اندازہ نہ ہوتا تو تمہارا موڈ چینج کرنے کے لئے تمہیں لے نہ آتا۔ میں تو تمہیں یہ سمجھانے کے لئے لایا تھا ارتج! کہ مرنے والوں کے پیچھے مرا نہیں جاتا۔ جانے والے دُکھ ضرور چھوڑ جاتے ہیں دلوں میں لیکن وہ دُکھ زندگی کو روک نہیں دیتا۔ تم نے کالج جانا کیوں چھوڑ دیا ہے ارتج؟ تم اپنی فرینڈز سے کیوں نہیں ملتی ہو؟" سمندر کے کنارے بائیک روک کے وہ اُس سے مخاطب ہوا۔

"کیا تمہارے یہ دلاسے، میرے دل سے یہ احساس ختم کر دیں گے کہ وصی احمد کی قاتل میں ہوں، اُسے میری محبت نے مرنے پر مجبور کیا ہے؟" اُس کی شفاف آنکھیں نم موتیوں سے جگمگانے لگیں۔

"نہیں ارتج! زندگی اور موت کا تعین پروردگار نے بہت پہلے کر رکھا ہوتا ہے۔ کوئی انسان کسی کی زندگی یا موت کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ پچھتاوے اور پشیمانی کا خیال تمہیں مار ڈالے گا ارتج! پلیز ایسا مت سوچا کرو۔" سلمان اُسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"اگر میں وصی احمد کی زندگی میں نہ آتی، اُس کو محبت کی راہ پہ نہ چلاتی تو کیا وہ مرتا؟ نہیں، وہ تو زندگی کا پیامبر تھا۔ میں نے ہی اُسے موت کی آگہی دی۔ میں ہی وجہ ہوں اُس کی بے وقت جوان موت کی۔" وہ موتی اب اُس کے گال پر پھسل آئے تھے۔

"اُفوہ! پاگل لڑکی۔ چلو میں تمہیں آئس کریم کھلاتا ہوں۔ بھول جاؤ سب۔ کل نے

کالج جانا شروع کر دو۔ فائنل پیپر قریب ہیں۔" وہ اُسے بہلاتا بہلاتا ساتھ لے گیا۔

اگلے دن کالج گئی تو دل کی حالت مزید بگڑ گئی۔ پورے کالج میں ہر طرف وصی احمد ہی کا چہرہ نظر آتا تھا۔ ہر آنکھ اُسی کی آنکھ تھی، ہر ادا اُسی کی ادا لگتی تھی۔ ہر وہ جگہ، جہاں وہ وصی احمد کے ساتھ آتی جاتی تھی، اُس جگہ پر گئے دنوں کی کتنی یادیں کھڑکیاں کھولے کھڑی تھیں۔

اُسے سانس اندر ہی اندر کہیں گھٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ گلے میں جیسے کوئی گولا اٹک گیا ہو۔ وہ نہ تو کھل کے رو سکتی تھی اور نہ اپنا کرب چھپا سکتی تھی۔

کالج کا ماحول ویسا ہی تھا۔ گروپ میں جگہ جگہ بیٹھے لڑکے لڑکیاں، کہیں کہیں کلاسز میں پڑھاتے ہوئے اُستاد، کینٹین میں خوش گپیوں اور لائبریری میں پڑھنے میں مصروف اسٹوڈنٹس۔

اُس نے ابھی اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف قدم اُٹھائے ہی تھے کہ کیمسٹری لیب کے باہر وصی احمد کے گروپ کے لڑکے بیٹھے نظر آ گئے۔ کامران، صائم، شہروز اور ناصر۔ وہ اُن سے آنکھیں چرا کے نکل جانا چاہتی تھی۔ آخر کیسے سامنا کر پاتی وہ اُس کے دوستوں کا۔ وہ جانتی تھی کہ ان سب کو وصی احمد کی موت کا پتہ ہے اور اس موت کی وجہ کا بھی۔ وہ وہاں سے تیز رفتاری سے نکل جانا چاہتی تھی کہ اچانک صائم نے اُسے روکا۔

"مس اریج! ٹھہریں۔" اُس کے تیزی سے اُٹھنے والے قدم صائم کی آواز پر گویا زمین میں گڑ گئے۔ وہ تمام لوگ اُس کی طرف آ گئے۔

"ٹھہریں بھابی!" کامران نے بھابی پر زور دیا۔ وہ چونک اُٹھی اس طرح پکارے جانے پر۔

"برا نہ مانئے گا، لیکن ہم اپنے جگری دوست مرحوم وصی احمد مرزا کی پہلی اور آخری محبت کو بھابی نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟" کامران نے انتہائی غم زدہ چہرہ بنا کر کہا۔ یہ جملہ اریج کو تڑپا گیا۔ وصی احمد جیسے انسان کے نام کے آگے مرحوم لگنا اُسے کتنا برا لگا تھا۔

"اتنے دن ہم نے آپ کی راہ دیکھی لیکن آپ آئی ہی نہیں۔" صائم نے بھی اپنائیت سے کہا۔

"کیوں؟" اریج نے سوال کیا۔

"ایک بات تو یہ کہ وصی احمد مرزا نے ایک وصیت لکھی تھی جس میں اُس نے لکھا تھا کہ یہ انگوٹھی چونکہ اُس نے آپ کے لئے بنوائی تھی تو یہ آپ ہی کو ملے۔" ناصر نے وہی ڈبیہ نکالی جو اُس دن وصی احمد لایا تھا۔ اُس نے کچھ سوچا اور وہ ڈبیہ لے لی۔ وہ جانے کے لئے

بڑھی تو شہروز نے اُسے آواز دی۔

"بھابی! کل ہم نے وصی کی یاد میں ایک شام رکھی ہے۔ آپ اگر آئیں گی تو ہمیں خوشی ہو گی اور وصی کی روح کو بھی قرار آ جائے گا۔"

"کہاں آنا ہے؟" وہ آنکھیں جھکائے بولی۔

"یہیں، کالج کے آڈیٹوریم میں۔ کل شام چار بجے۔" صائم نے وقت بتایا۔

"میں آؤں گی۔" وہ مختصراً کہہ کر آگے بڑھی لیکن قدم اب اندر کلاس روم میں جانے کے بجائے باہر گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

رکشے میں بیٹھتے ہی وہ ڈبیہ کھولی تو آنکھوں کے آگے ہزاروں جگمگاتے خواب زندہ ہو گئے۔ اسی ہیرے کی انگوٹھی میں ہی تو وصی احمد نے اپنے سپنے باندھے تھے۔ اسی انگوٹھی کو ہی تو اُس نے اپنی محبتوں کا امین بنایا تھا۔ اُسی کو تو محبت کا پیارا سا گفٹ بنا کر اُس نے اریج کو سونپنا چاہا تھا، اُسی کو تھام کے ہی تو وہ تیقن آمیز لہجے میں بولا تھا۔

"میرے ہاتھوں کی لکیروں میں سمانے والے۔"

اور اُسی کو ٹھکرا کے تو اریج نے اُسے خواہشوں کے سلگتے جزیروں پر بھٹکنے، لڑکھڑانے اور مر جانے کے لئے تنہا چھوڑ دیا تھا۔

اُس کی آنکھوں سے دو ہیرے سے اشک نکلے اور اس انگوٹھی کے ہیرے پہ جا کے ٹھہر گئے۔



"آج کی یہ شام ہم اپنے مرحوم دوست وصی احمد مرزا کی یاد میں منا رہے ہیں۔ وصی احمد ایک بہت پیارا انسان تھا اور اس سے بھی پیارا بیٹا اور دوست تھا۔ اُس کا قریبی دوست ہونے کے ناتے میں وصی احمد کے نام کے آگے مرحوم لگانا برداشت ہی نہیں کر پاتا۔ سوتا ہوں تو اُس کی جگمگاتی آنکھیں، ہنستے لب اور منفرد انداز یاد آ جاتے ہیں۔ جاگتا ہوں تو لگتا ہے وصی احمد پاس ہی کہیں چھپا کھڑا ہے۔ یقین مانئے دوستو! وصی احمد جیسے لوگ مرتے نہیں بلکہ ہم جیسے دوستوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ مسکراتے رہتے ہیں۔" شہروز نے اپنی تقریر ختم کی اور اسٹیج سے اُتر آیا۔

فرنٹ سیٹ پر وہ سلیمان، شازمہ اور کرن کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اسٹیج کے عقب میں وصی احمد کی قد آدم تصویر کھڑی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کہ وصی احمد بذاتِ خود تصویر کی طرح ساکت و جامد کھڑا ہو اور اُسے مسکرا کے چھیڑے جا رہا ہو۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ تصویر اُسی کو دیکھ

رہی ہو۔ اُس کی تو تصویر کی آنکھوں سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہ ہو پا رہی تھی۔ اُوپر سے شہروز کے اتنے جذباتی الفاظ۔ وہ کتنی مشکل سے آنکھوں پر بند باندھ بیٹھی تھی۔

شہروز کے بعد باری آئی صائم کی جو کہ بھیگی پلکوں سے ڈائس پہ کھڑا ہوا اور نم ناک الفاظ میں مائیکروفون پر بولا۔

''یار وصی! یہ میں تجھ سے مخاطف ہوں، ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے نہیں۔ یار! تجھے کیوں اتنی جلدی تھی جانے کی؟ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا تھا؟ ابھی تو زندگی کے صرف پچیس سال دیکھے تھے تُو نے۔ پچیس بہاریں۔ یار! ابھی تو تُو نے سہرہ بھی نہیں باندھا تھا۔''

یہ کہہ کر صائم کی آنکھوں سے آنسو نکلے اور اریج بھی اپنی آنکھوں کو روک نہ پائی۔ سینے کے اندر وصی کی محبت مچلنے لگی۔ کچھ دیر ہال میں بڑا جذباتی سا ماحول رہا، پھر صائم نے خود کو سنبھالا۔

''یار وصی! تُو اپنے یار لوگوں کو دھوکا دے گیا ہے۔ یار! تُو ہمیں کہتا تھا ناں، مجھے، شہروز، کامران اور ناصر کو کہ تم لوگ میری شادی کی ارینجمنٹ کرنا، میری بارات میں بھنگڑا ڈالنا....... یار! ہم لوگ تو منتظر تھے اُس دن کے۔ لیکن تُو نے تو وہ دن نہ دکھایا بلکہ اپنی موت کے دن کو لے آیا۔ یار! تُو بڑا بے وفا نکلا۔ یار! ہم لوگ تجھ سے بہت خفا ہیں....... یار! تُو ہم لوگوں کو بہت اکیلا کر گیا ہے....... خدا تجھے جہاں رکھے، سلامت رکھے یار!''

صائم اپنی آنکھیں پونچھتا ہوا اسٹیج سے اُترا۔ اُس کے جذباتی الفاظ نے سبھی کو رُلا دیا تھا۔

وصی احمد کے قریبی دوستوں کے یہ محبت بھرے الفاظ اریج کو مزید منتشر کر رہے تھے۔ وہ واقعی اتنا اچھا تھا، اتنا پیارا، سچے دل کا، صداقت میں لپٹا انسان تھا۔ اُس کے اندر کی محبت بھی لافانی تھی۔ پھر آخر اُسے اتنی جلدی فنا کیسے ہو گئی؟ ایک بار، صرف ایک بار وہ اریج کو بتا تو دیتا کہ وہ کیا قدم اُٹھانے جا رہا ہے۔ وہ اُس کی محبتوں پر دونوں جہان قربان کر دیتی۔ ایک بار وہ اُسے بانہوں سے پکڑ کے کہتا تو سہی کہ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ پھر وہ کہاں جا سکتی تھی بھلا؟ اب اریج کے گالوں پہ اشک روانی سے بہہ نکلے تھے۔

اریج اب مزید خود کو سنبھال نہ پا رہی تھی۔ وہ اُٹھی، آنسو بہاتی آڈیٹوریم کی تمام کرسیاں پھلانگتی، دوڑتی بھاگتی وہاں سے باہر نکل آئی۔ کتنی دیر تک وہ دوڑتی گئی۔ دوڑتی گئی۔ پھر ایک کلاس روم کے اندر جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور چیخ چیخ کر بولی۔

''آئی لو یُو وصی احمد!....... آئی لو یُو....... میں تم سے محبت کرتی ہوں .... تم جہاں کہیں بھی ہو، مجھے معاف کر دو....... واپس آ جاؤ وصی!....... میں تمہارے بنا زندہ

نہیں رہ سکتی۔''

کتنی دیر وہ آنسو بہاتی رہی۔ کلاس روم کی تاریک تنہائیوں میں ایک دیوانی لڑکی کی پہلی محبت تہا سسکتی رہی، تڑپتی رہی۔ وہ آج دل کھول کے روئی تھی۔ پچھتاوے کی گرد ڈھل گئی تھی۔



آج صبح سے ہی اُس کا دل بہت اُداس تھا اور پھر باہر موسم بھی کچھ اُس کی اُداسی بڑھائے جا رہا تھا۔ اندر دل میں گھٹن ہی گھٹن تھی۔ آسمان پہ چھائے کالے بادل اس گھٹن کا ساتھ دیئے جا رہے تھے۔ وہ بے اختیار ہی اُٹھی، جاگرز پہنے اور اپنے کمرے سے نکل گئی۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے اُسے ماما نے دیکھ لیا۔

''کہاں جا رہی ہو اریج؟''

''وہ....... اصل میں، کمرے میں بیٹھی بیٹھی بہت اُداس ہو رہی تھی۔ سوچا تھوڑی چہل قدمی کر لوں باہر۔'' وہ خود کو فریش فیل کرانے کی کوشش کرنے لگی۔

''اچھا بیٹا! میرا ایک کام کرتی آؤ گی؟'' ماما نے ملتجی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

''کیا ماما؟'' وہ جھنجھلاہٹ سے بولی۔

''ذرا ماموں کے گھر پر اچار تو دے آنا۔ اب میں بوڑھی ہو گئی ہوں بیٹا! مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ میں بار بار آؤں جاؤں۔ اور پھر فاصلہ بھی تو ہے۔'' ماما نے وجہ بتائی تو وہ انکار نہ کر پائی۔

''ویسے میرا اُس طرف جانے کا موڈ تو نہ تھا لیکن آپ نے کہا ہے تو چلی جاؤں گی۔'' وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔

ننھا سا شیشے کا مرتبان تھامے وہ گھر سے نکل آئی۔ بادل آسمان پر اس طرح چھائے تھے کہ دوپہر کے ساڑھے تین بجے بھی شام کا سماں دکھا رہے تھے۔ اڑوس پڑوس کے لڑکے سڑک پر گروپوں میں کرکٹ کھیلنے میں مشغول تھے۔ کچھ لوگ شام ہونے سے پہلے ہی واک کرنے کے لئے نکل آئے تھے۔

وہ بچتی بچاتی، آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی اپنے ماموں کے گھر کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ابھی وہ اتنی قریب نہیں آئی تھی کہ سلمان کو گھر کے گیٹ کے باہر کھڑے کسی سے بات کرتے دیکھا۔ وہ دوسرا شخص اُسے ہوبہو وصی احمد جیسا لگا۔ ویسا ہی قد، ویسے ہی بال، ویسا ہی سراپا۔ اُس کے جسم کے اندر جیسے کپکپی دوڑ گئی۔ ہزاروں واٹ کی بجلی نے اُس کے وجود کو جکڑ

لیا۔ اُس کا دل لرز کے رہ گیا۔ وہ اپنی رفتار تیز کرتی اُن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ لیکن اچانک وہ دوسرا شخص گاڑی میں بیٹھا اور سفید رنگ کی کرولا دوڑاتا جلد ہی نکل گیا۔ وہ تیزی سے چلتی چلتی سلمان کے قریب آ رُکی۔

''اریج! تم؟'' وہ اُسے دیکھ کے حیران ہوا۔

''سلمان!........ سلمان! تم ابھی کس سے باتیں کر رہے تھے؟........ میرا مطلب، وہ لڑکا جو ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے، وہ کون تھا؟'' وہ پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔

''کون، یہ جو ابھی گاڑی میں گیا؟'' سلمان نے سوال کیا تو اریج نے گردن اثبات میں ہلائی۔

''یہ تو میرا کلاس فیلو عاصم تھا۔ لیکن تم کیوں اتنی پریشان ہو؟'' سلمان اُس کی بے چینی پہ حیران ہوا۔

''نہیں سلمان! یہ عاصم نہیں، وصی احمد تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا۔ یقین مانو! یہ بالکل وصی احمد کی طرح تھا۔'' وہ جذباتی طور پر اُسے یقین دلانے لگی۔

''پاگل ہوگئی ہو........ یہ میرا دوست عاصم ہے۔ وصی احمد کہاں سے آ گیا؟ اور ویسے بھی اب تو تمہیں ہر جگہ وصی احمد ہی نظر آتا ہوگا۔ اپنی آنکھوں کا علاج کراؤ لڑکی! کسی دن مجھے نہ وصی احمد سمجھ لینا۔'' سلمان نے اُسے ڈانٹا۔ وہ کچھ خاموش سی ہوگئی۔

''بولیے، کیسے آنا ہوا؟'' سلمان نے اُس کے آنے کی وجہ پوچھی۔ لیکن وہ نجانے کیسی سوچوں میں ڈوب چکی تھی۔ سلمان نے اپنے ہاتھ کو آگے لہرایا۔ ''کیسے آئیں ہمارے غریب خانے پر؟'' وہ چہکا تھا۔

''ہاں........ یہ اچار دینے آئی تھی۔ ماما نے بھیجا ہے۔'' اُس نے وہ شیشے کا مرتبان اُس کی جانب بڑھایا۔

''اچار آنٹی نے بنایا ہے ناں........ چلو اریج! امی سے پراٹھے بنوا کے اچار کے ساتھ کھاتے ہیں۔'' اُس نے اریج کا ہاتھ تھاما اور اندر لے جانے لگا۔ لیکن اریج نے ہاتھ کھینچ لیا۔

''نہیں سلمان! میرا موڈ نہیں۔ میں تو گھر سے واک کرنے نکلی تھی کہ ماما نے یہ اچار پکڑا دیا۔ میں چلتی ہوں۔'' اُس نے بے دلی سے کہا۔ سلمان نے اُس کی تیسری اُنگلی میں جگمگاتی ہیرے کی رنگ دیکھی تو مسکرا دیا۔

''اریج کمال! تم نے واقعی وصی احمد کا نام پہن لیا ہے۔ اب اُس لڑکے کا کیا ہوگا،

جس کی تم سدا کے لئے بنوگی؟'' اُس نے ذو معنی مسکرا کے سوال کیا۔

''سلمان! اریج سوائے وصی کے نہ کسی کی تھی اور نہ ہوگی۔ اس طرح کی فضول بات پھر کبھی نہ کرنا۔'' وہ اپنی انگوٹھی کو دوسرے ہاتھ سے تھامتی تیز رفتاری سے وہاں سے چلی آئی اور سلمان کتنی دیر اُس دیوانی لڑکی کی محبت اور قسمت پر سوچتا رہا۔



کالج کے پیپر شروع ہو چکے تھے۔ وہ بہت حد تک مصروف ہو چکی تھی۔ فائنل ڈگری ایگزام تھے تو محنت بھی زوروں پر تھی۔ ایسے میں وصی احمد کی یاد مٹی تو نہ تھی، البتہ مدھم ہو چکی تھی۔ دل میں یہ عزم پکا ہو چکا تھا کہ وہ کسی کی نہیں بنے گی۔ تاعمر اکیلی رہ کر اپنے گناہوں کا ازالہ کرے گی۔

پیپرز کے دنوں میں رات رات بھر جاگ کر، بہت کم کھانا کھا کر اُس نے خود کو بیمار کر ڈالا تھا۔ ہلکے ہلکے ٹمپریچر کا تو اُس نے ماما سے تذکرہ کیا ہی نہ تھا۔ لیکن آخری پیپر دے کر وہ جیسے ہی گھر آئی تو اُسے اپنا سر بہت بھاری محسوس ہوا۔ آتے ہی بستر پر گر گئی اور جسم میں کپکپی شروع ہوگئی۔

ماما نے اُسے اس طرح بستر پر گرتے دیکھا تو پریشان ہوگئیں۔ گالوں کو، پیشانی کو چھوا تو وہ تپ رہے تھے۔ جسم اُس کا شدت سے بخار کی زد میں تھا۔ والدہ نے جلدی سے سلمان کو فون کیا اور گھر بلایا۔ کچھ ہی دیر میں سلمان آیا، اُس نے ٹمپریچر چیک کیا تو پارہ بہت چڑھ چکا تھا۔ اس وقت تک وہ بے ہوش بھی ہو چکی تھی۔

''افوہ آنٹی! اسے تو ایک سو تین ڈگری بخار ہے۔ ابھی ہسپتال لے جانا پڑے گا۔'' اور پھر سلمان نے گاڑی نکالی، اریج اور اُس کی والدہ کو لیا اور ہسپتال لے آیا۔ ہسپتال میں کچھ ضروری دوائیوں کے دینے کے بعد اُسے ہوش آیا۔ بستر پر نیم دراز بیٹھی تھی وہ، تبھی سلمان کمرے میں داخل ہوا۔

''کیا کہا بیٹا! ڈاکٹر نے؟'' والدہ اپنی اکلوتی بچی کے لئے پریشان تھیں۔

''آنٹی! ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے۔ آرام کی کمی ہے اور غذا بھی نہیں کھائی گئی۔ ساتھ ساتھ دماغ بھی ڈپریشن میں رہا ہے۔ دو دن ہسپتال میں رکھنا ضروری ہے۔'' سلمان نے تفصیل بتائی تو والدہ کو کچھ مزید پریشانی ہوئی۔

''لیکن کوئی ڈرنے کی بات تو نہیں؟''

''نہیں، بس ان موصوفہ کو سمجھا دیجئے گا کہ ابھی سے مرنے کی کوشش نہ کریں۔ اپنے

کھانے پینے، نیند، آرام اور دل و دماغ کا خیال رکھیں۔ غیر مرئی چیزوں کو مٹھیوں میں قید نہیں کیا جاتا۔" سلمان یہ ذومعنی بات کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

"اریج بیٹا! کیوں تم اتنی لاپروا ہو گئی ہو اپنی صحت سے؟ تم ایسی پہلے تو کبھی نہ تھیں۔ اس طرح اُداس رہنا، یوں چپ چاپ گم صم بیٹھے رہنا، رات دیر دیر تک کتابیں پڑھتے رہنا، دن چڑھتے ہی سو جانا۔ یہ میری اریج کی عادتیں تو نہ تھیں بیٹا!" والدہ اُس کے قریب آئیں اور پیار سے بولیں۔

"ایسی بات نہیں ماما! ایگزامز کی ٹینشن تھی، اور تو کچھ نہیں۔ آپ خوامخواہ زیادہ سمجھ رہی ہیں اس بات کو۔" اُس نے مرجھائے ہونٹوں سے مسکرانے کی کوشش کی۔

"جھوٹ...... سب جھوٹ۔ میں تیری ماں ہوں اریج! تُو جب کھانا مانگ بھی نہ سکتی تھی، تب تیری بھوک بھانپ لیتی تھی۔ تُو مجھ سے کیوں چھپاتی ہے بیٹی؟...... میری جان! پرسوں تو تمہارے بابا جان بھی لندن سے آ رہے ہیں، اُن کو کیا جواب دوں گی کہ میں نے اُن کی اکلوتی بچی کا یہ خیال رکھا ہے۔" والدہ کی آنکھوں سے محبت آنسوؤں کی شکل میں بہہ رہی تھی۔

"کیا ماما! بابا جان آ رہے ہیں؟ پھر تو کل ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ لیکن آپ مجھ سے وعدہ کریں، آپ بابا جان کو کچھ نہیں بتائیں گی۔" اریج نے ماں کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی تو والدہ بھی مسکرا دیں۔



وہ بستر پر بیٹھی رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھی کہ سلمان کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کے اِک ادھیڑ عمر ڈاکٹر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ سلمان کے ہاتھ میں سُوپ کا تھرماس تھا۔

"اریج! یہ ہمارے میڈیکل کالج کے شعبہ نفسیات کے پروفیسر ٹیچر ڈاکٹر رمیز وقاص ہیں۔ یہ نہ صرف میرے فیورٹ ٹیچر ہیں بلکہ ایک بہت اچھے سائیکاٹرسٹ ہیں۔ تم ان سے کھل کے اپنی ہر پرابلم ڈسکس کر سکتی ہو۔" سلمان نے وضاحت سے ڈاکٹر رمیز کا تعارف کروایا۔

اریج نے سلام کرنے کے بعد سرسری نظر ڈاکٹر پر ڈالی۔ لمبا قد، سفید بال، سفید داڑھی مونچھ، آنکھوں پر موٹے فریم والا چشمہ لگائے ہوئے۔

"ڈاکٹر رمیز! یہ ہے میری کزن اریج۔ پچھلے چند مہینوں سے بہت اُداس ہے۔ اپنے ایک بہت قیمتی دوست کو کھو دیا ہے۔ اس کے بعد خود بالکل بکھر گئی ہے۔" سلمان نے صاف

گوئی سے ساری بات ڈاکٹر رمیز کو بتائی۔

ڈاکٹر رمیز اُس کے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اور پاٹ دار آواز میں اُس سے مخاطب ہوا۔

"ہوں...... چہرے اور آنکھوں سے تو خاصی برائٹ گرل نظر آتی ہیں۔ لگتا ہے، مقابلے بھی وِن کرتی آئی ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ڈاکٹر! اریج ہر مقابلہ جیتتی تھی۔" سلمان نہایت روانی سے بولا۔ اریج حسب سابق خاموش رہی، صرف ڈاکٹر کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی۔

"لیکن دل کا مقابلہ تو ہار گئی ناں...... اس طرح کے لوگ بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ اکثر دل کی باتیں بتا نہیں پاتے اور چھپانے کی وجہ سے وہی باتیں اُن کے دل کی پھانس بن جاتی ہیں۔ ان کو چاہئے کہ وہ باتیں یہ کسی سے شیئر کر لیا کریں۔" ڈاکٹر نے بہت سچ سچ نتیجہ نکالا تھا۔ اریج کو حیرت ہوئی اس انکشاف پر۔

کچھ توقف کے بعد ڈاکٹر رمیز پھر گویا ہوئے۔ "ہاں، رہی بات اہم دوست کو کھو دینے کی تو سلمان! ہم اکثر اپنے چاہنے والوں کو بھول نہیں پاتے۔ ہاں، اگر اس شخص یا دوست کا کوئی نعم البدل ہماری زندگی میں آ جائے تو پھر ہم پہلے والے شخص کو فراموش ضرور کر لیتے ہیں۔" ڈاکٹر رمیز نے نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

"معاف کیجئے گا ڈاکٹر رمیز! دل کے فریم سے بار بار تصویر چینج نہیں کی جاتی۔ آپ اپنا یہ فلسفہ اپنے اسٹوڈنٹس کے ہی دماغ میں گھسایئے۔ محبت، محبت ہوتی ہے، کوئی بس یا ٹرین نہیں کہ ایک چھوٹ گئی تو دوسری پکڑ لی۔" اریج کو ڈاکٹر کی بات پر غصہ آ گیا تھا، اس لئے وہ بھڑک اُٹھی تھی۔

"لیکن اریج! ڈاکٹر رمیز کی یہ بات غلط بھی نہیں۔" سلمان نے ڈاکٹر کی تائید کی۔

"شٹ اپ سلمان! محبت صرف ایک بار دلوں میں بستی ہے۔ وفا کے راستے صرف ایک بار زندگی دکھاتی ہے۔ بار بار یہ راستے تبدیل نہیں ہوتے۔ میں نے وصی احمد سے محبت کی ہے، کوئی کاروبار نہیں کہ اگر وہ مر گیا تو میں ساتھی بدل دوں۔" اریج کی ستارہ آنکھیں شفاف پانیوں سے جگمگا اُٹھیں۔ تبھی ڈاکٹر رمیز اُٹھ کھڑا ہوا۔

"لگتا ہے، بے بی برا مان گئی ہیں سلمان! انہیں تم کسی دن میرے کلینک میں لے آنا۔ ان کا تفصیلی چیک اپ کرنا ہوگا۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر رمیز کمرے سے چلا گیا اور سلمان اسی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پاگل لڑکی! تمہیں کیا ضرورت ہے، ہر کسی سے اُلجھنے کی؟ ڈاکٹر نے تو بس جنرل سی بات کی تھی۔ اس کا اور کوئی مطلب نہ تھا۔ چلو، میں تمہیں سُوپ پلاتا ہوں۔" سلمان نے اُسے ٹھنڈا کرنے کے لئے نہایت نرمی سے کہا۔ وہ قدرے کُول ڈاؤن ہو چکی تھی۔ سلمان نے بڑے سے باؤل میں سُوپ ڈالا اور اُس تک لے آیا۔ وہ چمچے سے گرم گرم سُوپ پینے لگی۔ سُوپ پیتے پیتے اچانک اُسے خیال آیا۔

"ایک بات کہوں سلمان! میرا یقین کرو گے؟" سلمان نے سر کو مسکرا کر اثبات میں جنبش دی۔

"یہ ڈاکٹر رمیز، پتہ نہیں کیوں مجھے وصی احمد سے مشابہہ لگا۔ اُس کا لب ہلانے کا انداز، آنکھوں کی پتلیوں کا رنگ، لہجہ وصی احمد جیسا تھا۔" وہ نہایت گہری سوچ میں ڈوب کر بولی۔ اس پر سلمان نے زوردار قہقہہ مارا۔ اُس کا یہ قہقہہ ہسپتال کے چھوٹے سے کمرے میں گونجتا رہ گیا اور اریج کو اپنی ہی کہی بات پر شرمندگی محسوس ہوئی۔



اُس کے والد کمال عثمانی لندن سے واپس آئے تو ایئر پورٹ پر اپنی اکلوتی بیٹی اریج کو نہ پا کر حیران ہوئے۔ ایئر پورٹ سے گھر آتے ہی ان کی بیگم آصفہ نے انہیں اریج کے بخار کے بارے میں بتایا تو وہ اور پریشان ہوئے۔

گھر پہنچے تو اریج، سلمان، سلمان کی والدہ، والد اور بہن عاشی نے استقبال کیا۔ گھر میں رونق آ چکی تھی۔ ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔ اریج بھی سالوں بعد اپنے بابا جان سے ملی تھی، سو وہ بھی عرصے بعد کھل کے مسکرائی تھی۔ ڈنر ٹیبل پر سارے بیٹھے تھے کہ سلمان نے اریج کے کان میں سرگوشی کی۔

"اریج! اب یہ مت کہنا کہ انکل کا چہرہ بھی تمہیں وصی احمد جیسا لگ رہا ہے۔"

اریج نے یہ سنا تو زور سے چمچ اُس کے ہاتھ پہ دے مارا۔

"آصفہ! ہم تو سمجھے تھے کہ ہماری اریج اب بڑی ہو گئی ہو گی۔ لیکن وہ تو ابھی تک سلمان سے ویسے ہی لڑتی ہے۔" کمال عثمانی نے دونوں کو لڑتے دیکھ لیا تھا۔

"انکل! آپ کی یہ لاڈلی کبھی بڑی نہیں ہوں گی۔ دادی بھی بنیں گی تو پوتوں کے ساتھ کنچے کھیلیں گی یا پھر پتنگ اُڑائیں گی۔" سلمان ہاتھوں سے پتنگ اُڑانے لگا تو اریج نے ایک چپت اُس کے کندھے پر دے ماری۔ کمال عثمانی مسکرا دیئے۔

"جاؤ، جاؤ........ ہماری بھانجی اب ماشاء اللہ سے تعلیم پوری کر چکی ہے۔ آپ تو ابھی

تک پورے ڈاکٹر بھی نہیں بنے۔" سلمان کے والد عفان علی نے اریج کی سائیڈ لی۔

"ہاں اریج! کیسے پیپرز ہوئے تمہارے؟" کھانے میں چھری کانٹے کا استعمال کرتے ہوئے کمال عثمانی مخاطب ہوئے۔

"بہت اچھے بابا جان! بس اب رزلٹ کا انتظار ہے، اس کے بعد کوئی جاب وغیرہ۔" وہ والد کو اپنے ارادے بتانے لگی۔

"اتنے اچھے امتحان دیئے انکل! کہ آخری پیپر والے دن بے ہوش ہو گئیں اور مجھے ان کا ستر کلوگرام کا وزن اُٹھا کے ہسپتال لے جانا پڑا۔" سلمان نے اُسے چھیڑا تو اُسے غصہ آ گیا۔

"چپ ہو جاؤ احمق!" وہ بے اختیار بول پڑی۔

"کیا کہا؟........ میں تم سے بڑا ہوں........ معافی مانگو۔" سلمان نے کھانا چھوڑا اور اُس کی جانب متوجہ ہوا۔

"کیوں معافی مانگوں میں؟" اُس نے بھی ضد کی۔ سلمان نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور مروڑنے لگا۔ "بولو آئی ایم سوری۔"

"بول دو اریج بیٹا! اس طرح بڑے بھائیوں کو نہیں بولتے ہیں۔" آصفہ بیگم نے صلح کروانی چاہی اور اُسے مجبوراً سوری کرنا پڑا۔ لیکن سوری کرنے کے بعد وہ بیٹھی نہیں بلکہ دوڑ کر اپنے کمرے کا رُخ کیا۔

"آصفہ بیگم! آپ نے تو بیٹی کی شادی کرنے کا بھی سوچ لیا ہے۔ لیکن اریج کی عادتیں تو اب بھی بچپنے سے لبریز ہیں۔" کھانے سے فارغ ہو کر کمال عثمانی لان میں چہل قدمی کرنے آصفہ بیگم کے ساتھ آ گئے تھے۔

"کمال! آپ کو نہیں علم لیکن میں نے اریج کی تنہائی دیکھی ہے۔ اگر اس کا کوئی بھائی یا بہن ہوتی تو شاید ایسا نہ ہوتا۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ کالج سے فراغت کے بعد وہ بالکل اکیلی پڑ جاتی ہے۔ اس طرف دھیان میرا بھی نہ جاتا اگر سلمان مجھے نہ دکھاتا۔" آصفہ بیگم نہایت رازداری سے شوہر کو اریج کی حالت سے آگاہ کرنے لگیں۔

"اچھا، آپ نے چھان بین کی، وہ کیسے لوگ ہیں؟" کمال عثمانی نے پوچھا۔

"آپ کے بغیر ہر کام کرنا سیکھ لیا ہے میں نے۔" آصفہ بیگم نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔

"یہ تو سراسر شکایت ہوئی ناں۔" کمال عثمانی مسکرا دیئے۔

"وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ اونچا خاندان ہے، حیثیت میں ہم سے بہت اونچے ہیں۔

سلمان کا دوست ہے لڑکا۔ میں نے لڑکا بھی دیکھا ہے۔ اُن کے گھر لے گیا تھا سلمان مجھے۔ اُس کے والد، والدہ اور خود لڑکا پسند آیا۔ کل آ کر وہ اریج کو دیکھ لیں گے۔ لڑکا تو کہتا ہے کہ اریج اُسے دیکھے بنا ہی منظور ہے۔ لیکن لڑکے کی ماں اریج کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ آپ لڑکے کے والد سے اور لڑکے سے مل لیجئے گا۔ مجھے تو کوئی اعتراض والی بات نظر نہیں آتی۔ باقی آپ اطمینان کر لیں۔'' آصفہ بیگم نے تمام معلومات شوہر کو سنا دیں۔ اس پر کمال عثمانی مسکرا دیئے۔

''بیگم! آپ نے تو پوری شادی طے کر کے ہمیں مدعو کیا ہے۔ باقی سب کچھ ٹھیک ہے، آپ مطمئن ہیں تو ہمیں پورا اعتماد ہے آپ کے اطمینان پر۔ لیکن کیا اریج راضی ہے؟ دیکھیں بیگم! ہم اپنی اکلوتی بیٹی پر کسی بھی طرح کا دباؤ نہیں ڈالنا چاہتے۔'' کمال عثمانی نے بیٹی کی رضامندی پر فکر ظاہر کی۔

''آپ اس کی فکر نہ کریں۔ سلمان نے اریج کو منانے کی پوری ذمہ داری لے رکھی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں، اریج اُس کے علاوہ اور کسی سے اتنی کلوز نہیں۔ بچپن سے اپنی پرابلمز اُسی سے شیئر کرتی آئی ہے۔ اور ویسے بھی سلمان کہہ رہا تھا، اُس نے بات کی ہے۔ اریج نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ یہ کہا کہ مجھے اپنے ماما اور بابا جان کا فیصلہ منظور ہوگا۔'' آصفہ بیگم نے شوہر کو اطمینان دلایا۔

''یہ کریڈٹ تو پھر آپ کی پرورش کو جائے گا آصفہ! اتنے سال اس طرح اکیلے کتنے اچھے طریقے سے میری بیٹی کی تربیت کی ہے آپ نے۔'' شوہر کی آنکھوں میں اپنے لئے عزت دیکھ کر آصفہ بیگم کی رُوح تک سرشار ہو گئی۔

''چھ سال کی تھی اریج جب میں ماں اور باپ دونوں بن گئی تھی۔ آپ کا لندن جانا، بزنس شروع کرنا، اس گڑیا کو پالتے پالتے نجانے کب بوڑھی ہو گئی میں۔ ساری زندگی تو آپ سے دُور گزری ہے میری۔''

''فکر مت کرو آصفہ! بیٹی کو اچھا گھر دے کر، مطمئن ہو کر ہم پہلے حج پہ چلیں گے اور پھر لندن میں ہی سیٹل ہو جائیں گے۔'' کمال عثمانی اور آصفہ کمال آنے والے دنوں کی پلاننگ کرنے لگے۔



صبح سے ہی گھر میں شام کو آنے والے مہمانوں کی آمد کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ماما نے پورے گھر کے کشن کور اور پردے تبدیل کروائے، تازہ پھولوں کو خوبصورتی سے واز

میں سجا کے کونے میں رکھ دیا۔ کارپٹ کو اچھی طرح سے ویکیوم کر دیا اور اب وہ کچن میں تھیں۔ اریج ہر چیز سے بے خبر تھی اور پھر اس طرح کی دعوتیں بابا جان کے آنے کے بعد روز ہی ہوا کرتی تھیں، اس لئے اریج نے کسی بھی خاص تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ وہ نارمل ہی رہی، بلکہ اب وہ کمرے سے اُٹھ کر کچن میں آ گئی تھی۔

''ماما! میں کوئی ہیلپ کرا دوں؟'' وہ مختلف پتیلیوں کے ڈھکن اُتار کے دیکھنے لگی۔

''نہیں بیٹا! تقریباً سارا کام ہو گیا ہے۔ بریانی، قورمہ بن گیا ہے۔ سویٹ ڈش تو پہلے ہی تیار کر کے فریج میں رکھ دی ہے۔ اب اچار گوشت بنا رہی ہوں۔ باقی رہ گیا سلاد، تو وہ یہ صائقہ بنا لے گی۔'' آصفہ بیگم نے تمام مینو کی تفصیل اُس کے گوش گزار کر دی۔

''لیکن ماما! کوئی چائنیز ڈش بھی بناتیں ناں۔ یہ بریانی، قورمے والی دعوتیں اب پرانی ہو گئی ہیں۔'' اریج نے قورمے کا ذائقہ چمچ کے ذریعے چکھتے ہوئے کہا۔

''سوچ رہی تھی، کوئی چکن کی چائنیز ڈش بھی بنا لوں۔'' آصفہ بیگم کچھ سوچ کے بولیں۔

''آپ چھوڑیں ماما! میں ایسے زبردست شاشلک وِد رائس اور بڑا بناؤں گی کہ مہمان آپ کے قورمے بریانی کو بھول جائیں گے۔'' اریج نے مسکرا کے کہا اور ایپرن باندھ لیا اور کچن کے کیبنٹ کھول کر مطلوبہ اشیاء تلاش کرنے لگی۔

''اچھا، تمہاری مرضی۔ ویسے میں نے سنا ہے، دل تک پہنچنے کا راستہ پیٹ میں سے ہو کے گزرتا ہے۔'' آصفہ بیگم ذومعنی مسکرا دیں۔ پھر وہ کچن سے جانے کے لئے پلٹیں۔

''اور ہاں اریج!'' ماما کو پھر کوئی بات یاد آ گئی۔ ''بیٹا! کوئی اچھا سا سوٹ پہننا۔ مہمانوں سے تمہیں بھی ملنا ہے۔ بہت خاص مہمان ہیں یہ۔'' آصفہ بیگم نے مسکرا کے کہا تو اریج کو حیرانی ہوئی۔

''لیکن کون ہیں؟ کیا میں جانتی ہوں؟''

''یہ تفصیل تو تم سلمان سے پوچھ لو۔ رہی بات جاننے کی تو جلدی جان جاؤ گی۔'' آصفہ بیگم یہ گول مول سی بات کہہ کے کچن سے باہر چلی گئیں لیکن اریج کو سوچ میں ڈال گئیں۔ لیکن اریج نے اس بات کو نارمل ہی لیا اور بڑا بنانے اور شاشلک کو چکن کے لئے میرینیٹ کرنے میں مشغول رہی۔

کوکنگ سے فارغ ہوئی تو شام ہو چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آئی اور ماما کے کہنے کے مطابق کوئی اچھا سا سوٹ سلیکٹ کرنے لگی۔ اُسے سفید جارجٹ کا سوٹ مناسب لگا۔ وہ نکال کے اُس پر استری پھیری اور کچھ دیر کے بعد بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

تھکاوٹ کے سبب اُس پر گہری نیند چھا چکی تھی۔ اُسے احساس ہی نہ ہوا کہ کب شام کے سات بجے اور مہمان آ گئے۔ وہ اُٹھی، دروازے کی اوٹ سے جھانکا تو ایک باوقار شخصیت کی مالک خاتون اور اچھی قد و قامت والے مرد کو دیکھا۔ ساتھ میں سلمان اُن کا تعارف کمال عثمانی سے کروا رہا تھا۔ وہ ابھی سوٹ اُٹھا کے جلدی جلدی باتھ رُوم میں جانے ہی لگی تھی کہ سلمان آ گیا۔

''یہ کیا، تم ابھی تک تیار نہیں ہوئی ہو؟''

''بس، ابھی ہونے ہی لگی تھی۔'' وہ کچھ کچھ شرمندہ بھی ہوئی اتنی دیر تک سوئے پڑے رہنے کی وجہ سے۔

''اور یہ کیا، یہ سوٹ کس لئے نکالا ہے؟ کسی میلاد میں جا رہی ہو کیا؟'' سلمان نے اُس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سوٹ دیکھا تو اُسے ٹوک دیا۔ اُس کی الماری تک آیا، ڈھیر سارے سوٹ نکال کے دیکھنے لگا، پھر ایک رائل بلیو کلر کا سوٹ نکالا اور اُس کی طرف بڑھایا۔ ''یہ لو...... یہ پہن لو۔''

''لیکن سلمان! یہ تو اتنا ہیوی کام والا ہے۔ ماما نے پچھلی عید پر بنوا کے دیا تھا۔'' اریج نے پریشانی سے کہا۔

''تو کیا ہوا۔ یہ بہت ہی خاص مہمان ہیں اریج! چلو، یہ پہن آؤ۔'' سلمان نے سختی سے کہا تو اُسے مجبوراً وہ سوٹ لینا پڑا۔

سوٹ چینج کر کے وہ باتھ روم سے نکلی تو سلمان کو ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھے جیولری سلیکٹ کرتے پایا۔ وہ سفید پرل والا سیٹ تھامے اُس کی جانب متوجہ ہوا۔

''سنو اریج! تم اپنے بال کھول کے اوپر سے پن لگا دو۔ اور یہ پرل کا سیٹ بھی پہن لو۔ کسی اچھے سے لپ کلر والی لپ اسٹک لگانا۔'' سلمان نے تحکمانہ انداز میں کہا تو وہ جھلا اُٹھی۔

''تم مجھے کسی کی شادی پر لے جا رہے ہو یا میری اپنی شادی کرا رہے ہو؟ تمہیں پتہ ہے سلمان! کہ مجھے یہ سب پسند نہیں۔''

''تم چاہتی ہو کہ تمہاری ماما اور بابا تم سے ناراض ہو جائیں؟'' سلمان کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور وہ بے دلی سے ہی لیکن تمام کام کرتی رہی۔ تیار کر کے اُسے فائنل کے طور پر پرفیوم لگایا اور باہر لے آیا۔

''سنو! بہت اچھی لگ رہی ہو۔ بس ذرا چہرے پر مسکراہٹ کی کمی ہے۔'' سلمان کے

کہنے پر اریج مسکرا دی۔ وہ دونوں ساتھ ہی ڈرائنگ روم کی طرف آئے، جہاں پہ دونوں فیملیز بات چیت میں مصروف تھیں۔

''یہ ہیں ہماری بیٹی اریج۔ اسی سال ایم بی اے کیا ہے۔'' کمال عثمانی نے اریج کا تعارف کروایا۔ اریج نے دونوں کو سلام کیا۔

''اریج! یہ ہیں مسٹر اینڈ مسز شبیر۔ انکل کے فرینڈ۔'' سلمان نے اریج سے اُن کا تعارف کرایا۔ مسز شبیر، اریج کو بہت غور سے پیار بھری آنکھوں سے دیکھے جا رہی تھیں اور اریج بھی مسکرا کے بھرپور خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

چند ایک باتیں کرنے کے بعد اریج وہاں سے چلی آئی جب کہ باقی لوگ ڈنر کرنے لگے۔ ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دیر بیٹھ کر وہ لوگ چلے گئے اور سلمان، اریج کے کمرے میں آ گیا۔

''اریج! چلو ہم آئس کریم کھا کے آتے ہیں۔'' سلمان کی پیشکش کو اُس نے بنا کسی سوال جواب کے قبول کر لیا اور دونوں چہل قدمی کرتے ہوئے گھر کے قریبی آئس کریم پارلر پر آ گئے۔

''میں اندر نہیں بیٹھوں گی سلمان! مجھے آئس کریم یہیں لا دو۔'' وہ پارلر کے باہر بنی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ سلمان بھی بنا کسی تردّد کے گیا اور اندر سے دو آئس کریم کپ لے آیا۔

''یہ لو، تمہاری ٹوٹی فروٹی۔'' سلمان نے اُس کا کپ آگے بڑھایا۔

''تمہیں کیسے پتہ، میرا ٹوٹی فروٹی کھانے کا دل چاہ رہا ہے؟'' اریج حیرانی سے مسکرا دی۔

''بچپن سے ہم اکٹھے ہی آئس کریم کھاتے آئے ہیں۔ مجھے پتہ ہے تم اُداسی میں ونیلا اور نارمل موڈ میں ٹوٹی فروٹی کھاتی ہو۔'' سلمان نے یہ کہا تو اریج زور سے مسکرا دی۔

''اور مجھے بھی یہ پتہ ہے کہ تم چاہے اُداس ہو یا خوش، تم پستہ فلیور ہی کھاتے ہو۔'' اریج کی مسکراہٹ اب قہقہے میں بدل گئی اور سلمان دیر تک اُسے اسی طرح دیکھتا رہا۔

''اریج! بہت عرصے بعد مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں پرانی والی اریج کمال کے ساتھ ہوں۔ لڑتی جھگڑتی، ہنستی کھلکھلاتی۔ میں تو سمجھا تھا کہ وصی احمد نے مجھ سے میری گڑیا سی دوست چھین لی ہے۔''

سلمان کی اس بات پر اریج کا قہقہہ اور مسکراہٹ دونوں غائب ہو گئے۔ شاید وصی احمد کا ذکر اب صرف اُداس آنکھوں اور اشکوں کا ترجمان بن چکا تھا۔

شاید وصی احمد کی یاد کانٹوں سی چبھن لئے آتی تھی۔

شاید وصی احمد اُس کی مسکراہٹوں پہ حاوی ہو گیا تھا۔

''میں تمہیں بہت ضروری بات کرنے کے لئے یہاں لایا ہوں۔ ایک ایسی بات، جو تمہیں بتانے کے لئے انکل، آنٹی نے مجھ پر بھروسہ کیا۔'' سلمان آئس کریم کھاتے کھاتے بولا۔ اریج خاموشی سے اُس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''اریج! تم انکل، آنٹی سے کتنا پیار کرتی ہو؟'' سلمان نے سوال کیا۔

''ہر کسی سے زیادہ۔ وہ میرے والدین ہیں۔ اُن کے علاوہ میرا اور میرے علاوہ اُن کا دنیا میں کوئی نہیں۔ لیکن تم ایسا کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اریج کو اس بات پر حیرانی ہوئی۔

''کیونکہ اُن دونوں نے مل کر تمہارے لئے ایک فیصلہ کیا ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ تم اُن کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ گی۔ اُنہوں نے اپنی اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے تم پر اعتماد کیا ہے۔'' سلمان نے نہایت صفائی سے بات شروع کی۔

''کیسا فیصلہ؟......کیسا اعتماد؟'' اریج کو پریشانی ہوئی۔

''اریج! انکل اور آنٹی نے مل کر تمہاری شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور آج تم جن مہمانوں سے ملیں، وہ تمہارے سسرالی عزیز تھے۔ لڑکے کا نام احمد ہے۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ اور انکل آنٹی دونوں راضی ہیں۔'' سلمان کے اس انکشاف پر اریج کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیرت کی انتہا تھی ان آنکھوں میں۔ خوابوں کی بکھری کرچیاں تھیں ان نظروں میں۔

''سلمان! تم نے......تم نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہر بات مجھ سے چھپائی۔ تم نہیں جانتے کہ میں وصی احمد سے......نہیں سلمان!...... میں کس طرح سے شادی کروں گی؟ تم......تم منع کیوں نہیں کرتے ہو بابا جان اور ماما کو؟......تم اُنہیں بتا کیوں نہیں دیتے ہو؟'' اریج متوحش نظروں سے، منتشر الفاظ سے سلمان سے مخاطب ہوئی۔

''کیا بتاؤں اُنہیں کہ تم نے وصی احمد نام کے شخص سے محبت کی تھی اور وہ محبت تمہیں اُس شخص کے مرنے کے بعد محسوس ہوئی؟ اُس کی موت کی ذمے دار بھی تم ہو اور اس کے بعد تم نے عمر بھر خود کو تنہا اذیتوں کے صحرا میں جھلسنے کی سزا دی ہے۔ جو کہ پچھلے سات ماہ سے تم بھگت بھی رہی ہو۔'' سلمان کی آواز اونچی ہو گئی۔ ''کیا وہ ماں باپ برداشت کر پائیں گے اپنی اکلوتی بچی کا صدمہ؟ وہ ماں کہ جس نے اُنیس سال اپنے خاوند سے دُور گزارے، صرف اپنی بچی کی وجہ سے۔ وہ باپ کہ جو اتنے سال ترستا رہا بیٹی کے چہرے کو دیکھنے کے

لئے؟ اُن دونوں کو میں یہ بتا دوں کہ تم نے کیا، کیا ہے؟ اریج! وہ دونوں بکھر جائیں گے۔'' سلمان کا لہجہ قدرے مدھم ہو گیا تھا۔

''لیکن سلمان! یہ بے وفائی ہو گی وصی احمد کے ساتھ۔'' اُس کی آنکھوں میں اشک تھے، وفا کی داستاں دہراتے ہوئے، صداقت کے لئے سائے دکھاتے ہوئے۔

''اریج! وصی احمد تمہارا گزرا ہوا کل ہے اور ماضی کے پیچھے اپنا حال اور مستقبل تیاگ کے بھاگا نہیں جاتا۔'' سلمان اُسے سمجھانے لگا۔

''لیکن سلمان! ایسے مستقبل کا کیا کروں، جس کی جڑیں ماضی نے چھین لی ہوں۔ میں نہیں کر پاؤں گی یہ سب۔ یہ بہت مشکل ہو گا میرے لئے۔'' نرم سے آنسو گال پہ آ کے ٹھہر جاتے تھے۔

''ٹھیک ہے اریج! میں کہہ دیتا ہوں انکل آنٹی کو کہ آپ کی بیٹی کو آپ کی نہیں، ایک سائے کی خوشی عزیز ہے۔ وہ سایہ جو وصی احمد کا ہے۔ آپ کی بیٹی کو آپ کے خوابوں کی کوئی پروا نہیں۔'' سلمان نے آئس کریم کا کپ رکھا اور جانے کے لئے اُٹھا۔ ابھی دو قدم ہی چلا تھا کہ اریج نے اُسے پکارا۔

''ٹھہرو سلمان! اگر بات میرے بابا اور ماما کی خوشی کی ہے تو میں راضی ہوں، اُن کی ہر بات ماننے کے لئے۔ وصی احمد کو تو میں زندگی میں کوئی خوشی نہ دے پائی، کم از کم اپنے والدین کو تو تکلیف نہ دوں۔ اور ویسے بھی میرے خواب تو تاعمر بھٹکتے ہی رہیں گے، چاہے میری شادی ہو یا نہ ہو۔ تم ماما بابا کو کہہ دینا کہ میں شادی کے لئے تیار ہوں۔'' اریج نے رضامندی ظاہر کی اپنے والدین کے فیصلے کو مانتے ہوئے اور سلمان نے مسکرا کے اُس کا ہاتھ تھاما اور دونوں ساتھ ساتھ گھر آنے لگے۔



وہ آنکھیں موندے بیٹھی ایک اُداس سی غزل سن رہی تھی کہ ماما نے آ کر ٹیپ آف کر دیا۔

''یہ کیا، تم آج کے دن غزل سن رہی ہو اتنی اُداس بیٹھی؟ آج تمہیں ہم مایوں بٹھائیں گے۔ آج تو خوشی کے گانے گاؤ۔'' ماما کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ اُنہوں نے غزلوں کی کیسٹ نکالی اور دوسری ڈال دی۔ پورے ماحول پر تیز موسیقی چھا گئی۔

گوری کرت سنگھار، گوری کرت سنگھار

بال بال موتی چمکائے، روم روم مہکار

مانگ سنگھار کی سندرتا سے چمکے چندن وار

"ماما........" اُس نے شکایت آمیز آنکھوں سے والدہ کو دیکھا، جو کہ خوشی سے جھومے جارہی تھیں۔ اس طرح کے سائے والدہ کے چہرے پر دیکھ کے اُسے اپنے فیصلے پر ناز ہو اُٹھا۔

"کیوں بھئی! ایسے کیا گھور کے دیکھ رہی ہو؟ ہماری اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کی شادی ہے، جسے ہم نے بیٹوں کی طرح پالا ہے۔ اس دن کی تیاری تو بیٹیوں کے پیدا ہوتے ہی ماں باپ شروع کر دیتے ہیں۔ میں تو دل کھول کے خوشی مناؤں گی۔ جھوموں گی، ناچوں گی، کھلکھلاؤں گی۔" آصفہ بیگم نے خوشی سے کہا۔

"لیکن ماما! میں آپ سے دُور بھی تو چلی جاؤں گی ناں۔ ایک انجان دنیا میں، انجان لوگوں کے بیچ........ میں اکیلی کس طرح رہ پاؤں گی آپ کے بغیر ماما؟" اریج نے نم آنکھوں سے ماں کی گردن میں بازو ڈال دیئے۔

"یہ تو ہمارا رواج ہے میری بچی! میں بھی کہیں سے آئی تھی تیرے بابا کے گھر اور اُنہیں اپنا بنالیا۔ میری ماں بھی کہیں سے آئی تھی اور اُس کی ماں بھی۔ ہر عورت کی ماں نے یہ سفر طے کیا ہے اور نجانے کب تک کرنا ہے۔" آصفہ بیگم اُس کی بکھری لٹوں کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولیں۔

"کیا یہ نسل در نسل چلنے والی سزا، یہ کٹھن مرحلہ ختم نہیں ہوسکتا؟ کیا بیٹی تا قیامت اپنے والدین کے گھر نہیں رہ سکتی؟ کیا ہمیشہ تک وہ گڑیاؤں سے نہیں کھیل سکتی؟" اریج کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ والدہ کو اُس کی معصوم فرمائش پہ پیار آگیا اور اُس کے دُبلے سے وجود کو گلے سے لگالیا۔



پیلے رنگ کی سادہ ساڑھی کے اوپر پیلا کرن والا دوپٹہ اوڑھے، گلے، کان اور بازوؤں میں سفید موتیے کی خوشبو دار کلیاں پہنے، معصوم سادہ سے رُوپ کی بجلی گرائے وہ لان میں سکھیوں کے ساتھ مایوں کی رسم کے لئے آچکی تھی۔ ماما نے اپنے اچھے ذوق اور ٹیسٹ کا ثبوت دیتے ہوئے پورے لان کو فریش فلاورز سے سجایا تھا۔ زمین پر پیلے رنگ کی چاندنی اور سبز رنگ کے گاؤ تکیے رکھے گئے تھے۔ دُولہے والوں کے لئے کھانے کا الگ ارینجمنٹ تھا۔ دُلہن والوں کی طرف سے گنتی کے چند لوگ تھے۔ سلمان کی فیملی اور شازمہ، کرن اور چند ایک اور سہیلیاں۔ پاپا یا ماما کی طرف سے اور تو کوئی رشتہ دار نہ تھا۔

دُولہے والے باری باری رسمِ مایوں کے لئے آرہے تھے۔ اُس کی شفاف پیشانی پر سات سہاگنیں صندل کی تحریر لکھنے آئیں۔ اُس کی لمبی، سیاہ چوٹی کو تیل لگایا تھا، ہتھیلی پہ مہندی باری باری رکھی گئی۔ کتنی خوب صورت رسمیں تھیں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں، دل پہ اُداسی کے ڈیرے تھے۔ ایک تو ماما، پاپا سے بچھڑنے کا غم، اُوپر سے وصی احمد کا وجود، جو اُس کے دل کے اندر ہی اندر اپنی محبت کی شمعیں جلائے جارہا تھا۔ اور گزرتے وقت کے ساتھ ان شمعوں کی روشنی مزید روشن ہو رہی تھی۔

رسموں کے بعد شازمہ، کرن اور دوسری لڑکیاں ڈھولکی کی تھاپ پر سہرے گانے لگیں۔ تبھی اچانک ڈھیر سارے لڑکوں کے گروپوں میں سے سلمان کے ساتھ صائم، کامران، شہروز اور ناصر پیلے رنگ کی چنریاں پہنے نکلے۔ پہلے وہ اریج کے پاس آئے۔

"تم کہتی تھی ناں اریج! تمہارا کوئی بھائی نہیں۔ دیکھو، آج ہم پانچ بھائی ہیں تمہارے۔" سلمان نے کہا تو اریج کا دل اندر تک سرشار ہوگیا۔

پھر اُن سب نے مل کر گروپ ڈانس کا وہ مظاہرہ کیا کہ سب حیران رہ گئے۔ رات دیر تک اُن کا فنکشن جاری رہا۔ فنکشن ختم ہونے کے بعد سلمان اوپر اُس کے کمرے میں آیا اور اُسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اریج! تمہارے دُولہے نے مجھے کہا ہے کہ میں تمہیں اُس کی تصویر دکھاؤں۔ ورنہ کل اچانک پہلی بار اُسے دیکھ کر تم بے ہوش نہ ہو جاؤ۔ یہ دیکھو، یہ ہیں تمہارے مجازی خدا۔" سلمان نے ایک فوٹو گراف اُس کی طرف بڑھائی۔ لیکن اُس نے منہ پھیرلیا۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں یہ دیکھنے کی۔ جب وصی احمد نہیں تو پھر چاہے کوئی بھی ہو۔ میں نے کبھی آئیڈیل بنایا ہی نہیں۔ اس لئے میں اس میں کسی کو نہیں ڈھونڈوں گی۔"

"وصی احمد کو بھی نہیں؟" سلمان نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"دیکھ لو........ ہوسکتا ہے، بے چارہ تمہیں پسند آجائے۔" سلمان نے مزید اصرار کیا۔

"میں نے کہا ناں، نہیں۔ تم کیوں خوامخواہ وقت ضائع کر رہے ہو؟" وہ جھلا اُٹھی۔

"اچھا ٹھیک ہے........ اس کے خدوخال بتا دیتا ہوں۔ باقی سب ٹھیک ہے۔ صرف ایک آنکھ کانی ہے، دانت کچھ بچپن میں ٹوٹے تھے کچھ جوانی میں، سر کے بال اُڑے ہوئے ہیں، ناک بس سونگھنے کے لئے کافی ہے، دیکھنے میں نہیں آتی اور........" سلمان تصویر کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"سلمان!" وہ غصے میں چیخی تھی۔ کشن اُٹھایا اور اُسے دے مارا۔ وہ جانے کے لئے

دوڑا اور مُڑ کے بولا۔

"ہاں.......لیکن تم سے اچھا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے دروازہ بند کیا اور کشن دروازے کو جا کے لگا۔



آخر وہ دن آ گیا تھا کہ جب اُس کا ناتا کسی انجان بندے سے جڑنے والا تھا اور وصی احمد کی یادوں اور خوابوں سے ہمیشہ کے لئے ٹوٹنے والا تھا۔ یہ دن ہر لڑکی کے لئے کتنا قیمتی ہوتا ہے کہ جب وہ ماں باپ کی دہلیز پھلانگ کر اپنے نئے ساتھی کے دروازے تک آتی ہے، مٹھی میں ہزاروں خوابوں کی ڈور تھامے، آنکھوں میں نئی حسرتیں جگمگائے۔ لیکن آج تو اریج کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ آنسو تھے کہ تھم نہ رہے تھے۔ غم رُکے نہ رُک رہا تھا۔

اُس کے ہاتھوں کی مہندی کیا خوب کھلی تھی۔ خوب صورت سے، سرخ پھول ہاتھوں پر جھلملا رہے تھے۔ جب بیوٹیشن نے اپنی مہارت اُس کے نازک سے رُوپ پر دکھائی تو وہ اپسراؤں کی شہزادی لگ رہی تھی۔ چاند نگر سے اُتری ہوئی چاندنی کا پرتو محسوس ہو رہی تھی۔ سرخ، زرتار لہنگے کے اُوپر راجستھانی چولی، دھانی سا آنچل، مہندی اور تازہ پھولوں کی مہک نے اُس کا انگ انگ معطر کر دیا تھا۔ چہرے کی اُداسی معصوم حُسن پہ اور بھی بھلی بھلی لگ رہی تھی۔ ٹیکے اور جھومر نے پیشانی پہ پھول لگا دیئے تھے۔ ماما اُسے ایک نظر دیکھ کے پھر دیکھنے کی ہمت ہی نہ کر پائیں کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ آنکھوں میں موتی ٹھہر گئے تھے۔ آصفہ بیگم نے بیٹی کا ماتھا چوما اور پیار سے گویا ہوئیں۔

"ایک وہ دن تھا کہ جب میری آنکھوں نے تجھے پہلی بار دیکھا تھا۔ تیرا ننھا سا وجود اپنی بانہوں میں پہلی بار تھاما تھا۔ اور ایک آج کا دن ہے کہ جب میں تمہیں دُلہن بنے دیکھ رہی ہوں۔ یقین کرو اریج! آج بھی تم مجھے اتنی ہی پیاری لگ رہی ہو، جتنی پہلے دن لگی تھیں۔" ماں اور بیٹی دونوں گلے لگ گئیں۔ چپ چاپ اپنے درد کو چھپائے بیٹھی ممتا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"اے لڑکی! رونا نہیں۔ ابھی ہمیں سیدھا میرج ہال جانا ہے۔" ماما نے پیار سے کہا تو وہ چپ ہو گئی۔

ماما اُسے ساتھ لئے، اُس کے عروسی لہنگے کو پکڑے، اُسے اُلجھنے سے بچاتی ہوئی میرج ہال میں لا رہی تھیں۔ اب ہال میں بیٹھے تمام کے تمام لوگ اپنے کام چھوڑ کر اُس شام کی سب سے ضروری ہستی یعنی دُلہن کو دیکھنے لگے تھے۔ دُولہا کو پہلے ہی اسٹیج پر بٹھایا جا چکا

تھا۔ سفید شیروانی سوٹ اور سرخ پٹکا باندھے وہ بھی وجاہت و خوب صورتی میں کمال لگ رہا تھا۔

اریج کو اُس انجان بندے کے پہلو میں بٹھا دیا گیا۔ بیٹھتے ہی ایک خوشگوار، مانوس سی مہک نے اریج کے حواس گم کر دیئے۔

'یہ خوشبو تو وصی احمد کے ملبوس سے پھوٹتی تھی۔' پہلے قدم پر ہی وصی احمد کی یاد اُس کے دماغ پر چھا گئی۔ اُف وصی! تم نے کس طرح اس کے وجود کو اس سے چھینا تھا.......اُس نے بمشکل خود پر قابو رکھا اور دُولہے کی طرف نظر نہیں اُٹھائی۔ فوٹو سیشن اور مووی اپنے عروج پر تھی۔ کیمرہ، فلیش اور مووی کی روشنیاں آج کے شہزادہ شہزادی کو گھیرے ہوئے تھے۔ نکاح سے قبل آئینہ دکھانے کی رسم ہوئی تھی۔

خوب صورت، مغلئی فریم سے آراستہ آئینہ، شازمہ اور کرن اُن دونوں کے سامنے لے آئیں۔ سلمان، اریج کے سائیڈ پر رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔ دُولہے نے اپنی عروسہ کی شبیہہ شیشے میں دیکھی تو حُسن و معصومیت کا امتزاج دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

"نہیں بھئی! یہ تو سراسر چیٹنگ ہوئی۔ ہم نے تو اپنی دُلہن دیکھ لی۔ ہماری دُلہن نے تو ایک آنکھ اُٹھا کر بھی ہمیں نہیں دیکھا۔ کیا ہم اتنے برے ہیں؟" اِک مانوس سی آواز پر اریج نے بے اختیار شیشے پر نظر ڈالی اور جیسے آنکھ وہیں پر ٹھہر گئی۔

یہ تو وصی احمد تھا۔ وصی احمد مرزا۔ اریج کا وصی۔ وہی تو چہرہ تھا۔ وہی تو مسکراہٹ تھی۔ وہی تو سراپا تھا۔ اُس نے آئینے پر بھی یقین نہ کیا، ساتھ بیٹھے شخص کے چہرے کو نزدیک سے دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگی، کہیں اُسے پہلے کی طرح دھوکا تو نہ ہوا تھا۔ کہیں پھر تخیل تو وصی کا چہرہ نہ دکھا رہا تھا؟ لیکن یہ تخیل نہ تھا، یہ تو اُس کی محبت کی تکمیل تھی، وفاؤں کی معراج تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کے چہرے کی سمت دیکھے جا رہی تھی۔ کچھ یقین کرنے کی تگ و دو میں تھی۔ کسی ثبوت کی تلاش میں تھی اور وصی احمد اُس کے ان تاثرات سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"اریج! کہیں یہ بھی تمہیں وصی احمد جیسا تو نہیں لگ رہا؟.......اگر لگ رہا ہے تو پریشان مت ہو۔ یہ....... یہ وصی احمد ہی ہے۔ تمہارا جیون ساتھی۔ تمہارا مجازی خدا۔ کل اگر تصویر دیکھ لیتیں تو اتنی حیرانی نہ ہوتی۔" سلمان نے سرگوشی میں کہا۔ اریج نے کچھ کہنا چاہا لیکن لب پہ بار بار آ کے فقرہ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ کچھ کہہ نہ پا رہی تھی۔

"مجھے مرزا وصی احمد کہتے ہیں....... کیا ہم پہلے بھی کہیں ملے ہیں؟" وصی احمد نے

قدرے قریب ہو کر اُس سے کہا۔ دو الہڑ اشک اُس کی شربتی آنکھوں سے ٹوٹے اور نتھ کے تارے کے ساتھ اٹک گئے۔ کیا وہ عالمِ خواب میں تھی یا خوابوں نے حقیقتوں کا ہاتھ تھام لیا تھا؟ کیا زندگی خوب صورت ہوگئی تھی یا وہ پھر سراب میں بھٹک رہی تھی؟........ یہ کیا تھا، جو اُس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں؟

کچھ ہی دیر بعد نکاح کے لئے قاضی اسٹیج تک آیا۔

''اریج کمال بنت کمال عثمانی! کیا آپ نے وصی احمد مرزا ولد شبیر احمد مرزا کو شوہر کی حیثیت سے قبول کیا؟........ کیا آپ نے وصی احمد مرزا کو بحیثیت شریکِ حیات منظور کیا؟''

قاضی کا یہ فقرہ اُسے عالمِ حقیقت میں ہونے کا یقین دلا گیا اور صرف ایک ہاں کے بعد وہ وصی احمد کی ہوگئی۔ اس طرح اچانک، اس طرح بے خبری میں، کس طرح، کیسے؟

ہزاروں سوال اُس کے دل میں اُمڈنے لگے اور جواب پانا ممکن نہ تھا۔ شازمہ، کرن، صائم، کامران، شہروز، ناصر اور سلمان گیتوں اور خوشیوں میں مصروف تھے۔ رسمیں ہوئیں، رخصتی ہوگئی۔ اُسے وصی احمد مرزا کے گھر لایا گیا۔ حجلہ عروسی میں بٹھایا گیا لیکن وہ حیرت کی بھول بھلیوں میں کھوئی تھی۔

حجلہ عروسی کی مہکتی سیج پر وہ بستر کے عین درمیان بٹھائی گئی تھی۔ ہر طرف تازہ پھولوں کی خوشبو پھیلی تھی۔ خوب صورت، مدھم روشنی نے پورے ماحول پر ڈیرہ جما رکھا تھا۔ تبھی وصی احمد مرزا کمرے کا دروازہ پار کرتا، ہولے ہولے قدم بڑھاتا اُس تک آیا۔

''ہم نے تو سوچا تھا کہ ہماری دُلہن ہمیں مسکراتی ملے گی۔ لیکن آپ تو اتنی حیرت سے دیکھ رہی ہیں، جیسے ہم مریخ سے آئے ہوں۔'' وصی احمد نے نہایت پیار سے کہا۔

''یہ سب کیا ہے؟........ وہ کیا تھا جو پہلے ہوا؟ اور یہ کیا ہے جو اب ہو رہا ہے؟ پلیز! بتائیں مجھے۔'' اتنی دیر سے سوچوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے والی آنکھیں اب چھلک پڑی تھیں۔ اُس کے پھول سے رخسار شفاف بوندوں سے سج گئے تھے۔

''اریج! روؤ نہیں........ میں سب بتاتا ہوں۔ یہ لو! پانی پی لو۔'' وصی احمد نے پانی کا گلاس اُسے دیا اور اُس نے بنا سوچے لے لیا۔

''اب اطمینان سے میری بات سنو۔ میں کوئی وصی احمد کی رُوح، آسیب وغیرہ نہیں ہوں۔ زندہ وسالم وصی احمد مرزا ہوں۔ بات شروع ہوتی ہے اُس دن سمندر کے کنارے سے جب میں تمہیں یہ انگوٹھی پہنانے لایا تھا۔'' وصی احمد نے اُس کا مخروطی ہاتھ تھاما اور تیسری اُنگلی میں روزِ اوّل کی طرح جگمگاتی انگوٹھی کی جانب اشارہ کیا۔

''تم نے سچائی بتائی تو اُسی دن تمہیں پانے کی چاہ دل میں جاگی اور اُسی دن میں نے یہ پلاننگ کی اور اس پلاننگ میں سب سے پہلے شامل کیا اپنے گروپ کو۔ صائم، شہروز، کامران اور ناصر کو۔ اُن کی مدد سے میں پہنچا تمہاری سہیلیوں کرن اور شازمہ تک۔ تمہیں یاد ہوگا، شازمہ نے ہی تمہیں میری موت کی خبر سنائی تھی۔'' وصی احمد کی اس بات پر اریج کو شازمہ کی وہ فون کال یاد آ گئی۔

''اور پھر اس کے بعد میں نے تمہارے کزن سلمان کو اپنے اعتماد میں لیا اور وہ بے چارہ میری سچی محبت کا پہلے سے ہی قائل ہو چکا تھا۔ اُس نے ہر طرح سے میری مدد کی۔ اُس دن جب میرے گروپ کے دوستوں نے میرے نام کی شام منائی تو اسٹیج پر لگی اپنی ہی قد آدم تصویر کے پیچھے میں ہی کھڑا تھا اور تمہاری محبت جو کہ میرے دل میں تھی، کو تمہاری آنکھوں سے چھلکتا بہتا دیکھ رہا تھا۔ اور کلاس رُوم میں چیخ چیخ کر آئی لو یُو وصی احمد! کہنا میں نے کلاس کے دروازے کے باہر سے سن لیا تھا۔ اپنے دوستوں کے ذریعے میں نے وہ انگوٹھی بھی تمہاری اُنگلیوں تک پہنچا دی۔ اُس دن جب تم سلمان کے گھر آئیں چہل قدمی کرتے ہوئے تو اس کے ساتھ میں ہی باتوں میں مصروف تھا۔ ہم اپنے اگلے اسٹیپ کی پلاننگ کر رہے تھے۔ تم نے مجھے دیکھا لیکن سلمان نے مجھے عاصم بنا کے تمہارا مذاق اُڑایا۔ کالج کے تمام پیپرز میں نے تم سے چھپ کر دیئے۔ لیکن تمہارے ساتھ ہی دیئے اور کلیئر کئے۔ اور جب تم بیمار پڑیں تو تمہاری محبت نے دل میں بہت شور وغل مچایا تو میں ڈاکٹر ریز بن کر داڑھی مونچھ لگا کے تمہیں دیکھنے آیا۔ یاد ہے، کس طرح غصہ ہوئی تھیں مجھ پر؟'' وصی احمد کی اس بات پر اریج حیرانی سے ہی لیکن مسکرا دی۔

''اس دوران سلمان نے میرے رشتے کی بات آنٹی کے دل میں ڈال دی اور تمہارا حال دکھا کر اُنہیں قائل بھی کر دیا۔ چوری سے اُنہیں ہمارے گھر لے آیا۔ ماما، پاپا سے ملاقات کروائی، مجھے ملوایا۔ آنٹی نے گرین جھنڈا دکھایا تو پھر تمہارے بابا کو بلایا گیا۔ سلمان نے مجھے اپنا دوست ظاہر کیا تھا۔ انکل مجھ سے اور ڈیڈ سے ملے تو اُنہیں بھی ہم پسند آ گئے اور پھر اُس دن ماما نے تمہیں دیکھا تو جلدی سے تمہیں اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کیا۔ تم اُنہیں اتنی پسند آئیں کہ ایک ہی ماہ کے اندر اندر وہ تمہیں اپنی بہو بنا کے لے آئیں۔''

یہ سارے انکشافات اریج کے لئے عجیب تھے کہ پچھلے سات ماہ سے اُسے اس طرح سب نے دھوکے میں رکھا۔ اُس کے ساتھ یہ سب ہوتا رہا لیکن وہ جان ہی نہ پائی۔

''میں نے کل اپنی تصویر بھیجی تھی سلمان کے ہاتھ۔ لیکن تمہیں شوق ہی نہ تھا دیکھنے کا۔''

وصی احمد نے اُسے چھیڑا تو اُس نے ایک مُکا اُس کی چھاتی پر لگایا۔

''آپ نے بہت تنگ کیا مجھے وصی! بہت تڑپایا مجھے۔ جانتے ہیں کتنا منتشر ہوئی آپ کی ارتیج ان سات ماہ میں۔ پچھتاوے کے کتنے اژدھے مجھے ڈستے رہے؟'' وہ بغور اُس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ آنسوؤں کی لڑیاں رواں ہو چکی تھیں۔

''اب لگ گیا پتہ کہ اداکاری کرنا صرف تمہیں ہی نہیں آتی، تم سے جیتنے والے بھی ہیں کوئی۔'' وہ کالر جھاڑنے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔

''ہاں وصی! میں ہار گئی اور آپ جیت گئے۔'' اُس نے اقرارِ شکست کر لیا، اُس کی چوڑی چھاتی میں خود کو سمو کے۔

''نہیں۔ محبت جیت گئی۔ وفائیں منزل پا گئیں۔ تمہیں میں اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں لے آیا۔

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں سمانے والے
کیسے چھینیں گے تجھے مجھ سے زمانے والے

''پھر چھین پائے زمانے والے؟'' وصی نے والہانہ آنکھوں سے اُسے دیکھا اور اُس نے نفی میں گردن ہلائی۔

ابھی تو کتنی باتیں کرنی تھیں۔ وفا کے کتنے اقرار کرنے تھے۔ ہجر رُت کے کتنے قصے سنانے تھے۔ اسی پیار بھرے موسم کا پورا چاند چڑھا اور رات کی شمع قطرہ قطرہ پگھلنے لگی۔

(تمت بالخیر)